فروغِ مرثیہ

سہ ماہی

کینیڈا

میر انیس نمبر

(اٹھارہواں شمارہ)

پانچواں سال

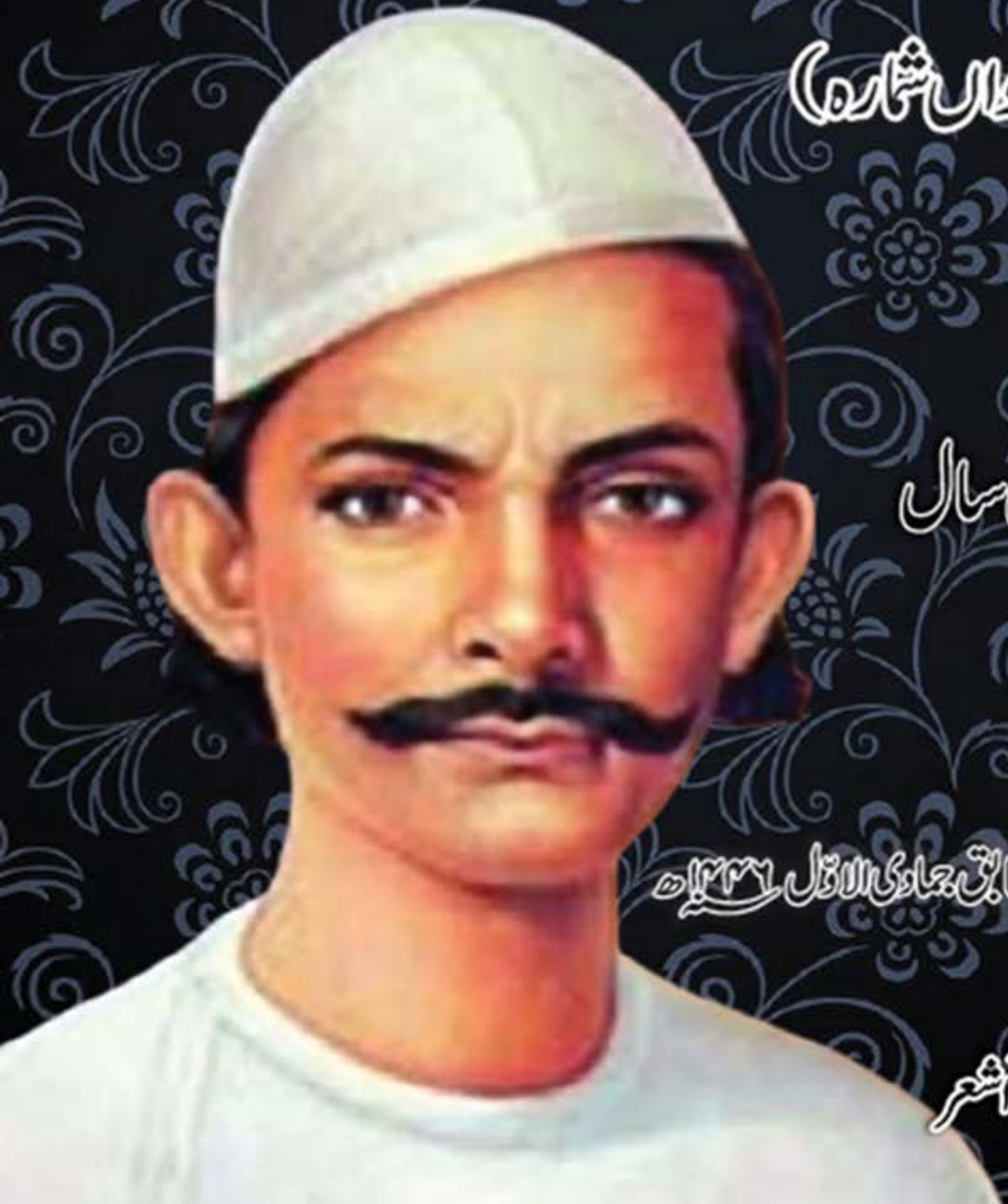

نومبر ۲۰۲۴ء بمطابق جمادی الاوّل ۱۴۴۶ھ

ایڈیٹر

اصغر مہدی اشعر

فروغِ مرثیہ (سہ ماہی کینیڈا)

میر انیس نمبر

(اٹھارہواں شمارہ)

اِس شمارے میں شامل مضامین، تنقیدی رائے یا شعری وفکری خیال سے اِدارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

ادارے کی چھتیسویں پیش کش

انیسؔ نمبر

سہ ماہی

کینیڈا

فروغِ مرثیہ

نومبر ۲۰۲۴ء بمطابق جمادی الاوّل ۱۴۴۶ھ

ایڈیٹر

اصغر مہدی اشعر

جملہ حقوق بحقِ فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل محفوظ ہیں

عنوان	:	فروغِ مرثیہ (اٹھارہواں شمارہ)، انیسؔ نمبر
اشاعت	:	نومبر ۲۰۲۴ء
تعدادِ اشاعت	:	۵۰۰
ایڈیٹر	:	اصغر مہدی اشعر
ناشر	:	فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل، کینیڈا
طابع	:	RB پرنٹرز اینڈ پبلشرز، کراچی
قیمت فی شمارہ	:	۲۵/ڈالر، ۱۵/پونڈ (علاوہ ڈاک خرچ)
ای میل	:	faroghemarsiya@gmail.com
فون	:	+1-905-462-9211
پتہ	:	441 JELINIK TERRACE, MILTON ONTARIO, CANADA L9T7N2

ملنے کا پتہ

محفوظ بک ایجنسی، مارٹن روڈ، کراچی
علمدار بک ڈپو، انچولی، کراچی
مذہبی دنیا-الہ آباد، انڈیا

احمد بک ڈپو، انچولی، کراچی
افتخار بک ڈپو، لاہور

باب الحوائج بک ڈپو، جعفر طیار، کراچی
RB پبلشرز، ابوالحسن اصفہانی روڈ، کراچی

فروغِ مرثیہ

سہ ماہی

کینیڈا

ترتیب

۱۔اداریہ ---------- اصغر مہدی اشعر (کینیڈا) ---------- ۵

۲۔ایڈیٹر کے نام خط ---------- ڈاکٹر ہلالؔ نقوی (پاکستان) ---------- ۷

۳۔سلام بر زمینِ انیسؔ ---------- ۹

ضامنؔ جعفری (کینیڈا)
ڈاکٹر عقیل عباس جعفری (پاکستان)
ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی (پاکستان)
ڈاکٹر ناشرؔ نقوی (انڈیا)
احمر شہوارؔ (امریکہ)
شباہت عباس شبیہؔ (پاکستان)

۴۔نذرِ انیسؔ ---------- ۱۲

اختر آصفؔ زیدی (کینیڈا)
پروینؔ رضوی (پاکستان)
شہابؔ صفدر (پاکستان)
علی عرفانؔ (کینیڈا)
ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی (پاکستان)

۵۔میر انیسؔ کا غیر مطبوعہ نوحہ ---------- مکرّم ارشاد (انڈیا) ---------- ۱۷

۶۔میر انیسؔ سے ایک گفتگو ---------- سیّد جاوید حسن (پاکستان) ---------- ۱۸

۷۔میر انیسؔ کے کمالاتِ ہنر ---------- ڈاکٹر اسد اریب (پاکستان) ---------- ۲۴

۸۔صنفِ مرثیہ اور کردار نگاری بحوالۂ انیسؔ ---------- پروفیسر زمان آزردہ (انڈیا) ---------- ۳۱

۹۔میر انیسؔ کے مزار کی تعمیر کی داستان ---------- ڈاکٹر تمثال مسعود (امریکہ) ---------- ۳۹

۱۰۔عصرِ حاضر میں سماجی اعتبار سے میر انیسؔ کے سلاموں کی معنویت ---------- ڈاکٹر وفا نقوی (انڈیا) ---------- ۴۲
۱۱۔انیسؔ کے گلستانِ سخن کی تہذیبی مہکار ---------- پروفیسر شاہدہ حسن (کینیڈا) ---------- ۵۰
۱۲۔انیسؔ اور معترضینِ انیسؔ ---------- پروفیسر سید علی عرفان (انڈیا) ---------- ۵۶
۱۳۔میر انیسؔ کے مرثیوں میں داستانوی عناصر ---------- ڈاکٹر فرحت نادر رضوی (انڈیا) ---------- ۶۵
۱۴۔مراثیِ انیسؔ میں ذکرِ اطفالِ اسیرانِ کربلا ---------- ڈاکٹر ریحان حسن (انڈیا) ---------- ۸۹
۱۵۔کلامِ انیسؔ میں ہندوستانی تہذیب وثقافت ---------- ڈاکٹر کشور جہاں زیدی (انڈیا) ---------- ۹۶
۱۶۔پروفیسر فضل امام بحیثیت انیسؔ شناس ---------- پروفیسر عباس رضا نیّر (انڈیا) ---------- ۱۰۲
۱۷۔نباضِ زبان وادب میر ببر علی انیسؔ ---------- پروفیسر ایس ایم ارشد رضوی (انڈیا) ---------- ۱۰۸
۱۸۔ہندوستانی تہذیب وثقافت اور مراثیِ انیسؔ کے خواتین کردار ---------- پروفیسر شہیب نجمی (انڈیا) ---------- ۱۱۷
۱۹۔خاندانِ انیسؔ کی زبان ---------- شہابؔ کاظمی (امریکہ) ---------- ۱۲۹
۲۰۔میرا انیسؔ ---------- فدا محمد ناشاد (پاکستان) ---------- ۱۳۶
۲۱۔مراثیِ انیسؔ کے نسائی کرداروں کا مطالعہ ---------- ممتاز فاطمہ کاظمی (پاکستان) ---------- ۱۴۳
۲۲۔میر انیسؔ اور حضرت عباسؑ ---------- ذیشان زیدی (برطانیہ) ---------- ۱۵۳
۲۳۔انیسؔ کی Negative Capability ---------- عادل مختار (پاکستان) ---------- ۱۶۵
۲۴۔مراثیِ انیسؔ میں امام حسینؑ کے ہندوستان آنے کا تذکرہ ---------- زائر حسین ثالثی (انڈیا) ---------- ۱۷۲
۲۵۔انیسؔ شعرا کی نظر میں ---------- علی عرفان (کینیڈا) ---------- ۱۷۹
۲۶۔انیسؔ کی زبان پر اعتراض ---------- صفدرؔ ہمدانی (برطانیہ) ---------- ۱۹۲
۲۷۔خاندانِ میر انیسؔ کے مرثیہ گو شعرا ---------- گوہر لکھنوی (انڈیا) ---------- ۱۹۷
۲۸۔امکانات اور مراثیِ انیسؔ ---------- اکبر حسین جعفری (امریکہ) ---------- ۲۰۵
۲۹۔انیسؔ کا رثائی احساس ---------- عادل مختار (پاکستان) ---------- ۲۱۱
۳۰۔انیسؔ کی خلاّقیت ---------- علی عرفان (کینیڈا) ---------- ۲۱۵
۳۱۔کردارِ فاطمہ صغریٰؑ کلامِ میر انیسؔ کے آئینے میں ---------- زائر حسین ثالثی (انڈیا) ---------- ۲۱۹
۳۲۔رباعیاتِ انیسؔ ---------- عذرا انجم (انڈیا) ---------- ۲۲۵
۳۳۔میر انیسؔ کربلائیات کے ناشر ---------- سیّد مشاہد عالم رضوی (انڈیا) ---------- ۲۳۲
۳۴۔ناقدریٔ عالم ---------- شاہ زمان شمسی (پاکستان) ---------- ۲۳۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اداریہ

انیسؔ، اُردو مرثیہ اور تنقید

میر ببر علی انیسؔ دنیائے ادب میں ایک ایسا نام ہے جسے شاعری اور مرثیہ نگاری کے میدان میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انیسؔ کا مقام اُردو شاعری میں وہی ہے جو فردوسی کا فارسی شاعری میں ہے۔ انیسؔ کو مرثیہ نگاری کا شہنشاہ کہا جاتا ہے، انیسؔ کی شاعری میں جو گہرائی، جذبہ اور فنی مہارت ہے وہ اس کے انتقال کے ڈیڑھ سو سال کے بعد بھی پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہے، انیسؔ کی شاعری صرف واقعاتی بیان اور روایات کا منظوم خراجِ عقیدت نہیں بلکہ زبان کا چاؤ، تشبیہات و استعارات کا حسن، مکالمہ نگاری اور منظر کشی کی انتہا، سادگی اور روانی، گہرائی، فنی مہارت بالخصوص انسانی جذبات و احساسات کے بیان نے انیسؔ کی شاعری کو اردو ادب کا ناقابلِ فراموش حصہ بنا دیا ہے۔ انیسؔ اور دوسرے مرثیہ نگاروں میں واضح فرق اس کی زبان کی سادگی اور روانی ہے جو عام سامعین کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی ذوق رکھنے والوں کو بھی متاثر کرتی ہے، یہ خصوصیات مرثیہ گوئی کو محض ایک صنف کا درجہ نہیں دیتی بلکہ اس کو مکمل ادبی حیثیت عطا کرتی ہیں اور ادبِ عالیہ کا درجہ دیتی ہیں۔

گو کہ انیسؔ کی شاعری کا محور، اس کا مرکز کربلا کا سانحہ اور قربانیِ حسینؑ ہے لیکن ان کے کلام کی گہرائی آگے بڑھ کر انسانی اخلاق، اقدار، عشق، محبت، نفرت، ظلم، ایثار، جذبہ، وفا، قربانی، بربریت، دہشت، تنہائی، فراق، بہادری، مظلومیت، احترام اور اپنی ذات کو فدا کرنے، نچھاور کرنے اور دیگر حقیقتوں کو چھوتی ہے۔ وہ شاعری کے فنی محاسنوں یعنی استعارات و تشبیہات و تمثیل کو ان کے بہترین استعمال کے ساتھ اپنے مصرعوں میں پیش کرتے ہوئے واقعۂ کربلا کو فطرتِ انسانی کے قریب سے قریب تر لانے کا ہنر رکھتے ہیں۔ انیسؔ کی زبان و بیان کی مہارت اتنی عمیق ہے کہ وہ اپنے قارئین اور سامع کو ایسی جذباتی دنیا میں لے جاتے ہیں کہ وہ خود کو کربلا کے میدان میں محسوس کرتے ہیں۔ وہ انیسؔ کی شاعری کے چند بند کے ذریعے صدیوں کا سفر لمحوں میں اختیار کرتے ہوئے کبھی اپنے آپ کو امامؑ کے خیمے میں پاتے نہیں تو کبھی میدان میں ان کے ساتھ ساتھ، جہاں جہاں انیسؔ کے کردار وہاں وہاں اس کا قاری و سامع۔ الغرض یہ انیسؔ کے مصرع نہیں، اس کے بند نہیں بلکہ یہ انیسؔ کی کربلا ہے کہ جہاں اس کا ہر لفظ اپنا علامتی و فلسفیانہ پہلو بتلاتا ہوا دکھائی دیتا ہے، وہ انسانی کردار، اخلاق اور فطرتِ انسانی کی گہرائی کو سمجھتے ہوئے ان واقعات کے اثر کو اپنے قاری اور سامع کے ذہنوں پر ان مٹ نقوش چھوڑنے میں کوئی کمی نہیں رکھتے اور پچھلے ڈیڑھ سو سال سے یہ اثر سخن سنجوں اور عام قاریوں کو زبانِ اردو پر وجد کرنے اور انیسؔ کے لہجے کی موسیقیت اور آہنگ سے محظوظ ہونے پر مجبور کر رہا ہے۔ یہ وہ سرمایہ ہے جس کی اہمیت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔

انیسؔ کی سب سے بڑی ادبی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے اُردو شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی، انیسؔ نے اُردو زبان کو ایک نیا اسلوب دیا، اردو زبان بعدِ انیسؔ اپنے اندر وہ گہرائی و گیرائی پاتی ہے جو انیسؔ سے پہلے اس کا مقدر نہ تھی، انیسؔ کی شاعری نے اُردو ادب کو ایک نیا موڑ عطا کیا ہے، یہ وہ موڑ ہے جو اُردو کو فارسی کے مقابل لا کھڑا کرتا ہے، یہ وہ موڑ ہے جو اُردو زبان میں الفاظ کے استعمال کو اپنی معراج پر پہچاتا ہوا

نظر آتا ہے اور زبان کے استعمال کی ایسی مثالی سامنے لاتا ہے جو آسمانِ اُردو ادب کی آفاقیت اور قدامت کا باعث ہے۔

تنقید ادب کی روح ہے، اگر ادب دل ہے تو تنقید دھڑکن، اگر ادب دماغ ہے تو تنقید اس کی عقل وفہم، اگر ادب جسم تو تنقید وہ طاقت جس کے ذریعے یہ جسم سانس لیتا ہے، تنقید شاعری کو نئے زاویے سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

اُردو مرثیہ بھی تنقید سے مبرّا نہیں ہے۔ تنقید کی مختلف اقسام اور رویے مرثیے کو سمجھنے اور اس کی ترقی میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ تنقید کا مقصد فن کی بہتری ہو، بے جا نکتہ چینی نہ ہو، تنقید فن اور معنوی پہلوؤں پر مرکوز رہے اور شبلیؔ، حالیؔ، ممتاز حسین اور احتشام حسین کی طرح اُردو ادب کے وسیع تناظر میں پرکھا جائے، تنقید تعمیری، منطقی اور تحقیقی ہو، زبان الفاظ اور لہجے کے درست چناؤ کے ساتھ ہو، جذباتیت سے عاری ہو اور جس کا اثر ادب کی ترقی کی صورت اور ذریعہ دکھائی دے۔

قصہ مختصر، انیسؔ اس شاعرِ اعظم کا نام ہے جس نے اُردو ادب کو وہ سرمایہ دیا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، ان کی شاعری اُردو ادب کا عظیم شاہ کار ہے اور ان پر کی جانے والی ''ادبی تنقید'' اس صنف کی عظمت کو مزید اُجاگر کرتی ہے، ہمیں تنقید برائے تنقید سے گریز کرتے ہوئے انیسؔ کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے اور مرثیے کی اس عظیم صنف کو فروغ دینا چاہیے، انیسؔ کی زبان اور اس کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے مجھے اپنی ایک عمر کی مدت کم دکھائی دیتی ہے، فرہنگِ انیسؔ کی تدوین واشاعت اور انیسؔ کے ۲۳۷ مطبوعہ مرثیوں کی عرق ریزی کے بعد بھی اگر یہ کہوں تو سچ ہے کہ ابھی انیسؔ کے کلام کی صحیح قدر و قیمت کا ادراک اور احاطہ باقی ہے۔

انیسؔ کے انتقال کو ڈیڑھ صدی بیت چکی اور اس بات کی دلی مسرت ہے کہ آج بھی ہر عمر کا فرد انیسؔ کی شاعری کے سحر میں اپنے آپ کو جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ فروغِ مرثیہ کا انیسؔ نمبر آج کے دور کے ادباء، شعرا، محققین اور ناقدین کا خراجِ عقیدت ہے۔ یہ شمارہ جناب مہدی عباس حسینی کے ''آج کل'' کے انیسؔ نمبر، غالب اکیڈمی کینیڈا کے عالمی میر انیسؔ سیمینار نمبر، گوپی چند نارنگ صاحب کے ''انیسؔ و دبیرؔ۔ دوسو سالہ سیمینار''، غلام حیدر صاحب کے ''کتاب نما'' کا انیسؔ نمبر، محمد طفیل صاحب کے ''نقوش'' کا انیسؔ نمبر، نسیم درانی صاحب کے ''سیپ'' کا انیسؔ نمبر، اور ڈاکٹر ہلالؔ نقوی کے مرتبہ انیسؔ نمبر (رثائی ادب) کا تسلسل ہے، انیسؔ اور ان تمام مدیران کو خراجِ عقیدت کی ایک کوشش ہے جنھوں نے انیسؔ اور اس کے کلام کو پچھلی ڈیڑھ صدی میں زندہ رکھنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ فروغِ مرثیہ کا انیسؔ نمبر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اگلا شمارہ ان شاءاللہ دبیرؔ نمبر ہوگا۔

فروغِ مرثیہ کے اس خصوصی شمارے میں انیسؔ کی شخصیت، ان کی ادبی خدمات اور ان کی شاعری اور اس کے اثرات پر بات کی گئی ہے، یہ مضامین، یہ سلام، یہ کلام، یہ رباعیات سب کے سب غیر مطبوعہ ہیں اور آپ کی خدمت میں انیسؔ کا ایک غیر مطبوعہ نوحہ بھی پیش کیا جا رہا ہے، اپنی آراء اور تاثرات سے ضرور مطلع کیجیے گا اور اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

طالبِ دعا
اصغر مہدی اشعر، ملٹن، کینیڈا
۲۷/اکتوبر ۲۰۲۴ء

ایڈیٹر کے نام خط

ڈاکٹر ہلالؔ نقوی

جناب اصغر مہدی اشعرؔ

ایڈیٹر

سہ ماہی فروغِ مرثیہ، کینیڈا

تسلیمات!

اُردو تحقیق وتدوین کی تاریخ میں بہت کم اہلِ قلم ایسے ہوں گے جنھوں نے پانچ سال کی انتہائی قلیل مدت میں اتنے اہم کام سرانجام دیئے ہوں۔ میں حیرت میں ڈوبا ہوا ہوں اور یہ حیرت مجھے اس وجہ سے بھی ہے کہ ادبی رسائل سے متعلق معاصرین میں شاید ایک آپ ہی ہیں جو براہِ راست زبان وادب سے وابستہ نہیں رہے۔ یہ ضرور ہے کہ آپ کی شخصیت میں تحت الفظ مرثیہ پڑھنے کا جو جوہر تھا وہ آپ کو غیر محسوس طور پر رثائی ادبیات سے قریب تر لے گیا۔ چنانچہ تدوینِ مرثیہ اور لغت نویسی کی طرف آپ ایسے مائل ہوئے کہ یہ فنی ولسانی وابستگی آپ کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ یقین نہیں آتا کہ آپ کی اتنی جفاکش دفتری مصروفیات۔ آئے دن بیرونی ممالک آنا جانا، اور پھر ایسے گہرے ادبی مشاغل۔ آپ واقعی داد کے مستحق ہیں! آپ کے جریدے، ''فروغِ مرثیہ'' کے Back Title پر آپ کی ترتیب دی ہوئی کتابوں کی فہرست دیکھتا ہوں جس میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے تو کم از کم یہ اعتماد بڑھتا ہی رہتا ہے کہ بیرونِ پاکستان رثائی ادب کی ترقی کو ضمانت مل گئی ہے۔ فروغِ مرثیہ کے ۱۷ شماروں کے بعد اب ۱۸ واں شمارہ آپ نے میر انیسؔ سے منسوب کیا ہے اور مجھ سے بالا اصرار ایک مضمون کے بھی آپ طلب گار ہیں۔ خدا آپ کو کامیابی سے ہم کنار کرے البتہ میں اس بات سے پریشان ہو گیا ہوں کہ مجھے مضمون لکھنا ہے مگر یقین کیجیئے کہ میں اتنے جھمیلوں میں ہوں کہ لکھ نہیں سکوں گا۔ آپ اسے اپنے دل پر قطعی نہیں لیجیئے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے شہر کراچی سے بہت دور آجکل کینیڈا میں اپنے بیٹے کے پاس ہوں۔ یہاں میرے پاس ایک دو کتابوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے نصف صدی سے زیادہ رثائی ادب سے میرا

ادبی رشتہ اپنی جگہ پر لیکن پُراثر، اچھی اور ادب افروز تحریر کے لیے کچھ کتابیں ضرور دیکھنا پڑتی ہیں۔ میرا اپنا مختصر مگر ایک طرح کا جامع کتب خانہ میرے گھر کے ایک کمرے میں ہے۔ یہاں تو میں خالی ہاتھ اور خالی الذہن ہوں۔

سہ ماہی فروغِ مرثیہ کے ''انیسؔ نمبر'' کی ترتیب وتدوین کے لیے آپ کے سامنے یقیناً بہت سی مشکلات ہوں گی۔ گذشتہ عشروں میں جو انیسؔ نمبر پاک وہند میں شائع ہوئے ہیں وہ تو آپ نے دیکھے ہی ہوں گے۔ ان میں بڑے اہم مقالے شائع ہوئے ہیں۔

ایک بڑی مجبوری یہ ہے کہ اُردو ادب کے بڑے نقّاد اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔ اب انگلیوں پر گنے جانے والے مرثیہ شناس کم ہی رہ گئے ہیں۔ وہ اگر وقت نکال سکے تو کچھ نہ کچھ لکھ دیں گے۔ پھر آپ نے یہ جوٹھان لی ہے کہ غیر مطبوعہ مضامین ہی شائع کریں گے اُس نے اور رکاوٹیں کھڑی کردی ہیں۔ خدا کرے آپ حوصلہ نہ ہاریں اور آپ کا انیسؔ نمبر اپنا وقار برقرار رکھے۔

اشعر! آپ یہ بات جانتے ہی ہیں کہ اُردو کے عظیم شعرا میں ایک بے چارے انیسؔ ہی ہیں جو فرقہ پرستی کے تعصّبات کی بھینٹ چڑھ گئے۔ پورا عالمی ادب چھان لیجیے یہ کدورتیں کہیں نہیں ملیں گی۔ شاعر اور اس کی شاعری کے درمیان صرف شاعری ہی ہوتی ہے جو اس کی ادبی حیثیت کا تعین کرتی ہے۔ موضوع بڑا ہونے سے شاعری بڑی نہیں ہوجاتی اگر یہی معیار ہوتا تو حمد ونعت سے بڑی شاعری کوئی نہ ہوتی۔ ہمیں انیسؔ کی فنکارانہ عظمت کو ہی دیکھنا ہوگا۔ انسانی رشتوں کی اتنی بڑی شاعری دنیا کے کسی بھی ادبی وشعری فن پارے میں نہیں ملے گی! میں آپ کے لیے دعا گو ہوں کہ آپ ایک مثالی اور یادگار انیسؔ نمبر نکال سکیں۔

والسلام: ڈاکٹر ہلالؔ نقوی

۱۶/اکتوبر ۲۰۲۴ء

برلنگٹن، کینیڈا

سلامؔ برزمینِ انیسؔ

ضامنؔ جعفری

انیسؔ کی ہے زمیں گو قدم بچا کے چلے　　قدم قدم پہ گِرے اور لڑکھڑا کے چلے
لبوں پہ ذکرِ حسینؑ اور آنکھ میں آنسو　　یہ کائنات ہے جو لے کے ہم خدا کے چلے
جو چاہیے درِ آلِ عباؑ سے کیجے طلب　　یہ لوگ وہ ہیں کہ کام اُن سے انبیاء کے چلے
قضا نہ اُلجھے محبّانِ اہلِ بیتؑ کے ساتھ　　ہمارے ساتھ کہاں پینترے فنا کے چلے
نیا زمانہ ہے قدریں بچایئے ضامنؔ　　''چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے''

ڈاکٹر عقیل عباس جعفری

بجھے چراغ سے دنیا کو جگمگا کے چلے　　حسینؑ کیسا عجب معجزہ دکھا کے چلے
جو حرؑ نے نام بتایا امامؑ کو اپنا　　امامؑ بھی اسے معنیِ حر سمجھا کے چلے
حسینیوںؑ کو کبھی فکرِ بیش و کم نہ ہوئی　　بچھایا فرش عزا ، سلسلے عطا کے چلے
انہی کو مانتے ہیں بس کتاب کا وارث　　سناں کی نوک پہ جو آیتیں سنا کے چلے
وہاں پہ ذکرِ علم دار خود ہی در آیا　　جہاں میں جب بھی کہیں تذکرے وفا کے چلے
انہی کو زیبا ہے دعوائے بوترابی بھی　　کفن میں اپنے جو خاکِ شفا سجا کے چلے
نجانے کیسی کشش تھی زمینِ مقتل میں　　جوان ہی نہیں بچّے بھی مسکرا کے چلے
ہر ایک گردشِ کون و مکاں ٹھہر سی گئی　　پسر کی لاش کو شبیرؑ جب اٹھا کے چلے
سنبھل کے رکھنا قدم یہ انیسؔ کی ہے زمیں　　''چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دلوں میں حُبِّ حیدرؑ ، اُلفتِ شبیرؑ رکھتے ہیں　　سمجھنے کے لیے قرآن کو ، تفسیر رکھتے ہیں
محرّم جب بھی آتا ہے عزا خانہ بناتے ہیں　　خرابہ ہو کوئی ہم جوہرِ تعمیر رکھتے ہیں

ہمیں ہرگز غریب و مفلس و نادار مت سمجھو　　غمِ کرب و بلا کی قیمتی جاگیر رکھتے ہیں
بڑھاتا ہے بہت ہمّت غمِ شبیرؑ میں گریہ　　یہ آنسو حوصلے اور عزم کی تاثیر رکھتے ہیں
فضیلت ایک جیسی مانتے ہیں جو صحابہ کی　　ہم ان کے سامنے بس آیۂ تطہیر رکھتے ہیں
انہی کے چاہنے والے ہیں بس وہ ہی بچائیں گے　　محبّ آلؑ کب کچھ خوف دامن گیر رکھتے ہیں
خمیدہ ہے کمر اور سر جھکا سجادؑ کا یوں ہے　　گلے میں طوق اور پاؤں میں وہ زنجیر رکھتے ہیں
خدا کی راہ میں فدیہ لیے شبیرؑ آتے ہیں　　وہ پھر سے خوابِ ابراہیمؑ کی تعبیر رکھتے ہیں
فقط گردن بڑھا سکتے ہیں نصرت کے لیے ورنہ　　تمنا دل میں کیا کیا اصغرؑ بے شیر رکھتے ہیں
قلم سے موقلم کا کام لیتے ہیں انیسؔ ہر دم　　بنا کر لفظ کے رنگوں سے وہ تصویر رکھتے ہیں
زمیں میں ان کی لکھنا عین خوش بختی ہے مظہرؔ کی　　انیسؔ باصفا کی نقشِ دل تحریر رکھتے ہیں

ڈاکٹر ناشرؔ نقوی

علم حسینؑ کا ہاتھوں پہ جو اُٹھا کے چلے　　تو یہ بھی شرطِ بلندی ہے سر جھکا کے چلے
حسینؑ کہہ کے خُدا سے ، ہوئے ہیں سر بہ سجود　　یہاں جو حکم چلے ، بس تیری رضا کے چلے
رہا حسینؑ کے ہونٹوں پہ کلمۂ توحید　　نہیں کے نیزے پہ اِقرار کو سجا کے چلے
ہوا نہ کوئی بھی تشنہ دہن حسینؑ کے بعد　　کچھ ایسے ضابطے صحرائے کربلا کے چلے
شفق ہو یا کہ اُفق ، سرخرو ہیں شام و سحر　　حُسینؑ والے بھی کیا معجزے دِکھا کے چلے
جہاں پہ اہلِ وفا کو نہ مِل سکا پانی　　سَروں کی فصلیں اُسی خاک پر لگا کے چلے
جدھر جدھر سے بھی گُذرے ہیں رہروانِ عطش　　فراتِ اشک ، ہر اک آنکھ کو بنا کے چلے
سپاہِ شام کے ظلم و ستم لرزنے لگے　　خُدا کے سامنے جب قافلے دعا کے چلے
چراغِ نصرتِ شبیرؑ ، اب بھی روشن ہے　　کسی طرح کے نہ حَربے یہاں ہوا کے چلے
لگانے آئے فرشتے سبیلیں اشکوں کی　　جو کربلا کی طرف کارواں عزا کے چلے
ستم کے تیر تو خود روئے ہیں گلے مل کر　　یہاں تو گود کے بچے بھی مُسکرا کے چلے
کہاں انیسؔ کی عظمت کہاں ہو تم ناشرؔ　　'چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے'

احمر شہوارؔ

جو بھی غمِ حسینؑ کے نشّے میں چُور ہیں　　دنیا میں ایسے لوگ ہی اہلِ شعور ہیں

روکے ہوئے ہے آیتِ تطہیر کی فصیل　　جو رجس ہیں وہ مجلسِ سرورؑ سے دور ہیں
کرتا ہے رب کلام سرِ کربلائے عشق　　بے شک حسینؑ نازشِ معراج و طور ہیں
دنیا بنی ہوئی ہے مضافاتِ کربلا　　اس ملکِ کربلا کے ہزاروں شہور ہیں
اے دشمنِ حسینؑ کتابِ عزا کو کھول　　الفاظ وہ بھی پڑھ کہ جو بین السّطور ہیں
اجمالِ رب کا آج بھی کرتے ہیں انعکاس　　کچھ کربلا میں آئینے بکھرے ضرور ہیں
رہتے وہیں ہیں چھوڑ کے مرقد کو انبیاؑ　　انصارِ کربلاؑ کی جہاں پر قبور ہیں
وہ خوابِ تختِ رَے کی ہی تعبیر دیکھ لیں　　بغضِ حسینؑ رکھ کے جو مشتاقِ حور ہیں
کہتا ہے گر کے قدموں پہ فطرس حسینؑ کے　　''روتا ہوں اس لیے کہ اکیلے حضور ہیں'' (مصرع انیسؔ)
تیرِ ستم کو روک لے ملعون حرملا　　اصغرؑ تو چند ماہ کے ہیں بے قصور ہیں
تفویز شاہؑ کرتے ہیں عابدؑ کو وقتِ عصر　　اس عہدہِ خدا کے جو رمز و اُمور ہیں
شہوارؔ صَرف کرتا ہے مصرع انیسؒ کا　　جتنے پلِ صراط ہیں سارے عبور ہیں

شباہت عباس شبیہؔ

سجا کے سرخیٔ ماتم سے اپنے سینوں کو　　دیا ہے سکتۂ حیرت فلک نشینوں کو
نفاق و کفر ہو یا شرک بس خلاصہ ہے　　علیؑ کے نام سے آتی ہے موت تینوں کو
یہ ماتمی ہیں انھیں خلد لے کے چلنا ہے　　اے نوحؑ کیجیے تیار سب سفینوں کو
بدن کٹے تو کٹے مثلِ حجر ابنِ عدی　　مگر نہ کرتے ہیں تسلیم ہم لعینوں کو
طوافِ چہرۂ اکبرؑ ہے لازمی ان پر　　یہ اطلاع دو دنیا کے سب حسینوں کو
صلوۃ پشتِ نبیؐ پر سرِ سناں قرأت　　مرا سلام ہو شبیرؑ کے قرینوں کو
عزائی آنکھ ، یدِ ماتمی ، ولائی کا دل　　خدائی رشک سے تکتی ہے ان خزینوں کو
جو بندگی کے مدارج نبھا گئے ہیں حسینؑ　　نبھا سکے گا بھلا کون ایسے زینوں کو
سرِ نماز کیا ہے حسینؑ پر گریہ　　جھکا لیا سرِ فرشِ عزا جبینوں کو
ٹپکنے والے ہیں جو ابروؤں سے حضرتؑ کی　　فرات مانگ رہی ہے انھی پسینوں کو
بچھا کے کرب و بلا اور نجف ملک بولے　　''ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو''
سروں میں خاکِ گریبان چاک دس دن تک　　الٹ کے چلتے ہیں ہم اپنی آستینوں کو
کجا حسینؑ کا سینہ کجا اسیریٔ شام　　''قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو''
شبیہؔ دل میں دبے ہیں جو شعر کی صورت　　کبھی نکالیے باہر سبھی دفینوں کو

نذرِ انیسؔ

اختر آصفؔ زیدی

اے انیسؔ شاہِ والا ، نازنینِ لکھنؤ　　تجھ سے قائم ہے عزا میں شہ نشینِ لکھنؤ
خَم نہ ہو کیوں تیرے قدموں پر جبینِ لکھنؤ　　کربلا میں تُو نے رکھ دی ہے زمینِ لکھنؤ
کِلک سے تیرے چمکتے ہیں نگینِ لکھنؤ　　شاعروں نے تھام لی حبل اُلمتینِ لکھنؤ
تیرے پہلو میں درخشاں ہے ثمینِ لکھنؤ　　ارضِ خاکِ لکھنؤ کے بہترینِ لکھنؤ
اِس قدر شاداب ٹھہری سرزمینِ لکھنؤ　　اک دبیرِؔ آسماں ، اک تُو متینِ لکھنؤ
تُو تعارف کا ذریعہ کربلا کے واسطے　　محرمِ ذِکرِ عزا ہیں محرمینِ لکھنؤ
تیرے لفظوں کی کشش ، تیری متاعِ فکر سے　　کربلا اعراق سے آئی قرینِ لکھنؤ
تُو مُہاجر ہو کے بھی لوگوں میں کب تھا اجنبی　　صادقینِ لکھنؤ میں ، تُو امینِ لکھنؤ
اِس کو بھی لاریب کے زُمرے میں رکّھا چاہیے　　دامِ وہم و ریب سے باہر یقینِ لکھنؤ
راستہ تحقیق کا اِصرار کرتا ہے ، کہو　　مرثیے کا قدّ و قامت ہے رہینِ لکھنؤ
اِن میں شامل ہیں نفیسؔ و مُونسؔ کرب و بلا　　کر دیئے تُو نے مقرّر جانشینِ لکھنؤ
کیا مودّبؔ ، کیا مہذّبؔ ، کیا تعشّقؔ ، کیا رَوِشؔ　　کس کو ، کس کو مَیں لکھوں گا عارفینِ لکھنؤ
واقفِ اَوجؔ و عروجؔ و فائزؔ و فاخرؔ تو ہو　　وہ مورّخ جس نے دیکھے ہوں سِنینِ لکھنؤ
مَیں خداوندِ سخن تجھ کو نہیں کہتا ، مگر　　دل سے تجھ کو مانتا ہُوں قائدینِ لکھنؤ
عہدِ حاضر میں ، تجمُّلؔ ، سالکؔ و ماہرؔ ، مِلے　　مَیں بھی آصِفؔ ہوگیا ہُوں واقفینِ لکھنؤ

پروین رضوی

قدرداں جن کے ملائک وہ سخنور ہیں انیسؔ　　فلکِ علم و ادب کے مہِ انور ہیں انیسؔ
قلزمِ حرف و معانی کے شناور ہیں انیسؔ　　ہیں خداوندِ سخن زینتِ منبر ہیں انیسؔ
ان کے اشعار میں میں ہے آلِؑ محمدؐ کی ولا
ان کے افکار میں الہامِ پیمبرؐ کی ضیا

دامنِ فکر و نظر جیسے زمیں کی وسعت　　عظمتِ حرف پہ حیراں ہے فلک کی رفعت
بزمِ تحریرِ وفا ہے کہ جہانِ ندرت　　نوکِ خامہ کو میسّر ہے سخن پر قدرت
نور کی چاندنی رنگوں کی فصیلیں ہر سو
قلبِ قرطاس پہ خوشبو کی سبیلیں ہر سو

آپ نے روح میں اک کرب کو آباد کیا　　اک عجب طور سے مقتل کو بھی روداد کیا
وقت کی قید سے رفتار کو آزاد کیا　　آلِ احمدؐ کو بہ اندازِ دگر یاد کیا
دشت بیدار ہوئے کوہ و دمن جاگ اٹھے
کربلا والوں کی خوشبو سے چمن جاگ اٹھے

جذبۂ شوق کو زنجیر کیا ہے جس نے　　منظرِ کرب کو تصویر کیا ہے جس نے
قصرِ احساس کو تعمیر کیا ہے جس نے　　خاکِ افکار کو اکسیر کیا ہے جس نے
جس کی تمثیل نہیں اور کوئی ہمسر بھی نہیں
جز انیسؔ ایسا کوئی اور سخنور بھی نہیں

نوکِ خامہ تھی کہ اک شعلۂ بے دود خوشا　　آج بھی فن کا علم لے کے ہیں موجود خوشا
وہ تھے اس سجدہ گہہ فرش کے مسجود خوشا　　ان کے کردار سے راضی رہا معبود خوشا
ارث میں ان کو وفاداریٔ اجداد ملی
منصبِ عشق ملا قامتِ شمشاد ملی

شہابؔ صفدر

اے فیض یابِ چشمِ شہِؑ کربلا انیسؔ　　لکّھوں ترے سخن کے میں اوصاف کیا انیسؔ
اک ایک لفظ ہے جو دُرِ بے بہا انیسؔ　　کیا قدر طے کرے گا یہ عاجز بھلا انیسؔ
نازاں بیان جس پہ ہے وہ خوش بیاں ہے تو
اردو زباں کو فخر کہ اہلِ زباں ہے تو

دریائے گومتی کے کنارے گواہ ہیں　　شاہد ہے موج موج تو دھارے گواہ ہیں
ہیں چشمِ دید سیپیاں تارے گواہ ہیں　　بُستانِ لکھنؤ کے نظارے گواہ ہیں
موتی لٹا گئی وہ روانی کلام کی
کانِ گہر ہے سامعہ ہر خاص و عام کی

ورثہ تجھے ملا ہے حسنؔ اور خلیقؔ کا　　لعلِ شفق میں رنگ ہے دستِ شفیق کا
نام و نمود اثر ہے فضائے عتیق کا　　گویا نگیں ہے اصل میں ٹکڑا عقیق کا
ماحول کا اثر ہے جِلا تربیت کی ہے
پاکیزگی دہن کی صفا تربیت کی ہے

منبر پہ آ کے تو نے کیا جلوہ جس گھڑی　　وقتِ سحر تھی طبع میں آمادگی بڑی
ایسے میں ایک میٹھی صدا کان یوں پڑی　　کینڈے نے کی زبان کے سر منزلت کڑی
گونگی لغت کو صاحبِ اعجاز مل گیا
مصحف کا بولی ٹھولی کو اعزاز مل گیا

غیر از فصیح خوانِ تکلّم تھا بے نمک　　کم کم تھا لطفِ شعر تری لب کشائی تک
تیرے سخن سے بابِ فصاحت کھلا چہ شک　　نہج البلاغہ کی ترے لفظوں میں ہے چمک
جس کو شغف ذرا عرَبی فارسی سے ہے
سرشار اس کا ذوق تری شاعری سے ہے

ہے لفظ لفظ نظم میں آہنگ سے بندھا　　مضموں ہے ایک پھول کا سو رنگ سے بندھا
تارِ نظر جو کارگہِ جنگ سے بندھا　　ناظر کا سانس ہے زرہَ تنگ سے بندھا
یوں رزم کی بساط بچھی دل کے سامنے
سامع بھی ڈٹ گیا صفِ باطل کے سامنے

جب کھینچتا قلم ہے ترا عکسِ بزمِ یار　　گرتے ہیں لو پہ شمع کی پروانے بار بار
کاغذ پہ گل کھلائے جو رنگینیِ بہار　　صحرائے صفحہ بھی نظر آئے بہشت زار
آنکھوں سے حور کی دُرِ شبنم ٹپکتے ہیں
اور دل میں رنگ رنگ کے غنچے چٹکتے ہیں

چہرہ سراپا رخصت و آمد جہاد بین　　ہر پہلو سے ہے مرثیہ اصنافِ فن کا زین
پورا کیا کمال سے تو نے یہ فرضِ عین　　جنّت میں ہو نصیب تجھے قربتِ حسینؑ
دعبلؔ کمیتؔ اور حمیریؔ کے ہم نوا
ہم سوزی کیا کریں تری مجھ ایسے کم نوا

کر کے بسیط قطرے کو قلزم کرے ہے تو　　برپا یمِ رواں میں تلاطم کرے ہے تو
تارے کو مہر ذرّے کو انجم کرے ہے تو　　گونگوں کو ماہرینِ تکلّم کرے ہے تو
تجھ پر ہے خاص چشمِ عنایت حسینؑ کی
پشتوں سے تیرا حصّہ ہے مدحت حسینؑ کی

رتبے پہ اپنے فخر ہے شاعر تجھے بجا　　کہتے ہیں سب چنا ہوا ذاکر تجھے بجا
مانیؔ پکارے نقش کا ماہر تجھے بجا　　نرگس خطاب دیتی ہے ساحر تجھے بجا
جزوِ مداد طور کی تنویر سرمہ ہے
باریک بینوں کو تری تحریر سرمہ ہے

میدانِ شاعری میں نہیں ہے تری مثال　　عاشق تری نوا کے حُدی خوانِ کہنہ سال
بے زور تیرے سامنے اسفند اور زال　　تیرے قتیل دشتِ غزل کے جواں غزال
زرتاب روئے فن گُل اسلوب تازہ ہے
ہر عہدِ نو کے نام یہ مکتوب تازہ ہے

تیرا قلم دکھاتا ہے تصویرِ صبحِ نور　　تسبیح خواں ہوتے ہیں دل صورتِ طیور
زیبِ ورق ہو قدرتِ قادر کا جب ظہور　　''دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور''
گلشن خجل ترے کفِ مینو اساس سے
جنگل مہکتے ہیں ترے پھولوں کی باس سے

کہتی ہے خلقِ عام خدائے سخن تجھے　　فن کا امام جانتے ہیں اہلِ فن تجھے
مہرِ جمالِ شعر کہیں خوش دہن تجھے　　ماہِ کمال بولے دبیرِ زمن تجھے
لگتا ہے بے کلیم اسے بن تیرے طورِ نظم
اب کس کے ہاتھ ہو گا جہاں میں ظہورِ نظم

افسردہ و ملول ہے منبر ترے بغیر　　لب بستہ ہیں سخن کے پیمبر ترے بغیر
سکتے میں ہیں چمن کے نواگر ترے بغیر　　گم صم کلی خموش گُل تر ترے بغیر
تیرا سخن صبا تھا سخن زار کے لیے
اور باعثِ گُہر صدفِ تار کے لیے

نسلوں نے تیرے حُسنِ تکلّم سے پایا فیض　　سرچشمہ فیض کا ہوا جس نے اٹھایا فیض
کچھ ایسے تو نے دل سے کمایا لُٹایا فیض　　گنجور ٹھہرا کاسہ وہ جس میں سمایا فیض
اب تک جو تیرے فیض کی جاری سبیل ہے
اردو کی نہر ہمسرِ دنیوب و نیل ہے

علی عرفانؔ

سرورؔ سے جو وفائے انیسؔ و دبیرؔ ہے　　قدموں میں شہؑ کے جائے انیسؔ و دبیرؔ ہے

ملکِ سخن پہ راج کسی اور کا نہیں　　یہ مملکت برائے انیسؔ و دبیرؔ ہے
مِٹ جاتا اِس زباں کا نشاں بھی جہان سے　　اردو تو بر بِنائے انیسؔ و دبیرؔ ہے
جو مبتلائے ضعفِ زبان و بیان ہیں　　اُن کے لیے دوائے انیسؔ و دبیرؔ ہے
ہم کو کِیا ہے دونوں نے کربل سے آشنا　　کربل بھی آشنائے انیسؔ و دبیرؔ ہے
احساس اپنا رہتا ہے جس کربلا میں آج　　وہ صاف کربلائے انیسؔ و دبیرؔ ہے
مدّاحوں میں حُسینؑ کے میرا شمار ہو　　یہ التجا خدائے انیسؔ و دبیرؔ ہے
کس منھ سے خود کو کہہ دے وہ سرورؑ کی خاکِ پا　　عرفاں تو خاکِ پائے انیسؔ و دبیرؔ ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

سخن کے گُل پئے مدحت کروں بنامِ انیسؔ　　میں جب بھی بزمِ عزا میں پڑھوں سلامِ انیسؔ
کوئی تو بات ہے کہتے ہیں جو خدائے سخن　　سخن شناسوں کا رہبر فقط کلامِ انیسؔ
زبان کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی ہے　　فصاحتوں سے بھرا ہے ہر ایک جامِ انیسؔ
ہے اختلاف بجا انتقاد کی رو میں　　مگر ہے لازم و ملزوم احترامِ انیسؔ
سنبھلتا ہے کہاں آسانیوں سے رَخشِ سخن　　کوئی بھی پا نہیں سکتا کبھی خرامِ انیسؔ
نظر نہ آئی ہے ایسی بلندیِ پرواز　　بڑے بڑوں کو بھی دیکھا ہے زیرِ دامِ انیسؔ
یہ اشک دامنِ عصیاں کو دھوتے جاتے ہیں　　سخن کا ہے یہ تبرّک بہ فیضِ عامِ انیسؔ
نہ بھول سکتے ہیں احسان تیرا اردو پر　　ہیں سارے مملکتِ شعر میں غلامِ انیسؔ
دبیرؔ دادِ سخن دے چکے ہیں القصّہ　　کہاں مجال بتائیں جو ہم مقامِ انیسؔ
زمینِ شعر پہ مظہرؔ بھی ڈگمگانے لگے　　سلام لکھتے ہوئے اس کو گر نہ تھامے انیسؔ

اشاریۂ انیسؔ
(زیرِ طبع)

اشاریۂ دبیرؔ
(زیرِ طبع)

میر انیسؔ کا غیر مطبوعہ نوحہ

مرزا جعفر علی خاں ''اثرؔ لکھنوی'' کا شمار اپنے دور کے بہترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک شاعر بلکہ ایک بلند پایہ نقاد، مترجم اور صاحبِ فرہنگ بھی تھے۔

اثرؔ صاحب کو مخطوطات جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، جس کی بنا پر انھوں نے اپنی حیات ہی میں ایک بڑا کتب خانہ بنا لیا تھا، جس میں چند نایاب قلمی نسخے موجود تھے، جن کا ذکر انھوں نے اپنے مضامین میں جا بجا کیا ہے۔

اثرؔ صاحب نے کافی نوحے اور سلام کہے ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف کتابچوں کی شکل میں شائع ہوئے ہیں لیکن ایک ساتھ کسی کتاب کی شکل میں اب تک نہیں چھپ سکے ہیں۔ یہ سلام اور نوحے اور ماتم آج بھی اہل لکھنؤ کے گھروں میں ایامِ عزا کے دوران پڑھے جاتے ہیں اور بہت مقبول ہیں۔ ان کے کتب خانے میں ایک لائقِ ذکر قلمی نسخہ ایک نوحے کی بیاض ہے جس میں خاندانِ انیسؔ کے علاوہ دیگر حضرات کے نوحے ہیں۔ اسی ''بیاضِ اثرؔ'' میں موجود میر انیسؔ کا ایک غیر مطبوعہ نوحہ پیشِ خدمت ہے۔ (مکرّم ارشاد)

میر انیسؔ کا غیر مطبوعہ نوحہ

مقتل کے قریب آن کے بانوؔ یہ پکاری ، جانی علی اصغرؑ
کس سمت ہو آواز تو دو تم پہ میں واری ، جانی علی اصغرؑ

افسوس صد افسوس کہ مقتل میں بھی جا کر، لب تشنہ رہے تم
مارے گئے پیاسے نہ بجھی پیاس تمھاری جانی علی اصغرؑ

بتلاؤ تو اب کس کو میں جھولے میں جھلاؤں، اور دودھ پلاؤں
تم مر گئے جیتی رہی ماں درد کی ماری ، جانی علی اصغرؑ

وہ گھٹنیوں چلنا ترا یاد آتا ہے مجھ کو، اے ہنسلیوں والے
اے اصغرِ ناداں میں تری لاش کے واری ، جانی علی اصغرؑ

یہ رات اندھیری میں تیری لاش پڑی ہے اور دشت ہے سُونا
کس واسطے روٹھے ہو یہ ماں ہوگئی واری جانی علی اصغرؑ

تاریک جہاں ہوگیا مرنے سے تمھارے، سنسان ہے سب گھر
آنکھوں کے تلے پھرتی ہے تصویر تمھاری ، جانی علی اصغرؑ

نادار ہوں محتاج ہوں کچھ بن نہیں آتی، لاچار ہوں بیٹا
کس طرح کفن دے تمھیں ماں درد کی ماری، جانی علی اصغرؑ

بیٹا کہوں جانی کہوں یا ہنسلیوں والا ، یا پیاس کا مارا
کیا کہہ کے تجھے روئے یہ ماں درد کی ماری، جانی علی اصغرؑ

خاموش بس اب آگے انیسؔ جگر افگار، ٹکڑے ہے کلیجا
تا حشر رہا بانوؔ کے لب پر یہی جاری ، جانی علی اصغرؑ

❁❁❁❁

میر انیسؔ سے ایک گفتگو

سیّد جاوید حسن

ذیقعد ۱۲۸۷ھ کی آخری تاریخیں بمطابق وسط فروری ۱۸۷۱ء میں حیدرآباد دکن آج ہی پہنچا ہوں۔غرض آنے کی یہ ہے کہ شنید ہے کہ اس سال محرّم میں حضرت انیسؔ یہاں مجالس پڑھنے آرہے ہیں، سوچا اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے کئی سال ہوگئے، گزشتہ ملاقات میں تحت اللفظ خوانی کے حوالے سے ان کے ارشادات سنے تھے اور رقم کیے تھے۔حضرت نے رخصت کے وقت فرمایا تھا کہ تمھیں اجازت ہے جب چاہو اس موضوع پر مزید گفتگو کر سکتے ہو۔گویا باریابی کا پروانہ بھی تھا، سو ہم یہاں پہنچ گئے کہ میرؔ صاحب کی مجالس میں شرکت بھی ہوگی اور یک گونہ فراغت وسکون سے ملاقات بھی ورنہ لکھنؤ میں تو ان کی مشغولیات اور اوقات کار بہت سخت ہیں۔

ابھی دو چار دن تو چار مینار، حسین ساگر، مکّہ مسجد کی زیارت وسیر ہوگی ارے ہاں گولکنڈہ کے کھنڈرات بھی جانا ہے اور گنبدانِ قطب شاہی پر فاتحہ خوانی کیسے چھوڑیں گے، وہیں تو ہماری پیاری اردو کا اوّلین صاحبِ دیوان محمد قلی قطب شاہ دفن ہے۔

اس سیر وزیارت کے دوران یہ بات دیکھی کہ شہر کا عجب عالم ہے، ابھی سے ایک شہرہ ہے میر انیسؔ آنے والے ہیں۔

حیدرآباد کے صاحبِ عزّت وثروت رئیس نواب تہوّر جنگ بہادر جو مجالسِ عزا برپا کرنے شوقین ہیں۔میر انیسؔ سے ناظمِ عدالت حیدرآباد شریف العلماء مولوی سید شریف حسین قبلہ کے توسّط سے رابطہ میں ہیں اور کوشش ہو رہی ہے کہ کسی طور میرؔ صاحب تیار ہو جائیں اور اس کوشش میں شریف العلماء اپنے برادرِ بزرگ شمس العلماء مولوی سید حامد حسین صاحب قبلہ مجتہد جو لکھنؤ میں مقیم ہیں اور میرؔ صاحب سے قربت رکھتے ہیں، سفارش کروا رہے ہیں لیجیے صاحب ابھی ذی الحج کی شروعات ہیں اور خبر آئی کہ بالآخر میرؔ صاحب سفرِ حیدرآباد پر آمادہ ہوگئے اور شاید ذی الحج کے دوسرے ہفتے تک حیدرآباد پہنچ جائیں۔شہر میں مجالس کی تیاریاں زوروں پر ہیں، چاندنیاں سی جارہی ہیں، جگہ جگہ سے شامیانے جمع کیے جارہے ہیں۔مختار الملک بہادر نے ایک خصوصی شامیانہ نہایت نفیس کپڑے کا جس کا طول ۲۰ گز اور عرض ۲۰ گز ہے مع ایک چوبی تخت کے بھیجا ہے اور ساتھ ہی تہوّر جنگ سے یہ بھی کہا ''سنا گیا ہے کہ میر انیسؔ صاحب آرہے ہیں، بہت معقول ونازک مزاج آدمی ہیں، ان کے لوازمِ مہمانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے اور نہ کوئی امر خلافِ احتیاط پیش آئے چاہیے کہ ان کی خاطر داری میں کوشش کی جائے۔'' نواب صاحب نے جواب دیا ''بسر وچشم۔''

نائب دیوانِ حکومت راجہ اندر نرائن جو ۱۰ ہزر روپیے ماہوار کے تنخواہ دار ہیں مجالس کے انتظامات بھی دیکھتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں۔''عشرۂ اولیٰ کے بعد ایک مجلس اپنے گھر پر کروں گا اور تمام بڑے بڑے اُمراء کو مدعو کر کے انیسؔ صاحب کو سنوں گا'' مجلس کا انعقاد نواب تہوّر جنگ کے مکان کے دالان در دالان اور اس سے متّصل وسیع صحن میں ہوگا، خوب صفائی ستھرائی ہو رہی ہے۔دیواروں پر سفیدی اور رنگ

وروغن کیا جارہا ہے۔

کہیں سے آواز آئی۔''ارے یہاں کے لوگ داد دینے میں بُخل کرتے ہیں اس لیے دو تین سو لوگوں کا خاص انتظام کیا گیا ہے جو داد دیں گے۔''

آج ۱۸ ذی الحج ۱۲۸۷ھ ہے اور ۱۱ مارچ ۱۸۷۱ء، خبر آئی کہ میرؔ صاحب آج پہنچنے والے ہیں نواب تہوّر جنگ بہادر، شریف العلماء سید شریف حسین اپنے دوستوں اور احباب کی کثیر تعداد کے ساتھ دلّی دروازے جاکر ان کا استقبال کریں گے، میں بھی ساتھ ہولیا میرؔ صاحب مع الخیر تشریف لے آئے، نواب صاحب نے اپنی ڈیوڑھی کی بالائی منزل پر انہیں مقیم کیا ہے۔

یہاں یہ عرض کردوں کہ حیدرآباد آنے سے قبل ہم نے حضرت شادؔ عظیم آبادی سے ایک سفارشی رقعہ بھی شریف العلماء کے نام لے لیا تھا تاکہ یہ پروانہ مجلسوں میں شرکت اور میرؔ صاحب سے تفصیلی ملاقات میں مددگار ہو۔ قبلہ سید شریف حسین صاحب بڑے تپاک سے ملے اور اپنے ملازمینِ خاص سندے خان اور حاجی نور محمد کو تاکید کی میرا خاص خیال رکھیں مجلس میں میری شرکت اور میرؔ صاحب سے تفصیلی ملاقات کو یقینی بنائیں۔

یہ دونوں ملازمین انیسؔ صاحب کی خدمت پر مامور ہیں۔ اور بڑی تن دہی سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ میرؔ صاحب بھی ان سے مہربانی وشفقت سے پیش آرہے ہیں اسی شام سے میر انیسؔ کے کمرے میں نواب تہوّر جنگ، شریف العلماء اور دیگر اکابرینِ شہر و سخن فہم و سخن شناسوں کا جمگھٹا رہتا ہے، میں بھی شریف العلماء کی شفقتوں کے باعث میرؔ صاحب کو سلام کرکے ایک جگہ بیٹھ جاتا۔ میرے پردادا وزیر نواب نعمتی (خاندان گزری بہار) میرؔ نواب مونسؔ کے شاگردِ خاص تھے اور میرؔ صاحب اِس سے واقف تھے سو مجھ پر بھی عنایت کی نظر تھی دورانِ گفتگو شعر و سخن کی ہی باتیں ہوتیں، کسی کے اصرار پر میرؔ تقی کے دو اشعار سنائے۔

تیری گلی میں ہم نہ چلیں اور صبا چلے　　یونہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے
تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو　　رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

حقیقت ہے کہ جنابِ انیسؔ کا پڑھنا دلوں کے لیے مقناطیس ہے، آواز میں کیا سحر و شیرینی ہے۔ اپنے اشعار کم پڑھتے ہیں، میرؔ تقی میر یا فردوسیؔ کے کلام کے عاشق ہیں۔

ایک روز کہنے لگے۔''اس وقت لکھنؤ میں سو سے زیادہ مرثیہ گو ہیں اور بڑے بڑے لوگوں نے یہ شیوہ اختیار کرلیا ہے میں جو مرثیہ کہتا ہوں اُس کو خراب کرتے ہیں اور میرے محاورات کا سرقہ کرتے ہیں۔''

عمر ستّر سال کے لگ بھگ مگر ماشاءاللہ چاق و چوبند اور عشرہ پڑھنے کو مستعد۔ لیجیے آج انیسؔ صاحب کو آئے ہوئے دوسرا دن ہے اور خبر آئی کہ میرؔ صاحب سفر کی تھکان کے باعث شدید نزلہ، زکام اور تپ میں گرفتار ہوگئے ہیں۔ استخارے کے بعد ڈاکٹر مرزا علی کا علاج شروع کردیا گیا ہے۔

محرّم کے شروع ہونے میں چند دن باقی ہیں، تیاریاں مکمل ہیں، رقعے بٹ چکے، تشہیر ہو چکی اور یہاں انیسؔ نقاہت وتپ کا شکار ہیں، ہر ایک کے چہرے پر پریشانی واضطراب کے آثار ہیں۔

سندے خان نے مجھ سے کہا ''بابو صاحب، اب آپ کی تفصیلی ملاقات میرؔ صاحب سے عشرے کے بعد ہی ممکن ہوگی۔ ارے آپ کی ملاقات رہی ایک طرفِ خیر سے مجلسیں تو ہو جائیں۔

آج ۱۲۸۷ھ کے مُحرّم کی پہلی تاریخ ہے۔ چونکہ اعلان ہو چکا ہے اس لیے سرِشام نوّاب صاحب کی ڈیوڑھی کے باہر فینسوں اور بگھیوں کا ہجوم ہے، پانچ ہزار کا مجمع بعدِ نمازِ مغربین جمع ہو گیا ہے۔ اور گوش بر آوازِ انیسؔ ہے، یہاں یہ عالم کے میرؔ صاحب پر شدید نقاہت وکمزوری کے آثار ہیں، تپ چڑھی ہے نوّاب صاحب آئے اور فرمایا اگر طاقت وہمّت ہو تو مجلس میں شرکت فرمائیے، مجلس تیّار ہے۔ شاید مجلس کی برکت سے مرض میں تخفیف ہو۔

لیجیے میرؔ صاحب مجلس میں تشریف لے آئے میر محمد سلیسؔ ساتھ ساتھ ہیں۔

میرؔ صاحب ململ کا کرتہ، چوگوشیہ ٹوپی اور گھیر دار پائجامہ زیبِ تن کیے ہوئے ہیں خوبصورتی سے تراشی ہوئی مونچھیں، بہت قریب سے نظر آنے والی ریش اور ٹوپی سے باہر نکلتی ہوئی قدرے دراز زلفِ عنبر بو، انگ انگ سے نجابت، اعلیٰ نسبی اور علمیت پھوٹ رہی ہے۔ فرشِ عزا پر بیٹھتے ہی میر محمد سلیسؔ سے پڑھنے کو کہا وہ چند بند پیش خوانی کر کے منبر سے اُتر آئے۔ اُن کے پڑھنے میں کہیں بھی انیسؔ کی جھلک نہ تھی بلکہ نہایت معمولی خواندگی تھی، مجمع بے اثر رہا۔

اب میرؔ انیس خود زیبِ منبر ہوئے، گھٹنوں پر سفید رومال ڈالا اور یہ رباعی پڑھی۔

اللہ و رسولؐ حق کی امداد رہے　　سر سبز یہ شہرِ فیض بنیاد رہے
نوّاب ایسا رئیسِ اعظم ایسے　　یارب حیدر آباد آباد رہے

واہ واہ کیا آواز کی شیرینی، کیا آہنگ، کیا موسیقیت، وہ مصرع کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پڑھنے کا انداز مجمع بے خود ہو کر داد دینے لگا۔ اس کے بعد حضرتِ حُرؑ کے حال کا مرثیہ

بخدا فارسِ میدانِ تہوّر تھا حُرؑ

شروع کیا، ایک سماں بندھ گیا، چاروں طرف سے واہ واہ کا شور بلند ہوا لیکن کمزوری اور تکان کا اثر باقی تھا، تپ بدستور تھی چنانچہ چودہ بند پڑھ کر منبر سے اُتر آئے۔ مگر اس کے باوجود مجلس بھرپور ہوئی۔

اس کے بعد کی تاریخوں میں بھی میرؔ صاحب نے حسبِ وعدہ اسی تپ کے عالم میں مجلس پڑھنی جاری رکھیں۔ جب مجلس بھر جاتی تو میر انیسؔ کو اطلاع دی جاتی اور وہ اوپر سے اتر کر مجلس میں داخل ہوتے اور سیدھے منبر پر تشریف لے جاتے۔ عموماً دوسرے زینے پر بیٹھتے۔

ساتویں مُحرم تک انہوں نے بخار کی شدّت میں مرثیہ پڑھا، روزانہ پانچ سے سات ہزار سے کم کا مجمع نہ ہوتا تھا۔

نویں مُحرم تو وہ اژدھام کے سروں کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا اُس شب انھوں نے سید الشہداؑ کے حال کا مرثیہ پڑھا۔

جب خاتمہ بخیر ہوا فوجِ شاہؑ کا

آنکھوں سے متعلق بند۔

آنکھوں کو کہیے عین تو عینِ خطا ہے یہ

اور پھر ان دو ٹیپ پر۔

ع شبّیرؑ تو امامؑ ہے ابنِ امامؑ ہے　　گر غیظ آگیا تو یہ دنیا تمام ہے

ع زور اس سے آسماں کا بھی چلتا نہیں کبھی　　نقطہ ہے دائرے سے نکلتا نہیں کبھی

تو کُل مجمع گھٹنوں پر کھڑا ہو ہو کر داد دے رہا تھا۔

ایسا لگ رہا ہے پورا حیدرآباد انیسیؔ ہو گیا ہے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ گزشتہ سَو سال میں ایسی مجلسیں نہیں ہوئیں۔

خیر صاحب عشرۂ اولیٰ تمام ہوا اور میرؔ صاحب نے علالت کے باوجود حسبِ وعدہ پورا عشرہ پڑھا، کیا پڑھا اور کیسا پڑھا اس کا ضابطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ بس اتنا کہ ہر مجلس کے بعد امراء و روساء، دیگر حاضرین گویا ان کے قدموں میں لوٹتے نظر آتے تھے۔

معلوم ہوا کہ میرؔ صاحب کی طبیعت ابھی ناساز ہی ہے مگر وہ جلد لکھنؤ واپسی کے لیے کوشاں ہیں لیکن نوّاب تہور جنگ، شریف العلماء سید شریف حسین صاحب اور ڈاکٹر مرزا علی کے اصرار پر کچھ دن مزید قیام پر رضامند ہو گئے ہیں، شاید مُحرّم کے آخری ہفتے میں واپس تشریف لے جائیں۔

امام کے سوئم کے بعد جب کچھ لوگوں کا تانتا کم ہوا تو ہم نے حضرت شریف العلماء سے استدعا کی کہ میرؔ صاحب سے تفصیلی ملاقات کے وقت کا تعین کر دیں انہوں نے سندے خان کو پابند کیا کہ آج کل ہی میں جب مجمع چھٹے اور میرؔ صاحب کی طبیعت بحال ہو مجھے ملا دیا جائے۔

آج چودھویں مُحرّم ہے، میرؔ صاحب کی طبیعت قدرے بحال ہے، صبح ۱۰ بجے مجھے سندے خان نے یہ سندیسہ دیا کہ جائیے انیسؔ صاحب آپ کے منتظر ہیں۔ میں نے دروازے پر ہلکی سے دستک دی، کمرے میں داخل ہو گیا۔ سجا سجایا کمرہ بستر پر صاف و شفاف چادریں، اعلیٰ قسم کے تکیے وگاؤ تکیے، بستر کے ساتھ تپائی اور اس پر شفاف گلاس اور پانی کا جگ جس پر خوبصورت کام بنی پوشش سے ڈھکا ہوا، میر صاحب گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز ہیں۔ آداب و تسلیمات بجالایا مسکرا کر فرمایا۔ ''آؤ میاں سیّد زادے، آج کیا سوالات لائے ہو، کیا مرحلہ در پیش ہے؟''

میں نے عرض کیا ''جی۔۔۔ بس۔۔۔ وہ۔۔۔'' میرؔ صاحب کے شخصی رعب سے میں نے اپنے لہجے میں ہکلاہٹ محسوس کی، بہرکیف جلد اس پر قابو پا کر عرض کیا ''حضور گزشتہ گفتگو میں آپ نے تحت اللفظ خوانی کے حوالے سے کچھ ارشادات فرمائے تھے۔ یعنی قرآنی آیات، قصص القران، احادیث، تاریخِ اسلام اور واقعۂ کربلا سے واقفیت وغیرہ وغیرہ وہیں آپ نے علم العروض سے کماحقہ واقفیت کو بھی ضروری فرمایا تھا۔ وہ کیوں کر؟''

فرمایا ''اے لو میاں اگر عروض سے واقفیت نہ ہوگی تو کیوں کر مختلف بحروں میں امتیاز کر پاؤ گے۔ مصرعے کی غنائیت سے کیوں کر لطف

اندوز ہوگے جیسا کہ پہلے کہا تھا ہر بحر کا مزاج الگ ہے بعض بحریں رواں ہیں اور بعض سُست چنانچہ پڑھنے میں اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ خیر اس بات کو تو چھوڑو، دیگر شعراء اور اس فقیر کے بھی بعض بند ایسے ہیں جہاں عروض کی اصطلاحات صرف ہوئی ہیں۔

مثلاً مرزا صاحب کا یہ بند۔۔۔

میں نے عرض کیا قطع کلامی کی معذرت میری خواہش ہے کہ آپ اپنے ہی مرثیے سے مثال دیں (نجانے کیوں میرؔ صاحب بجائے اپنے دوسرے شعراء کے اشعار و بند کا زیادہ حوالہ دیتے ہیں شاید انتہائے منکسر المزاجی)

فرمایا، اچھا میرا یہ بند سنو تلوار کے حوالے سے۔

کاملؔ تھی زبس بحرؔ شجاعت میں وہ تلوار　　مثلِ الفِ وصلؔ گرے جاتے تھے کفّار
جو کوئی قریب آیا رجزؔ خواں دمِ پیکار　　سالمؔ تھا تو بے فاصلہؔ رکنؔ اس کے ہوئے چار
کیا لڑتے کہ سکتہ تھا ہر اک اہلِ حسد کو　　تقطیعؔ کیا تیغ نے ہر مصرعِؔ قد کو

اب دیکھو اس بند میں کاملؔ، بحرؔ، رجزؔ، سالمؔ، فاصلہؔ، رکنؔ، سکتہؔ، تقطیعؔ، مصرعؔ، عروض کی اصطلاحیں ہیں۔

یا میرا ہی یہ بند۔

تقطیعؔ مصرعِؔ قدِ اعدا میں تھی وہ فردؔ　　اور نظم چارؔ پارہ میں کاملؔ پئے نبرد
ناقصؔ کیا انہیں جنھیں مولیٰ کا تھا نہ درد　　تھے ضربتِ ثقیلؔ سے اس کی خفیف مردؔ
بحرؔ فنا زمیں پہ تو برق آسمان پر　　سیفیؔ کا سب عروضؔ تھا اس کی زبان پر

اب اس بند میں تقطیعؔ، مصرعؔ، فردؔ، نظمؔ چار پارہ، کاملؔ، ناقصؔ، ضربؔ، ثقیلؔ، خفیفؔ، بحرؔ، یہ سب عروض کی اصطلاحیں ہیں۔ دیکھو آخری مصرعے میں فنِ عروض پر معروف کتاب ''عروضِ سیفی'' کا ذکر ہے۔

اب اگر ان اصطلاحوں کو نہ جانو گو تو کیوں کر اس کا ابلاغ کر پاؤ گے

''سبحان اللہ، سبحان اللہ'' میری زبان سے بے ساختہ نکلا

میرؔ صاحب مسکرائے، تپائی سے گلاس اٹھایا چند گھونٹ پیے، نقاہت و کمزوری چہرے سے مُتشرح تھی میں نے سوال کرنے سے توقف کیا فرمانے لگے۔'' کچھ اور سوالات ہیں تو پوچھ لو، اب تو طبیعت لکھنؤ کی ہوا سے ہی بحال ہوگی'' ہائے لکھنؤ'' میرے ذہن میں ایک کیا بہت سے سوالات تھے۔'' مگر ایک اہم سوال تھا پوچھنے میں کچھ ہچکچاہٹ تھی۔ کہیں یہ سوال سوئے ادب نہ ہو، ہمّت کر کے پوچھ ہی لیا'' حضور اداکاری اور تحت اللفظ خوانی میں کیا فرق ہے؟'' کیا ان دونوں کا موازنہ کیا جا سکتا ہے؟

میرؔ صاحب نے ایک لمحے کو سوچا، ہم خوف زدہ ہو گئے، چہرے پر ناگواری کے آثار ڈھونڈنے لگے، مگر میرؔ صاحب نے بڑی شگفتگی سے یوں ابتدا کی۔

''میاں سچ پوچھو تو مرثیہ خوانی کا فن، اداکاری کا انتہائے کمال ہے۔ اداکار کو اصل کو نقل دکھانے کے لیے ساز و سامان کا محتاج ہونا پڑتا ہے، ہر کردار کے لیے اُسے مناسب پوشاک، روپ، مقام اور دوسرے لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے، اداکار گویا شکل و صورت، لباس، وضع

قطع اور اپنے گردوپیش کی چیزوں میں بالکل ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا وہ شخص جس کا کردار اُسے ادا کرنا ہے، اس کے علاوہ اپنی چال ڈھال، بول چال، لب ولہجہ میں اس کی پوری نقل اتارتا ہے۔ مگر مرثیہ خواں کا کمال دیکھو کہ ایک شخص اپنے معمول کے کپڑے اور اصلی صورت میں آتا ہے اور صرف لہجے کی تبدیلی آواز کے زیر و بم، چہرے کے تغیر، جسم اور اعضا کی معمولی سی جنبش آنکھوں کی خفیف سی گردش سے ہر صنف، ہر عمر، ہر حیثیت، ہر استعداد ہر ذہنی کیفیت رکھنے والے انسان کی تصویر پیش کرتا ہے۔

اداکاری اور مرثیہ خوانی میں خاص فرق یہ ہے کہ اداکار خود کسی دوسرے شخص کی تصویر بن جاتا ہے وہ اپنی ہستی کو اس شخص کی ہستی میں بتدیل بلکہ محو کر دیتا ہے لیکن مرثیہ خواں کسی دوسرے شخص کی تصویر کو بھی پیش کرتا ہے اور اپنی ہستی کو بھی قائم رکھتا ہے، یہ بڑی نازک بات ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ مرثیہ خواں اگر کسی عورت کے خیالات وجذبات اس کی زبان سے ادا کرنا چاہے اور اس غرض سے آواز ولہجہ بالکل زنانہ اختیار کرے اور اعضا کی حرکتوں میں عورتوں کی نقل کرے تو اس کا یہ فعل اُس کی مردانہ صورت اور مردانہ لباس کے ساتھ مضحکہ خیز ہو جائے گا۔ مگر مرثیہ خواں ایسا لب ولہجہ اور ایسی حرکات اختیار کرتا ہے کہ اہلِ مجلس کی آنکھیں مرثیہ خواں کی صورت دیکھتی ہیں اور کان اُس کے الفاظ سنتے ہیں لیکن اُس کا ذہن کسی دوسری ہستی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ عالم تصوّر میں اس عورت کی آواز سنتا ہے۔ اُس کی حالت دیکھتا ہے جس کے خیالات وجذبات مرثیہ اُس کی زبان سے ادا کرنا چاہتا ہے۔ گویا اہلِ مجلس ایک ہی وقت میں دو صورتیں دیکھتے ہیں اور دو آوازیں سنتے ہیں ایک مرثیہ خواں کی اور ایک اُس ہستی کی جس کا ذکر مرثیہ خواں کر رہا ہے۔

''واہ واہ حضور۔'' میں نے کہا۔ پھر وہی دلنشین مسکراہٹ چہرے پر نمودار ہوئی ''حضور کہا جاتا ہے کہ گو آپ سے قبل بھی منبر سے مرثیہ خوانی تحت اللفظ رائج تھی مگر آپ نے اس کو باقاعدہ ایک فن کی شکل دی۔ کیا فرماتے ہیں آپ؟

''ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ لوگ یہی کہتے ہیں، صحیح کہتے ہیں۔''

سوالات تو ذہن میں بہت سے تھے مگر انیسؔ کی طبیعت کے پیش نظر اگلی نشست تک کے لیے اجازت چاہی۔ آداب و بندگی بجالایا دعائیں لیں اور الٹے قدموں ان کی فرودگاہ سے باہر آیا۔''

یک بیک چھناکے دار دھماکہ ہوا میری تصوّر میں بند آنکھیں کھل گئیں۔ بیڈ سائڈ پر رکھا ہوا گلاس گر گیا۔

حوالہ جات: انیسیات، پروفیسر مسعود ادیب رضوی، میر انیسؔ حیدر آباد میں، ڈاکٹر رشید موسوی۔

رباعی

وزن اخرب/اخرم

سورج کی چمک دہر میں مدّھم کردے　　شیرازۂ ہستی کوئی برہم کردے
رہتی دنیا تلک نہیں ہو سکتا　　رتبہ کوئی انیسؔ کا کم کردے

قیصر عباس قیصرؔ

میر انیسؔ کے کمالاتِ ہنر

ڈاکٹر اسد اریب

اصغر مہدی اشعر، زندہ شوئے پائندہ تر!

اے میرے زمرۂ محبت کے قابل قدر رکن میرا سلام قبول ہو۔ میں فی الحال لکھنے سے معذرت طلبی کر رہا ہوں، خواہاں ہوں کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے کہ صرف بولنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔ سنیے اور غور سے سنیے، میرا خیال ہے کہ اردو کی سلطنتِ زبان و بیان میں اگر کسی شخص کو بادشاہی اور حکمرانی مطلق کا اختیار حاصل ہے وہ میر انیس ہیں، میر انیسؔ کی شاعرانہ فطرت اور اُن کی ہنرمندی کا جمال و کمال اہلِ نظر کے اُس وقت ہاتھ آئے گا جب تعصب کی کدورت اُن کی نگاہوں سے دُور ہو جائے گی بلا قیدِ عقائد و مذاہب بے تمیزِ افکار و رجحانات صرف اور صرف لوگ کمالِ ہنر کے اعتبار سے میر انیسؔ کو دیکھیں گے تو اُنھیں اندازہ ہوگا کہ شاعر نے ادب میں ایک نئی تمیز پیدا کی ہے اور جسے ہم امتیازِ ممیّزہ کہہ سکتے ہیں۔

وہ آپ کو اِس کے یہاں نظر آئے گی ان میں سے سرِ دست چند ایک کا بیان کرتا ہوں یہ کہ وہ رودادِ گم کے نظم نگار تھے وہ مرثیہ گو تھے وہ بین اور بُکا کو بھی ماحصل جانتے تھے مجلس کا انھوں نے اپنے زمانے کے تمام شاعروں سے خاص طور سے جو معاصر اہلِ قلم تھے اُن سے سب سے ہی اپنی مسابقت کو آگے دکھایا ہے میں مانتا ہوں، لیکن جب میں جدید ادب کا مطالعہ کرتا ہوں اور مجھ سے بھی زیادہ مطالعہ کرنے والے ہیں جانتے ہیں کہ شاعری میں بڑائی موضوعات کی نہیں ہوتی ہے شاعری میں بڑائی شاعری کی بڑائی شاعری کی رفعت شاعری کی بالیدگی سب لائن، شاعری کا وقار اظہار میں ہے حسنِ بیان میں ہے شاعری کے اسالیب میں ہے شاعری کا پہلا کمال اگر شاعری موضوعات کے اعتبار سے رفعت پاتی خیالات کے اعتبار سے تو وہ تو ایک تبلیغی نظام کا ورق بن جاتی، شاعری نہ رہتی اُس میں ہاں ایک خیال ضرور آتا ہے جو سر بلند ہو کر اپنا چہرہ دکھاتا ہے میں مانتا ہوں میر انیسؔ کے ہاں ایک نئی بات جو آج تک اُن کے نقادوں نے نوٹ نہیں کی میں بہت دعوے سے کہہ رہا ہوں یہ کہ میر انیسؔ نے مرثیے کی طوالت کو اُردو شاعری کے ایک ایسے نئے رنگ ڈھنگ سے آشنا کیا جس سے اردو شاعری بالکل بے خبر تھی وہ رنگ یہ تھا کہ مرثیے کو جہاں کربلا کے پیغام افروز مضامین سے آراستہ کیا اور کربلا کے کرداروں کو ابھارا اہلِ بیتؑ کی شہامت صداقت اور بلند افکار کو دنیا تک پہنچایا وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے لیکن شاعری کی اور تشکیلِ شعر کی اور تنظیمِ خیالات کی بڑی جہت میر انیسؔ نے قائم کر دی جس کا امتیاز یہ ہے جس کی طرف اب میں اشارہ کر رہا ہوں کہ اردو شاعری میں بے شک حزنیہ مضامین تھے عہدِ قطب شاہی سے لے کر اور میر انیسؔ تک اٹھارویں صدی تک انیسویں صدی تک یہ مضامین موجود تھے حزنیہ لیکن حزنیہ مضامین کو ایک ترتیب سے ایسی ترتیب سے بیان کرنا جو خوش رنگ ہو خوشنما ہو خوش شکل ہو اور اپنی خوش بیانی سے لوگوں کے ذہنوں میں اُتر جائے یعنی اُس میں مکالمے کو داخل کیا میر انیسؔ نے اپنی

نظم میں مرثیے کو اُردو کی ایک ایسی نظم بنا دیا جس میں مکالمے کو ایک نئی شان دی ڈائیلوگ مکالمہ مخاطبہ کردار سازی اور تشکیلِ سیرت کے مختلف مظاہر میں کام آنے والے اجزائے فطرت ان سب سے میر انیسؔ نے فائدہ اٹھایا اور ایک بڑا جو میر انیسؔ کا تنقیدی کارنامہ ہے وہ یہ ہے کہ نظمِ اُردو کو جو صرف رثا کہلاتی تھی مرثیہ کہلاتا تھا اُسے جدید نظم کی ایک انوکھی صورت دی بالکل نئی صورت دی اور وہ نئی صورت یہ تھی کہ سب سے پہلے بیانیے کو سمیٹا، بیانیے کا سمیٹنا یعنی اُس کو ارتکاز کی طرف لانا اجتماعیت سے ہٹا کر پہلے اُس کا ایک نکتہ خیال قائم کرنا بات کرنے سے پہلے اُس کا ایک تھیسس ظاہر کر دینا خیال ظاہر کر دینا یعنی سمیٹ لینا خیال کو ایک جگہ، بہت مشکل کام تھا اسے ہم ارتکازِ فکر کہتے ہیں میر انیسؔ نے مرکزِ فکر کے ساتھ مرثیہ لکھا جو اردو کی جدید نظم کی شاندار صورت ہے دیکھیے اس خیال کی مرکزیت کو کیسے سمیٹا انھوں نے، سب سے پہلا شاعر ہے جس نے مرثیے کے تمام تر تقاضوں کے باوجود نئی نسل کے تجربات کا بھی ساتھ ساتھ خیال رکھا اور ایک تجربہ یہ کیا کہ زمانے کو وقت کو اور لمحوں کو ایک خاص لفظ کے ذریعے سمیٹا پہلے مرکزِ خیال کے طور پر اور سامع کو ٹھہرایا لمحے میں جگہے میں اور منزل میں اور اس کے لیے لفظ استعمال کیے جب، جب کا لفظ اُس ارتکازِ خیال کے لیے استعمال کیا کہ لمحوں کی قید سے جب آشنائی پیدا ہو جائے گی یعنی جب لمحوں میں جمع ہو جائیں گے خیال تب یہ سفر اندر اس کے باطن میں ایک مسافتِ نو کی طرف لے جائے گا خیال کی یعنی خیال تازہ تر ہو کر اُن داخلوں کے ذریعے اُن دروازوں کے ذریعے منزلِ نتائج کی طرف جا پہنچے گا دیکھیے۔

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

یہ محلِ نظر جب کا نہیں ہے لیکن کمال ہے میر انیسؔ کا کہ اس پورے خیال کو طاقت دینے کے لیے انھوں نے لفظِ جب کے ذریعے متوجہ کیا ہے اور سمیٹا ہے خیالوں کو اور ایک لمحے میں لا کر ذہنوں کو مقید کیا ہے تا کہ کہانی سنا سکیں مسافتِ شب کی، صبحِ کربلا کی، شامِ کربلا کی، جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے، یہی کیفیت اُن کے تمام معرکہ آرا مرثیوں میں ہے

''جب قیدیوں کو خانۂ زنداں میں شب ہوئی''

یہ جب کا لفظ میر انیسؔ نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ اپنے کوئی اڑتیس مرثیوں میں استعمال کیا ہے مطلعے میں اور مختلف جگہوں پر بیانیے کے طور پر اور اُس کیفیت کے اظہار کے لیے ہے کہ جس کی طرف میں لے جانا چاہتا ہوں کہ میر انیسؔ کے مرثیوں کا ایک شاندار اسلوب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مرثیے کو اردو کی جدید نظم سے ہم آہنگ کر دیا اور پہلے اُس کا کوئی آہنگ تھا ہی نہیں میر انیسؔ سے پہلے یہ ہم آہنگی میں اپنی سہولت کے لیے استعمال کر رہا ہوں انھوں نے ایک رنگ دیا تا کہ دوسرے لوگ اس سے ہم آہنگ ہو سکیں گویا وقت کی قید سے خیال کو سمیٹ کر اندر لا کر سامع کو بٹھا کر مجلس میں ایک مقام دے کر ایک دالان میں جمع کر کے ایک ایوان میں اکٹھا کر کے ذہن کو پھر کہانی سُنانا

''دیکھا جو سفیدی کو سحر کی شہِ دیں نے''

اب یہاں جو کے لفظ سے یہ ارتکازِ خیال کیا ہے، یعنی اُس لمحے کو قید کر دیا ہے جو آگے جا کے تفصیل میں آئے گا اِس مرثیے کی،

''لہو سے لال جو رن میں علیؑ کا لعل ہوا''

اب یہ جو کا تصور یہ صرف حرفِ جو نہیں ہے حرفِ رابطہ نہیں ہے یہ صرف حرفِ بیان نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا لفظ ہے جو اُس کیفیت کو ظاہر

کرتا ہے جو آگے چل کر پوری کہانی کی اساس کو آگے بڑھاتا ہے اس بنیاد پر یہ محلِ بیان تعمیر ہوگا جس کی طرف شاعر لے جانا چاہتا ہے

''کعبے سے کیا جبکہ سفر قبلۂ دیں نے''

یہاں بھی جب کا لفظ انہی معنوں میں سمیٹ کر استعمال کیا ہے کہ سننے والا پہلے ٹھہرے اور اس منزل پر پہنچے جہاں اس مرثیے کا ہیرو سفر کرنے کے لیے اپنے لاؤلشکر کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور تمام اعزا و انصار آگے بڑھنے کے لیے تیار ہیں گھوڑے کھڑے ہیں خیمے لگ گئے ہیں یا طنابیں کھینچ لی گئی ہیں یہ سب کیفیت ہے۔

''جب منزلِ مقصد پہ امامِ زمن آئے''

وہاں یہاں سے چلنے کی کیفیت ''کعبے سے کیا جبکہ سفر قبلۂ دیں نے'' اور وہاں پہنچ کر ''جب منزلِ مقصد پہ امامِ زمن آئے'' میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ حروفِ بیانیہ جن میں لمحوں کو قید کیا جاتا تھا جب اُن میں سے ایک نمایاں تر حرفِ مقیدہ ہے یعنی کسی بھی طویل تر مرثیے کی جلالت کے لیے کسی بڑی کہانی کہنے کے لیے سب سے پہلے لازم تھا کہ توجہ دلائی جائے وقت کی، اور وقت کے ایک خاص مرکز کی اور مرکز کے ایک خاص نکتہ ماسقہ کی جہاں ٹھہرایا جائے،

''طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح''

یہ وہی کیفیت جو میں ہے

''جب طے کیا شہؑ نے سفرِ راہِ خدا کو''

اِسی طرح

''جب زلف کو کھولے ہوئے لیلیِٰ شب آئی''

یہ پہلے مصرعے جو مجھے یاد آرہے ہیں مرثیوں کے

'' مسجد میں قتل جب شہِؑ خیبر شکن ہوئے''

یہ تمام لمحوں کو آنے والے واقعات کے لمحوں کو ایک حرف کے ذریعے ایک جگہ ٹھہرا کر کہانی کہنے کے لیے اُس مقام کو مرکزِ خیال قرار دیا،

''جب طوق و سلاسل میں مسلسل ہوئے عابدؑ''

کیا کیفیت ہے دیکھیے، غور کیجیے، جب طوق و سلاسل میں مسلسل ہوئے عابدؑ وہ کیفیت جو کربلا سے کوفے اور کوفے سے شام کی طرف سفر کی ہے اُس کو بیان کرنے کے لیے ایک پہلے تیر اندازی کی ضرورت تھی

''کمان کھولی ہے شہ سوارِ قلم نے''

اور بیان کے ہنرمند نے اپنے ترکش کا منھ کھولا ہے اور کہا ہے کہ ٹھہرو اس لمحے میں میرے ساتھ چلو اور دیکھو یہ وہ لمحہ ہے جب طوق و سلاسل میں مسلسل ہوئے عابدؑ، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ جب جو جبکہ جہاں جیسے مختلف چیزیں میر انیسؔ نے اپنے ہاں استعمال کی ہیں اس میں نظم کو ایک اور آہنگ بھی دیا ہے وہ یہ ہے کہ اردو شاعری میں بظاہر تو یوں لگتا ہے کہ مرثیہ، مرثیہ صرف بین و بُکا ہوگا نہیں، بین و بُکا سے آگے بڑھ کر خیال کے حسن کی اور بیان کے جمال کی اور اسلوب کی شائستگی کی ایسی نادر مثالیں اِس نظمِ مرثیہ میں ملتی ہیں میں اِسے مرثیے سے زیادہ

نظمِ اُردو کہہ رہا ہوں جو اُردو کے لیے ایک بڑا فضل ہے، اُردو کے لیے ایک بڑا فضل ہے اس میں کیا کیا لطافتیں پیدا کی ہیں میر انیسؔ نے اپنے رثائی سخن کے ناطے سے، سنیے، اُردو شاعری میں لہجے، مخاطبے اور بیانیہ، حرفِ بیان لو، لے، لا، او، اے، ہاں، ہو۔ یہ اس طرح کے حرفِ مخاطبہ یا حرفِ تاکید جو بھی نام دیجیے اُردو شاعری میں اپنا مزا نہیں دے سکتے تھے میر انیسؔ نے ذائقے کی طشتری میں رکھ دیا ہے ان حروف کو یہ پہلو میر انیسؔ کی تلاش کا ایک نیا پہلو ہے، لے، یہ ہمارے ہاں بہت سے معنوں میں لے آتا ہے، لے بھائی میں تو چلا، لے میاں یہی میری بساط تھی، لے دے کے بس میرے پاس جو کچھ تھا وہ میں نے دے دیا۔ مگر میر انیسؔ نے اُردو کے ایک نازک پہلو کو اِس حرف کے میں حرف بھی کہوں گا لفظ بھی کہوں گا اِس حرف کے ایک نازک پہلو کو بھی اُجاگر کیا اور یہ مرثیے کے حسن کا ایک بہت بڑا جلوہ نما ہے وہ کیا ہے اردو شاعری میں نہیں اردو محاورے میں اردو روزمرہ میں اردو بیانیہ میں اردو عامہ سخن میں اردو کی نثر میں اردو کے لب و لہجے میں یہ لفظ ایک خاص معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے ایک خاص جگہ بھی استعمال ہوتا ہے اور وہ خاص جگہ اور معنی یہ ہیں جہاں ہم طعنہ دیتے ہوں جہاں ہم بوجھ ڈالتے ہوں بار ڈالتے ہوں اور کسی بات کی کہی ہوئی کی نفی کرتے ہوں یا اُلٹ کر اُس کی طرف لے جانا چاہتے ہوں جس نے یہ بات ہماری طرف کی ہے تو کہتے ہیں، لے اب دیکھ لے، لے اب پتہ چلے گا تجھے، یہ ایک نئی کیفیت تھی میر انیسؔ نے اس حسن سے اس کی گرفت کی ہے، حرؑ عمرِ سعد سے کہتا ہے ''ہاں'' یہ ہاں کے لفظ کی طرف بھی نظر رکھیے ہاں بھی انہی حروف میں سے ہے جس میں تاکید کے ساتھ لمحے اور لمحے کے ساتھ کیفیت اور کیفیت کے ساتھ خاص تناظر کو جذبات کے جو ظاہر کرتا ہو حرف۔

ہاں سوئے ابنِ شہنشاہِؑ عرب جاتا ہوں　　لے ستمگر جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں !

یہ اب کے ساتھ اُس پر تازیانہ لگایا ہے لے کا، لے ستمگر جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں، ہاں سوئے ابنِ شہنشاہِؑ عرب جاتا ہوں۔ اور ایک وہ مقام بھی ذہن میں رکھیے گا۔ لیکن اپنے انداز سے وہاں لے بہت ہلکے پھلکے انداز سے لیکن اپنے حُسن کے ساتھ آیا ہے وہ بھی سنیے کہ

نام کوثر کا نہ لے تُو مجھے جوش آتا ہے　　انہی چھینٹوں سے تو بیہوش کو ہوش آتا ہے

یہ جو تصوراتِ حروف ہیں اور جو معنویت ہے اُن میں سے ایک لفظ او بھی ہے ''او'' اُردو میں اے کے مخاطبے میں استعمال ہوتا ہے اور زیادہ تنفر آتا ہے اس میں، اے کی نسبت او میں نفرت کا پہلو زیادہ ہے

عملِ خیر سے بہکا نہ مجھے او ابلیس!

یہ عمرِ سعد سے کہہ رہا ہے حرؑ، ہے بھی اُنہی میں آتا ہے

اسفلوں سے ہے محبت تجھے اے سفلہ مزاج!

یہ تمام چیزیں ان حروف کی طاقت کا اندازہ اس طور پر جب ہوسکتا ہے کسی شخص کو جب وہ زبان کے ذائقے کے نثری لہجے سے آشنا ہو میر انیسؔ نے اپنی نظم میں، میں معاف کیجیے معاف کیجیے معاف کیجیے میں بار بار نظم کہہ رہا ہوں میں مرثیے کو اُردو کی نظمِ جدید میں سرِ فہرست رکھتا ہوں کمال کر دکھایا ہے اِس میں حروف کی طاقت اور لفظ اور لہجے میں استعمال ہونے والے صوتیوں کی قوتِ مدرکہ، قوتِ استنباط، قوتِ استخراج اور قوتِ قوّیہ جو جوان میں موجود ہے ان کے اظہار میں میر انیسؔ نے اپنا تمام حسن بیان صرف کر دیا دیکھئے یہ بالکل نئی بات نہیں ہے لیکن وزن

ضرور رکھتی ہے نئی نہیں ہے پرانی ہی صحیح لیکن وزن ضرور رکھتی ہے بار بار کہنے کا اُن میں سے یہ بھی ہے جس کا میں یہ زکر کر رہا ہوں۔ لطافتِ خیال جسے آپ نازک خیالی کہتے ہیں جس میں احساسات کی بڑی باریک تہیں اور ایسی جھلیاں ہوتی ہیں جیسی ہماری رگوں میں ہیں بہت ہی نازک اور بہت ہی چھدری چھدری انھیں کوئی چھو نہیں سکتا ذرا سی چھوئیں اگر ان کی رگ وریشے کو تو پگھل جائیں گھل جائیں اتنی نازک تہیں ہیں احساسات کی میر انیسؔ نے خیالات کی اس طاقت آزمائی میں ایسی لطافت کا اظہار کر دیا ہے کہ حیرانی سی حیرانی ہوتی ہے اگر عصبیت نہ رکھتے ہوں اہلِ قلم تو وہ جانیں گے کہ اردو کہ نازک خیالی کا حسن شاعری کی جو جان ہے میر انیسؔ کی قوتِ قلم کا شاہکار ہے دیکھئے جنابِ عونؑ و محمدؑ کے گھوڑوں کی تیز رفتاری، بھئی تیز رفتاری بہت تیز رفتار تھے بڑے بگ ٹٹ دوڑ رہے تھے تیز رفتار، بہت طاقت تھی ان کے دوڑنے سے زمین ہل جاتی تھی تیز رفتار تھے کوئی انھیں دیکھے تو نگاہوں سے اوجھل ہوئے جاتے تھے بڑی بڑی تمثیلیں ہیں لیکن یہ لطافتِ خیال بھی دیکھیے، احساس کی اِس باریک تہہ کو کون اُٹھائے گا کون گنے گا اور کون کسی تہہ پر ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھ سکے گا بیان کو فرماتے ہیں تیزی کو جنابِ عونؑ و محمدؑ کے گھوڑوں کی تیزی کو تیزیِ رفتار کو

وہ سبک رو ہیں کہ غنچوں پہ جو رکھ دیں یہ قدم

واہ واہ واہ غنچوں پر قدم رکھنا، سبک روی کی کیا تعریف کی ہے

وہ سبک رو ہیں کہ غنچوں پہ جو رکھ دیں یہ قدم　　کھلتی کلیوں کہ تبسم نہ زیادہ ہو نہ کم

کیا کہنے! کلیوں پر کھلتی کلیوں پر قدم آجائیں گے اتنی تیزی سے لطافتِ خیال دیکھیے سبک روی کی تعریف اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی کہ وہ اُس کے اوپر قدم بھی رکھیں گذر بھی جائیں بوجھ بھی پڑے اور وہ کلیاں اپنی جس حالت پر ہیں اُسی حالت میں رہیں۔

ایک اور جگہ اس خیال کو ظاہر کیا

وہ سبک رو ہیں کریں صید جو آہو بھاگیں

بھئی بہت خوب میرؔ صاحب میں آپ پر قربان

وہ سبک رو ہیں کریں صید جو آہو بھاگیں　　سوتی آنکھوں میں جو دوڑیں تو نہ مردم جاگیں

دیدے کے اوپر سے گذر جائیں تب وہ دیدہ سویدہ اپنی جگہ سے اِدھر سے اُدھر نہ ہلے اور وہ گذر جائیں، کیا سبک روی ہے، یہ خیالات تھے نازک خیالی جسے کہتے ہیں احساسات کی لطافت جسے کہتے ہیں، اس میں میر انیسؔ نے جگہ جگہ اس بات کا بھی التزام رکھا ہے کہ جو لکھنؤ کی زبان کا جو حسن ہے وہ پامال نہ ہوجائے اس تجربے میں اس تجرید میں اس نقشہ گری میں لکھنؤ کا کمال ضائع نہ ہوجائے بیانِ حسن کا، میں نے حسنِ بیان نہیں کہا بیانِ حسن کہا ہے یعنی حسن کا جب بیان کریں وہ تو وہ نزاکت بیانِ لکھنؤ کی باقی رہے۔

دیکھیے ایک جگہ کہتے ہیں مکالمہ ہوتا ہے عمرِ سعد کا؛

نفع اُس امر میں کیا جس میں ہو مردم کا ضرر

اب یہ آدم ہی سے مراد ہے مگر لکھنؤ کی سلطنت کا زبان کی سلطنت کا بادشاہ یہ بات کر رہا ہے، یہاں مراد آگے چل کر آنکھوں کی نسبت

سے اپنی قربت قائم کرے گا نفع اس امر میں کیا جس میں ہو مردم کا ضرر؛

ممکن ہے میر صاحب نے نفع اُس امر کا کہا ہو، میں اجازت مانگ کر اِس پڑھ رہا ہوں:

نفع اِس امر میں کیا جس میں ہو مردم کا ضرر　　آنکھیں نکلیں گی محبت سے جو دیکھے گا اُدھر

عمرِ سعد حرؑ سے کہتا ہے کہ حسینؑ کی طرف نہ جانا؛

آنکھیں نکلیں گی محبت سے جو دیکھے گا اُدھر　　شجرِ قامتِ سرورؑ پہ جو ڈالے گا نظر

سر چڑھے گا ترا برچھی پہ یہ ہے اس کا ثمر

خالِ رُخ دیکھا تو گھر خال سے لگ جائے گا　　سچ میں کہتا ہوں رتبہ ترا گھٹ جائے گا

بظاہر تو آپ رعایتِ لفظی سمجھ لیں اسے لیکن یہ اپنے حسنِ بیان میں اتنی نسبتیں قائم کرتی ہیں باہم خیال کی کہ شعر، خیال، بند، مقطع، مصرعہ، جو جو بھی منزلیں کمالاتِ سخن کی ہیں وہ اپنی تاثیر کو ضائع نہیں ہونے دیتی ان مقامات پر جب کہ رعایتِ لفظی ضائع کر دیتی ہے اس طرح کے مصنوعی التزام سے مگر میر انیسؔ نے اس التزام کو حسن کے لیے استعمال کیا ہے معنویت کے لیے

خالِ رُخ دیکھا تو گھر خال سے لگ جائے گا۔

بندگانِ ادب میں آپ سے مخاطب ہوں اور آپ میرا مخاطب ہیں، سنیے گا۔

خالِ رُخ دیکھا تو گھر خال سے لگ جائے گا

میر انیسؔ بھی صاحب بہت بڑا صاحبِ کمال انسان تھا کہنے میں اور لکھنے میں یہ لفظ اپنی طرح طرح کی لہریں چھوڑ رہا ہے نئے نئے رنگ کی پھوار دکھا رہا ہے خالِ رُخ دیکھا تو گھر خال سے لگ جائے گا۔ خال سے، حرفِ نسبت ہے سے حرفِ نسبت ہے خال، یعنی تِل خال مسّہ، خال پدم، خال جو چہرے کے حسن کی علامت ہے اُس کی طرف اشارہ ہے کہ اُس کے ساتھ وابستہ ہوا تو اُس کے ساتھ ہی رہ پڑے گا مر جائے گا اُس کے ساتھ لگ کر تُو یہ معنی خال سے لگ جائے گا لیکن جب یہ نول کشور یا نظامی پریس بدایوں سے چھپ کر آئے گا تو یہ لکھا ہوگا خالصے لگ جائے ''ص، ے، سے کے ساتھ'' خ زبر الف خا، لام ساکن خال، ص زیر بڑی ے سے خالصے ، یہ ایک لفظ جو ہمارے سکھ بھائی استعمال کرتے ہیں خالصہ یہ اُس طرح کی ایک عبارت ہے خالصے بڑی ''ے'' ساتھ بہت دلچسپ لفظ ہے، خالِ رُخ دیکھا تو گھر خال سے لگ جائے گا۔ کیا معنی کا دریا بہا دیا ہے یہ وہ خال سے حرفِ نسبت س بڑی ے سے نہیں رہا جب یہ چھپ کر آیا تو معلوم ہوا خالصے لگ جانا عہدِ اکبری کی مالیات کی اصطلاح ہے، یہ خالصے کی زمین خالصے لگ جانا خالصے میں آجانا اُس زمین کو کہتے ہیں جو بحق سرکار ضبط کر لی جاتی ہے میر انیسؔ نے اِس لفظ کا فائدہ اُٹھا کر کہا ہے کہ تیری جائیداد ضبط ہو جائے گی اور تیرا گھر بحق سرکار ضبط کر لیا جائے گا۔ خالِ رُخ دیکھا تو گھر خالصے لگ جائے گا۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میر انیسؔ کے کمالاتِ ہنر میں لفظ کی جو سائنسی شناخت ہے میں اِسے سائنسی شناخت اِس لیے کہہ رہا ہوں کہ اُردو کے شاعروں نے ہنرمندی کے ساتھ اپنی ورک شاپ نہیں قائم کی ہے کوئی یعنی انھوں نے روایتی اسلحہ استعمال کیا ہے اُردو کے شعرا نے جو

میرے قابلِ قدر امام ہیں ادب کے میرے ادب کے نظامت و امامت کرتے ہیں میرے ادب کی انھوں نے اپنے تمام الفاظ ورک شاپ سے جو پہلے قائم ہو چکی تھی صنعت گاہِ الفاظ صنعت گرانِ ہنر کی جو کاری گری کا مرکز تھا وہاں سے لے کر لفظ استعمال کیے اصطلاحیں، تلمیحات، میر انیسؔ وہ پہلا شاعر ہے جس نے اپنی ورک شاپ اپنی صنعت گاہ اپنا کارِ ہنر خود قائم کیا ہے لفظوں کا اور یہ بات میر انیسؔ کے کمالاتِ ہنر کی اس قدر قابلِ قدر ہے کہ نئے نقادوں کو میں نئے نقادِ ان معنوں میں کہتا ہوں کہ وہ کہ لفظ اچھے نہیں ہیں تو میر انیسؔ نے زمانہ کوئی اور تھا خیالات کسی اور زمانے کے لکھے ہیں وہ عرب کا معاشرہ تھا، ہندوستانی معاشرت لکھ دی ہے، بھائی یہ سب بجا ہے پُرانی تنقیدیں ہیں اِن کا جواب دیا جا چکا ہے۔

نئے نقادوں کو جو خیالات کی سب سے بڑی جہت یہ تلاش کرتے ہیں کہ کس شاعر اور کس ادیب نے کس نثر نگار اور کس ناول نویس نے کس فکر انگیز شخص نے افکار میں ندرت پیدا کی ہے اور اُس ندرت کی تاثیر کہاں تک اپنی منزل پا سکی ہے۔ یہ ہے تنقیدی معیار اور کس طرح اس کا ہنر اس کا کارِ ہنر ایک اضافہ ہے اضافت ہے ہنر کی اس ذیل کے ہنر کی اس ضمن کی اور اس سلسلۂ خیال کی جو اُس سے پہلے چل رہا تھا اُس نے اُس میں کہاں کہاں کیا کیا جدتیں کی ہیں میر انیسؔ اُردو شاعری کا وہ شاعر ہے وہ ہنر مند با کمال شخص ہے کہ آج تک کوئی اُس کے حُسنِ بیان ندرتِ اظہار احتیاطِ خیال اور تنظیمِ خیال کی نئی سرشت اور نئی بیانہ طاقت کی فراہمی اُس سے بڑھ کر کوئی نہیں کر سکا۔ اُس کے لفظ اپنے زمانے کے لفظ ہیں ہمارے کچھ اِس عہد کے لوگ پتہ نہیں کیا کہہ رہے ہیں خود اُنھیں پتہ نہیں ہر شاعر اپنے زمانے کے لفظ استعمال کرتا ہے، ہر شاعر کا دستاویزی نظام وہی ہے وہ جو دفترِ خیال جہاں سے اُٹھا کے لایا ہے لفظ وہیں سے لیتا ہے لیکن اُن کو نئی معنویت دیتا ہے اور اُن کی تنظیم نئی طرح کرتا ہے تشکیل نئی طرح کرتا ہے میر انیسؔ اسی تشکیلِ نو کا شاعر ہے میں اتنا ہی جانتا ہوں میر انیسؔ کے بارے میں اِس وقت تک جو میں نے کہہ دیا اور اصغر مہدی اشعر آپ نے سُن لیا بے حد مہربانی خدا حافظ۔

❁❁❁❁

اشاریۂ دبیرؔ
زیرِ طبع
ترتیب و تدوین
اصغر مہدی اشعر

ابرؔ جون پوری
کے مرثیے
زیرِ طبع
ترتیب و تدوین
اصغر مہدی اشعر

فرہنگِ مونسؔ
زیرِ طبع
ترتیب و تدوین
اصغر مہدی اشعر

صنفِ مرثیہ اور کردار نگاری بحوالہ مراثیِ انیسؔ

پروفیسر زمان آزردہ

اردو شعراء نے صنفِ مرثیہ کی ایسی آبیاری کی، کہ یہ صنف ممتاز حیثیت اختیار کر گئی۔ میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارے بزرگ شعراء نے اس کو اس قدر آراستہ و پیراستہ کیا، کہ بیانیہ کی کوئی خوبی ایسی نہیں تھی، جس سے اس صنف کو مالا مال نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ کی صنف میں تمام اصنافِ سخن کی جھلک مل جاتی ہے۔ غزل کی جذباتیت سے لے کر قصیدے کے شکوہ تک مرثیہ کی صنف میں ہر کیفیت اپنا بہار دکھاتی ہے۔ کوئی بھی قاری جب ابتداء میں شاعری سے جُڑ جاتا ہے تو اس کی بنیاد جذبات پر ہوتی ہے اور یہ آگ دونوں طرف سے لگی ہوتی ہے۔ شاعر نے کس طرح جذبات کی عکاسی کی ہے، خصوصاً غزل میں قاری کے پاس جو اپنے تجربات پر مشتمل جذبات کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں میں بیشتر مماثلت ہوتی ہے۔ جذبات انسانی زندگی کا ایک ایسا جز ہے، جسے زندگی سے الگ کرنا غیر فطری اور مصنوعی ہے۔ البتہ جذبات دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ محبت کے جذبات بھی اور نفرت کے بھی، درد و غم کے بھی اور ظلم و جبر کے بھی۔ عام طور پر غزل میں محبت اور درد و غم کے جذبات سے معاملہ ہوتا ہے مگر ان میں کہیں کہیں اخلاقی پیمانے پر اونچ نیچ کا احساس ہوتا ہے۔ مرثیے میں بھی جذبات نگاری سے کام لیا گیا ہے مگر ان جذبات کی حقیقت اور اصلیت کی بنیاد پاکیزگی ہوتی ہے۔ ان کی تہہ میں بے لاگ انسانی رشتے ہوتے ہیں۔ جیسے بھائی شہید ہو رہا ہے تو بہن کے جذبات کی عکاسی، بیٹا میدانِ جنگ کا رُخ کرتا ہے تو باپ اور ماں کے جذبات، کاروانِ حسینیؑ کا فرد، جنگ میں دشمن کی فوج کے نمائندوں سے خلافِ اخلاق اور سخت سست زبان کو سن کے اپنے اندر جو جذبات کا تلاطم دیکھتا ہے، اس کا بھی بیان مرثیے میں ملتا ہے۔ اس میں جذبات نگاری بالخصوص بہن کے موقع پر، رخصتی کے موقع پر یا بچوں کی پیاس کی شدّت کے اظہار کے موقع پر ہوئی ہے۔ غرض شاعری کی اصل متاع اور غزل کا گہنا یعنی جذبات نگاری، وہ مرثیہ کی صنف میں فطری طور پر آئے ہیں۔ اسی طرح قصیدے کا شکوہ بھی اس طرح سے اس صنف میں در آیا ہے کہ اس میں بلاغت ہی بلاغت ہے، کہیں کوئی مصنوعی پن نظر ہی نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرثیے میں جھوٹ کی گنجائش ہی نہیں اور فضائل میں جن ہستیوں کا ذکر مقصود ہو ان کی مدح میں تاریخ اور تاریخی شواہد رطب السان ہیں۔ وہاں کسی طرح کی تعریف اور مدح سرائی اصل کے مقابلے میں کم ہی لگے گی اور کہیں بھی کسی مبالغہ کا شائبہ نہیں ہوگا، جب کہ مختلف قصیدہ نگاروں کے دنیوی بادشاہوں کے قصیدے پڑھ کر یا سن کر، ایسا لگتا ہے کہ انع ۱۴ امات کے لالچ میں جھوٹی تعریفیں کی جا رہی ہیں۔ خوشامدیں ہو رہی ہیں اور حقیقت سے بعید اوصاف کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ مرثیہ میں فضائل کے بیان میں جن اوصاف کا بیان ہوتا ہے اور ہیرو کے مرتبہ کمالات اور کارناموں کا ذکر ہمیشہ ہی اصل سے کم لگے گا اور کہیں کسی مبالغہ کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔ غرض قصیدے کی سچائی کی حقیقت،، مرثیہ کے فضائل کے حصّہ میں اس طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ قصیدے کی صنف کا چہرہ اپنے اصلی اور درست خدوخال کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔

اسی طرح اگر مثنوی کے بیانیہ کو مرثیہ میں تلاش کیا جائے تو اس کی متعدد اور نفیس مثالیں دیکھنے کو ملیں گی۔ بیانیہ صنف سخن یعنی مثنوی کو کہانی کے تسلسل، کردار و کی تعمیر و تشکیل اور واقعات کی بنیاد پر فنی اعتبار کی صورت ملتی ہے۔ دیکھیں تو مرثیہ میں یہ تینوں اوصاف بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مثنوی میں یہ صفات مصنوعی ہو سکتے ہیں کیونکہ بیش تر اس میں کہانی فرضی اور خیال ہوتی ہے، واقعات اور کردار بھی اسی حوالے سے غیر معتبر اور مبنی پر دروغ گوئی ہوں گے۔ مرثیہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں جھوٹ اور دروغ گوئی کی گنجائش ہی نہیں۔ اس لیے مرثیے میں پیش کیے جانے والے کردار عام بیانیہ یعنی مثنوی یا نثری داستانوں سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔

مثنوی نگار، داستان گو یا افسانہ نویس واقعات کو گڑھ سکتا ہے، کرداروں کو تخیل کے سہارے جنم دے سکتا ہے اور اس میں اس کے فن کی بنیاد چونکہ جھوٹ پر ہے اس لیے اس کے لیے آسانیاں بہت ہیں۔ مگر مرثیے کے کرداروں کی حیثیت اوّل تو تاریخ نے پہلے ہی مقرر کر رکھی ہے اور دوسرے ان کی حدیں بھی مختص ہیں ان سے باہر یہ جا ہی نہیں سکتے اور اس طرح سے مرثیہ گو اپنے گرداروں سے وہ لبرٹی (Liberty) نہیں لے سکتا، جو مثنوی نگار کر سکتا ہے۔ اس حد بندی اور مخصوص دائرے میں رہ کر مستقل حیثیت دلانا، مرثیہ گویوں کا بہت ہی آزمائشی کارنامہ ہے۔ مرثیہ گویوں نے کردار نگاری کے اس فن کو اپنی محنتوں اور مشقتوں سے کامیابی سے ہم کنار کر دیا ہے۔ مرثیہ گویوں نے اپنے ذہنی رسا، قدرت زبان اور حُسنِ بیان سے کردار نگاری کے اپنے فن کو نہایت اعلیٰ مقام تک پہنچایا ہے۔ یہ تو ناقدین پر واضح ہے کہ مثنوی اور مرثیہ میں کردار نگاری کے اس فن کے تقاضے ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ عابد علی عابدؔی کا بیان ہے کہ:

''جس طرح مثنوی میں مختلف کردار ہوتے ہیں، مرثیے میں بھی مختلف کردار ہیں۔ اکثر ٹائپ ہیں یعنی رفتارِ زبان کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ ایک شاندار المیہ کے افراد ہیں۔ خیر کے نمائندے ہیں اور شر سے برسرِ پیکار ہیں۔ یہ اوصاف ان میں مشترک ہیں۔''

(اصولِ انتقادِ ادبیات ص ۶۵۱)

غور کیجیے تو مرثیے کے کردار، کردار ضرور ہیں مگر ان کی حیثیت زندہ اشخاص سے متعلق ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی بی ہے اور مذہبی بھی، اس لیے ان کا دائرۂ فکر اور حیصۂ عمل مختلف ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزمان لکھتے ہیں:

''اگر شاعر، ناول نویس یا ڈرامہ نگار اپنی تخلیق میں ایسے کرداروں کو جگہ دیتا ہے جن کی تاریخی حیثیت ہے تو اس کی پابندی بڑھ جاتی ہیں لیکن اگر وہ کردار تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی بھی رکھتے ہوں تو اس کی دشواریاں اور بھی زیادہ ہو جاتی ہیں۔ مرثیہ کے کرداروں کے ساتھ یہی دشواری ہے۔ واقعات کربلا مقاتل اور دوسری تاریخی کتابوں سے ماخوذ ہیں جن میں تقریباً تمام اہم واقعات درج ہیں۔ واقعات کے ساتھ ساتھ ان میں جو اشخاص کے بعض خصوصیات، گفتگوئیں، مکالمے وغیرہ بھی ملتے ہیں جن سے ان لوگوں کے بارے میں بھی کچھ رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ ان اندراجات کے ساتھ ساتھ ان اشخاص کے بارے میں روایات، معتقدات اور خیالات کا بھی ایک سلسلہ ملا ہوا ہے جنہوں نے ان شخصیتوں کا ایک عام تصور قائم کر دیا ہے، جس سے مرثیہ نگار نہ انحراف کر سکتا ہے نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی یا ترمیم کر سکتا ہے۔''

(اردو مرثیے کا ارتقاء ص ۳۲۲)

مسیح الزماں کا مرثیہ کے حوالے سے کرداروں کی نشاندہی اور عکاسی کا جو منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے وہ افسانوی ادب کی کردار نگاری،

جس میں مثنویات کو شامل کیا جانا چاہیے، سے مختلف ہے۔ افسانوی اور داستانوی ادب ہی کردار کی دو شکلیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو اس ماحول یا واقعہ کے حوالے سے جو مصنف نے خود پیدا کر دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مصنف بھی اس ماحول یا واقعہ کو اپنی گرد و پیش کی زندگی سے ہی لیتا ہے، مگر وہ خود اس میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ بعض خصوصیات اپنی طرف سے اس میں شامل کر سکتا ہے مگر تاریخی ماحول میں وہ اپنی طرف سے اضافے نہیں کر سکتا ہے مگر یہ عمل انتہائی مشکل صورت اختیار کرتا ہے، جب تاریخ کے ساتھ مذہب بھی جڑا ہو۔ جب واقعے یا کردار کی مذہب اور عقائد سے وابستگی ہو تو مصنف کو آگے آگے نہیں پیچھے پیچھے چلنا پڑتا ہے۔ کردار نگاری میں ایک خاص منزل وہ آتی ہے جب کردار کو مکالمے کے ذریعے سامعین یا قارئین کے سامنے پیش کرنا ہو۔ اس منزل پر مصنف کو مکالمے ہی کے ذریعے اپنے کردار کی حیثیت کو واضح کرنا ہے۔ تصور کیجیے جب یہ کردار مذہب سے واسطہ رکھتا ہو تو پابندی کتنی بڑھ جاتی ہے۔ اللہ مغفرت کرے پروفیسر شارب ردولوی کی جنھوں نے پہلی بار صنفِ مرثیہ کے ڈرامائی عناصر کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی۔ اس سے پہلے تو ایسے موضوعات پر اس حوالے سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ پڑھنا صحیح معنوں میں ایک Performing Art کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ مرثیہ پڑھنا اور پڑھتے ہوئے ''بتانا'' اپنی ایک اعلیٰ کیفیت رکھتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ مرثیے میں کہانی کے تمام عناصر موجود ہیں۔ اس کے کہنے اور پڑھنے دونوں میں ڈرامائی عناصر سے کسی طرح بھی مفر نہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں یہ خصوصیات آئیں گی وہاں کردار اور کردار نگاری کا بھی دخل ہوگا۔ اس اعتبار سے مرثیے میں کردار نگاری کے فن کو بھی بڑی اہمیت مل جاتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مرثیے میں کی جانے والی کردار نگاری کے تقاضے عام کہانی یا داستان کی کردار نگاری سے مختلف ہیں۔ مرثیے میں شامل واقعات کے حدود اور کرداروں کی خصوصیات پہلے سے طے ہیں اسی طرح کرداروں کی زبان سے پیش ہونے والے مکالمات کی پیش بندی بھی پہلے سے ہوئی ہے۔ مرثیہ گو کے لیے یہ کسی طرح سے بھی آسان نہیں ہے کہ کردار کے پس منظرِ قصیدِ شہادت، خاندان اور عقیدے کی یکسانیت کے باوجود کرداروں کی انفرادی شخصیت کو مکالمہ کے ذریعے قائم کر سکے۔ مرثیہ گویوں بالخصوص میر انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ بڑی آزمائشوں کے باوجود اس عمل میں کامیابی حاصل کر سکے ہیں۔ مکالمہ کے بارے میں لیجس اینگری اور جین مائیکل (Miss jeane Micheal) کی یہ رائے اہم ہے۔ لکھتے ہیں:

" The dialogue must stem from the charactes not the anthor. It must indicate character's bach ground and ..... "

(The art of dramatic writing & Iagos Egri, Page: 264)

یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ مرثیے کے کردار بھی اپنے ماحول، خاندانی روایات اور عقیدے کی خصوصیات کے اعتبار سے بولیں گے مگر ان سب باتوں میں ہر کردار کے خیر کی نمائندگی اور شر کی مخالفت کے اعتبار سے لیے یکسانیت ہے، اس لیے کرداروں کو ایک دوسرے سے تمیز کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ مثال کے طور پر ماحول میں یکسانیت یوں ہے کہ ہر کردار پیاسا ہے، گرسنہ ہے، گرمی کا مارا ہے، پانی نایاب ہے۔ ظالم ہر ایک کی جان کا پیاسا ہے۔ ہر کردار مولاؑ کا شیدائی ہے، اپنے سردار پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار ہے۔ خاندانی اور عقیدتی رعایت اور روایات یکساں ہیں، اس لیے مکالمہ سے ان کرداروں کی انفرادیت کو قائم کرنا یا قائم رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ مگر میر انیسؔ نے کسی ایک

انفرادی خصوصیت کو لے کر اس مہم میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اسی طرح شر کے نمائندوں کا پس منظر بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں ساری باتوں کی تفصیل سے پیش کرنا اور ہر بات کی وضاحت کرنا ممکن نہیں البتہ بعض کرداروں کے حوالے سے، یہ بات اشاروں میں بتائی جاسکتی ہے کہ میر انیسؔ کے مراثی میں کردار نگاری کی اس مشکل کو کیسے آسان بنا دیا گیا ہے۔ یہاں مراثیٔ انیس سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں کہ اس بات کا بہ آسانی اندازہ کیا جاسکے کہ وہ باوجود مشکلوں کے کردار نگاری کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

۱۔ امام حسینؑ کا کردار:

سانحۂ کربلا میں پہلے سے طے کردہ منازل اور امام حسینؑ کا مختلف موقعوں پر اپنے ردعمل سے اپنی شرافت، نجابت، شجاعت، عقیدت، محبت اور شفقت کا اظہار ہی ان کے کردار کی عکاسی کرتا ہے۔ باجود انفرادی سوچ کے میر انیسؔ نے کہیں بھی اس طے شدہ معیار کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔ یہ چند مثالیں میرے بیان کی تائید میں ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہ السلام کا فرزندِ جگر بند حضرت یوسفؑ کی جدائی میں متردد اور پریشان ہونا اور امام حسینؑ کا فرزند کی شہادت پر صابر اور مطمئن ہونا، میر انیسؔ نے اس طرح پیش کیا ہے کہ حسینیؑ سیرت کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

یعقوب یہ ثابت تھا کہ زندہ ہے جگر بند　　یوں روتے تھے جس طرح کہ مرجاتا ہے فرزند
تھی ان سے سوا بیٹے کی الفت انھیں دہ چند　　لیکن پسرِ فاطمہؑ تھا خرم و خر سند
فرماتے تھے فرزند عنایت ہے خدا کی　　دینے میں ہے کیا عذر امانت ہے خدا کی

امامؑ کا ردعمل فرزند دلبند حضرت علی اکبرؑ کی رخصتی کے موقع پر ایسے ظاہر ہوا ہے کہ ان کے کردار کی بلندی، بحوالہ مقصد حیات واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

حال اپنا اشاروں میں جو ماں کرتی تھی اظہار　　رہ جاتا تھا رو کر پسرِ بے کس و ناچار
رخصت جو طلب باپ سے کرتا تھا وہ دلدار　　فرماتے تھے حضرت کہ سجو جنگ کے ہتھیار
فرزند بھی گھر بار بھی سب نذرِ خدا ہے　　مادر سے کہو باپ تو راضی برضا ہے

یہ دیکھیے کہ میر انیسؔ کا یہ شعر امامؑ کی نجابت، شرافت اور تہذیب و تربیت کو کس طرح ظاہر کرتا ہے۔ تواضع اور اعلیٰ ظرفی کا یہ بہت ہی خوبصورت اظہار ہے۔

یہ تو نہ کہہ سکے کہ شہِ مشرقین ہوں　　مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

اس طرح سینکڑوں مثالیں کلام انیسؔ سے پیش کی جاسکتی ہیں، جو مولا کے کردار کی ہر ہر خوبی کو سامنے لانے میں مددگار ہوسکتی ہیں۔ دشمن سے خطاب، دوستوں سے خطاب، افراد خانہ سے مکالمہ پھر مختلف صورتوں کا سامنے کرتے وقت اپنے صبر، اعتمادِ عقیدہ، اور مقصد حیات کے

ساتھ ساتھ اپنے منصب کے تئیں بھی انصاف کا اظہار، کلام انیسؔ میں اس طرح ہوا ہے کہ ہر تقاضے کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔

۲۔حضرت زینبؑ کا کردار:

حضرت زینبؑ خواہرِ امام تھیں، دختر شاہِ مرداں و خاتونِ جنتِ جناب فاطمہ زہراؑ تھیں۔ یہ پیغمبر آخر الزماںؐ کی نواسی تھیں۔ ان کی غیرت و حمیت میں نہ صرف خانوادۂ رسالتؐ و خانوادۂ امامتؑ کا لحاظ تھا بلکہ نسوانی تحفظات کا بھی احترام لگتا ہے مثال کے طور پر جب زندانِ شام میں یزید کی اہلیہ کے آنے کی اطلاع ملتی ہے تو اس موقع پر میر انیسؔ نے حضرت زینبؑ کی شان سے کس طرح کے جذبات اور خدشات کا اظہار کیا ہے:۔

ہے دخترِ خاتونِؑ قیامت کا عجب حال　　بکھرے ہوئے ہیں دوش پہ سب گرد بھرے بال
فضہؑ سے یہ فرماتی ہیں وہ صاحبِ اقبال　　لادے مجھے گر کوئی ترے پاس ہو رومال
پردہ ہو کچھ ایسا کہ نہ دیکھے مجھے آ کے　　پیچھے ترے بیٹھوں گی میں چہرے کو چھپا کے
فرماتی ہیں تب ہاتھ اٹھا کر سوئے افلاک　　یارب میں ترے شیر کی ہوں دخترِ غمناک
آتی ہے خرابے میں زنِ حاکمِ سفاک　　میں قید میں بیٹھی ہوں چہرے پہ ملے خاک
ہر چند کہ آغوش میں زہراؑ کی پلی ہوں　　اس پر نہ یہ ثابت ہو کہ میں بنتِ علیؑ ہوں
سمجھا کے سکینہؑ سے کہا سن لو میں واری　　ہے گرم خبر ہند کی آتی ہے سواری
پوچھے جو مجھے کون ہے یہ ظلم کی ماری　　کہیو نہ کہ زینبؑ ہے پھوپھی جان ہماری
رشتہ شہؑ والا سے جتانا نہ کسی کا　　قربان گئی نام بتانا نہ کسی کا

۳۔حضرت عباسؑ کا کردار:

برادرِ امامِ عالی مقامؑ، فرزندِ خیبر کشا کے اوصاف پہلے ہی متعین ہیں۔ وہ بہادر ہیں جرأت مند ہیں، باوفا ہیں، بچوں کے چہیتے ہیں اور فوج کے علمدارؑ ہیں۔ فنونِ حرب میں یکتا ہیں اور اپنے بھائی امامؑ عالی مقام کے شیدائی ہیں۔ میر انیسؔ نے آپ کے ان صفات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے الفاظ نے تصویروں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ کمال یہ ہے کہ بیش تر باتیں اس طرح اشاروں میں بیان کی گئی ہیں کہ قاری یا سامع کے ذہن میں خود بخود متحرک تصویریں ابھرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے میدانِ جنگ کی طرف کوچ کا یہ عالم دیکھیے

کہتا تھا کوئی رعبِ علمدار تو دیکھو　　روشن ہے زمیں جلوۂ رخسار تو دیکھو
بجلی ہے خجل شوخیٔ رہوار تو دیکھو　　شانِ علمِ سیدِؑ ابرار تو دیکھو
پنجے سے تجلی یدِ بیضا کی عیاں ہے　　دامانِ علم آیۂ رحمت کا نشان ہے
فرما کے یہ غازی نے کہا گھوڑے کو کوڑا　　جوں شیر نظر ٹوٹ پڑا فوج پہ گھوڑا

ماری جسے تلوار نہ جیتا اسے چھوڑا　　پامال تھی جس صف کی طرف باگ کو موڑا
تھے کتنے لعیں خوف سے بے ہوش زمیں پر　　مچھلی سے تڑپتے تھے زرہ پوش زمیں پر
نزدیک جو تیغ آئی تو سر تن سے ہوئے دور　　زین گھوڑوں سے خالی تھی زمیں لاشوں سے معمور
گھوڑوں سے زمین پر جو گرے پڑتے تھے مغرور　　چار آئینہ ہوجاتے تھے شیشوں کی طرح چور
تھیں تیغ سے ڈھالیں بھی جو پرزے کہہ ومہ کی　　کڑیاں بھی بکھر جاتی ہیں کٹ کٹ کے زرہ کی

۴۔حضرت علی اکبرؑ کا کردار:

حضرت علی اکبرؑ، امامؑ عالی مقام کے نوجوان فرزند ہیں، عمر ۱۸ برس، اپنی پھوپھی کے پالے، سب کے لاڈلے، صورت میں پیغمبرِ آخر الزماں کے مشابہہ، اپنے والد عالی مقامؑ کے چہیتے ہیں۔ان کی جنگ اور شہادت بھی تاریخوں اور مقاتل کی کتابوں میں جس طرح بیان ہوئی ہے۔اس سے بچنا بھی ممکن نہیں ہے۔میر انیسؔ نے اپنے ذہن رسا اور فن شاعری میں اپنی مہارت سے ان کے کردار کو زندگی اور انفرادیت بخشی ہے۔یہ مثال ملاحظہ کیجیے کہ ایک مصیبت زدہ باپ اپنی جوان اولاد کو اپنا سہارا سمجھتا ہے جب وہی سہارا چھن جائے تو وہ کیفیتِ جدائی کی طرح اس توقع اور رشتے کو زبان دیتی ہے۔

کیا زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا　　کیا درد ہے جز دل کوئی محرم نہیں جس کا
کیا داغ ہے جلنا کوئی دم کم نہیں جس کا　　کیا غم ہے کہ آخر کبھی ماتم نہیں جس کا
کس داغ میں صدمہ ہے فراقِ تن و جاں کا　　وہ داغ ضعیفی میں ہے فرزندِ جواں کا

(مرثیہ مطلع۔کیا زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا)

میداں میں یہ غل تھا کہ صدا شاہؑ کی آئی　　اب دلبرِ زہراؑ کا بھتیجا ہے نہ بھائی
باقی تھا یہ بیٹا تو ہوئی اس سے جدائی　　یارو مجھے دیتا نہیں آنکھوں سے دکھائی
ہم شکلِ پیمبرؐ ہے یہ دل بند ہے میرا　　اٹھارہ برس کا یہی فرزند ہے میرا
یہ ذکر تھا رن میں جو قیامت ہوئی برپا　　ہر سمت سے اکبرؑ پہ کیا فوج نے نرغا
تلواریں چمکنے لگیں مینھ تیروں کا برسا　　اکبرؑ نے بھی لے نام علیؑ تیغ کو کھینچا
غل تھا کہ کبھی ایسی لڑائی نہیں دیکھی　　یہ تیغ کی برش یہ صفائی نہیں دیکھی

۵۔حضرت علی اصغرؑ کا کردار

واقعاتِ کربلا کو جس طرح کتابوں میں نقل کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ حضرت علی اصغرؑ شش ماہے طفلِ شیر خوار تھے۔لیکن اپنے باپ امام حسینؑ کے مشن اور قصد کو جانتے تھے۔جب امامؑ نے مدد کے لیے فریاد کی، اپنوں کو جنگ میں حمایت کے لیے پکارا تو حضرت علی اصغرؑ ہمک

کے جھولے سے اچھل کے باہر آئے۔ اس طرح امامؑ وقت کی آواز پر لبیک کہا۔ اس شیر خوار کی عمر، پیاس کی شدتِ پانی کی عدم دستیابی اور ایسے حالات میں زبان نکال کے دکھانا، ہاتھ پیر ہلانا، ضعف کی کیفیت وغیرہ، یہی وہ آثار ہیں، جن سے اس کردار کی انفرادیت قائم کی جاسکتی ہے۔ میر انیسؔ نے بڑی چابکدستی سے اس مشکل کو آسان کر دیا ہے۔ دیکھیے کیا کہتے ہیں:

جب رن میں حسینؑ اصغرِ بے شیر کو لائے　　لختِ جگرِ بانوئے دلگیر کو لائے
جلادوں میں اس صاحبِ توقیر کو لائے　　ہاتھوں پہ دھرے چاند سی تصویر کو لائے
غل پڑ گیا دیکھو شہؑ والا کے پسر کو　　خورشید نے ہاتھوں پہ اٹھایا ہے قمر کو
یہ کہہ کے پکارا اسد اللہ کا جانی　　کچھ کہتا ہوں یارو علی اصغرؑ کی زبانی
اب اٹھ نہیں سکتی تعبِ تشنہ دہانی　　کہتے ہیں کہ اک بوند پلا دو ہمیں پانی
سب خلق پہ احسانِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہیں　　تم لوگ مسلماں ہو تو ہم آلِ نبیؐ ہیں
شبیرؑ نے اس چاند کو ہاتھوں پہ اٹھایا　　چلّے سے کماندار نے واں تیر ملایا
خم ہو کے اسے مثلِ کماں شہؑ نے بچایا　　مانندِ اجل ناوکِ ظلم و ستم آیا
شبیرؑ چھپاتے رہے نازوں سے پلے کو　　بازو پہ لگا توڑ کے ننھے سے گلے کو

بانیانِ شر کے کردار:

یزیدی لشکر کے نمائندے بھی اپنی حرکتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ ظلم کے روادار ہیں۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود آلِ نبیؐ سے جنگ کرتے ہیں۔ نمائندگانِ خیر کو ایذائیں دیتے ہیں اور یہی بری صفتیں ان کے کردار کی شناخت ہیں۔ شمر کا کردار دیکھیے:

لشکر سے بڑھا شمرِ لعیں کھینچ کے خنجر　　فریاد ہے چھاتی پہ چڑھا شہؑ کی ستم گر
زانو سے دبا سینۂ زخمی جو سراسر　　اس وقت لہو منھ سے اگلنے لگے سرورؑ
خنجر کو رکھا شہؑ کے گلے پر جو لعیں نے　　تکبیر کہی کھول کے آنکھیں شہؑ دیں نے
ظالم کو زبان سوکھی دکھائی کئی باری　　پانی نہ دیا ذبح لگا کرنے وہ ناری
جب تک کہ نہ گردن کی رگیں کٹ چکیں ساری　　تکبیر رہی شہؑ کے لبِ خشک پہ جاری
جس وقت جدا ہوگیا سر تیغ سے کٹ کر　　خم ہوگیا قبلے کی طرف جسم الٹ کر

(از مرثیہ میر انیسؔ جلد سوم ص ۲۰۷ مطبع نول کشور پانچوں ایڈیشن ۱۹۳۹ء مطبع جب خیمے میں رخصت کو شہؑ بحر و بر آئے)

شمر کی سیرت کی ایک مثال:

پھر شمر بے حیا سے یہ بولا وہ نابکار　　ہیں سوے ہم نہ تو جواں آٹھ نو ہزار

رہ قلب فوج میں کہ تو ہے آزمودہ کار　　تیروں کی فوجِ شہؑ پہ رہے ہر طرف سے مار
زخمی کریں یہ سب تنِ اطہر حسینؑ کا　　چھاتی پہ چڑھ کے کاٹیو تو سر حسینؑ کا
سن کر سخن عمر کا یہ بولا وہ کینہ جو　　اس بات کی تو ہے مجھے مدت سے آرزو
تو دیکھ لیجو آج کہ زینبؑ کے رو برو　　کاٹوں گا تیغ سے شہِؑ لب تشنہ کا گلو
رلواؤں گا لحد میں جنابِ بتولؑ کو　　پیاسا کروں گا ذبح میں سبطِؑ رسولؐ کو

(مطلع۔جب آفتاب تاجِ سرِآسماں ہوا بند۔۸ نقدِ انیسؔ۔ادیبؔ مرحوم ص ۴۵)

قاتلِ علی اصغرؑ حرملہ کی سیرت:

انیسؔ نے ''بے پیر'' کہہ کے اس کی یوں نشاندہی کی ہے۔

شہِؑ بے کس نے لعینوں سے جو کی یہ تقریر　　سر کو نہوڑا لیا رونے لگے کتنے شریر
ہاتھ میں لے کے کماں کہنے لگا اک بے پیر　　مارتا ہوں پسرِ فاطمہؑ کے لال کو تیر
اس کی گردن سے جو پیکان گزر جاوے گا　　ساتھ فرزند کے شبیرؑ بھی مر جاوے گا
کہہ کے یہ تیر ستمگر نے کماں میں جوڑا　　دین سے دولتِ دنیا کے لیے منھ موڑا
یوں کماں سے شہِؑ آفاق کے جانب چھوڑا　　چھیدا بچّے کا گلا بازوئے سرورؑ توڑا
خون ننھی سی جو گردن سے رواں ہونے لگا　　چھاتی سے بیٹے کو لپٹا کے پدر رونے لگا

(بند ۱۹۔۱۸ مرثیہ مطلع۔غش ہوئے پیاس جو بانوؑ کے جانی اصغرؑ نقوش انیسؔ نمبر ص ۵۰۴)

غرض اس طرح سے میر انیسؔ نے سیرت نگاری یا کردار نگاری کے جو ہر دکھا کے صنفِ مرثیہ کو زیادہ مسکی اور پُر اثر بنایا۔اس کے ساتھ ہی اس فنکاری نے مراثی میں پیش ہونے والے شہدا کے اوصاف اور ان کے مدِ مقابل افراد جماعتِ اشقیا کو ایک مستقل حیثیت دے دی۔اس طرح کی سیرت نگاری نے ان کرداروں کو وہ زندگی عطا کی کہ وہ عوامی زشبان اور عوام کی گفتگو میں مثالی حیثیت کے مالک ہو گئے۔چنانچہ یہ کردار خیر کی مناسبت اور ان کے دشمن شر کی مناسبت سے مثال ہو کر امر ہو گئے۔نہ کبھی خیر کی نمائندے ان کی شناخت سے آگے نکل کے اور نہ ہی شر کے نمائندے ان مراثی میں پیش کیے گئے یزیدی فوج کے کرداروں کو ظلم ڈھانے میں مات دے سکے۔

❀❀❀❀

میر انیسؔ کے مزار کی تعمیر کی داستان

ڈاکٹر تمثال مسعود

۱۹۰۷ء میں آگرہ اخبار سے شائع ہونے والی مولانا سید امجد علی صاحب اشہری اپنی کتاب حیاتِ انیسؔ کے صفحہ نمبر ۳۹ پر ''میر انیسؔ کا مزار'' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''مجھ کو'' میر انیسؔ کی مستغنی اعن البیان شہرت اور ان کی ایسی مقبول عام خدمت اور ان کے قدر شناس امراء اور لکھنو کے فیاض اور اپنے شہر کی خود داری کا خیال رکھنے والے ارباب ہمت سے تعجب اور سخت ہے کہ ان بزرگوں نے اپنے اتنے بڑے شہرہ آفاق شخص کے لیے کوئی یادگار کا انتظام نہیں کیا''

اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۹۰۸ء میں مہدی حسن احسنؔ لکھنوی کی کتاب واقعاتِ انیسؔ کے شائع ہوئی جس کے صفحہ نمبر ۳۴ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

آشوبِ غدر کے بعد میر انیسؔ نے منصور نگر میں قیام کیا پھر وہاں سے راجہ کی بازار تشریف لے گئے پھر چوبداری محلّہ یعنی سبزی منڈی کے مکان میں تشریف لائے اور اس مکان کو بطور خود خرید کر تیار کیا۔ مکان سکونت کے قریب ایک چھوٹا سا باغ بھی تھا۔ اب اس میں میر صاحب مرحوم کی قبر بلکہ اور خاندانی لوگوں کے مدفن بھی اسی باغ میں ہیں۔ جس وقت سے کہ میر انیسؔ مرحوم نے اس اراضی کو اپنے خاندانی مزاروں کے لیے حسب ضابطہ گورمنٹ سے مستثنیٰ کرا لیا ہے اس کے اندر مقبرے کے طور پر ایک چھوٹا سا کمرہ بنایا گیا ہے جس میں چند قبریں ہیں۔ میر انیسؔ کی قبر کے سرہانے ایک مجلس کا مرقّع بھی لگا ہوا تھا جسے دروغہ محمد خان نے تیار کیا تھا۔ میر انیسؔ کے ہاتھ میں جو مرثیہ ہے اس پر یہ مصرعہ لکھا ہوا ہے: ''برہم ہے مرقع چمنستان جہاں کا''

انقلابِ زمانہ پرانی یادگاروں کو مٹا رہا ہے۔ شاید کوئی وقت آجائے کہ ان بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے والا نہ ہو۔''

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مزار انیس کی از سرِ نو تعمیر کے لیے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے قریب چالیس سال کام کیا اور آخر کامیاب ہوے۔ ادیبؔ کو مزارِ انیسؔ کی تعمیر اور مکانِ انیسؔ کی مرمّت کا خیال کب آیا، اس بارے میں صحیح تاریخ تو نہیں معلوم ہو سکی ہے لیکن ان کی ذاتی ڈائریوں میں مزارِ انیسؔ کی بابت سب سے پرانی تاریخ ۱۰ر نومبر ۱۹۳۳ء ملتی ہے، جہاں انھوں نے لکھا ہے:

''مزارِ انیسؔ کے متعلق مشورہ''

لیکن اور کسی طرح کی وضاحت نہیں کی گئی کہ کس سے اور کیا مشورہ کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ء، ۱۹۶۰ء، اور ۱۹۶۱ء کی ڈائریوں میں مزار اور مکانِ انیسؔ کے متعلق اندراج ہے کہ مکاناتِ انیسؔ کی نیلامی، نیلامی کئی مرتبہ ملتوی ہوئی علی ظہیر صاحب (وکیل) سے مکانات انیسؔ کے سلسلے میں ملاقاتیں، انیسؔ میموریل کے نقشے میونسپل میں داخل، انجینئر نے مکاناتِ انیسؔ کی مرمت پر سرسری خرچ چالیس ہزار بتایا۔

ادیبؔ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۷۱ء میں دہلی میں مرکزی انیسؔ صدی کمیٹی کا قیام ہوا۔ میر انیسؔ کا انتقال ۱۸۷۴ء میں ہوا تھا اس

حساب سے ۱۹۷۴ء میں ان کی وفات کو سو سال ہو رہے تھے۔ مرکزی انیسؔ صدی کمیٹی کا مقصد تھا میر انیسؔ کی وفات کی صدی ان کے شایان شان منائی جائے۔ مرکزی انیسؔ صدی کمیٹی کے دوسرے مقاصد کے ساتھ ایک مقصد مزارِ انیسؔ اور مکانِ انیسؔ کی مرمت اور درستی بھی تھا۔ کمیٹی کے دوسرے مقاصد میں انیسؔ کے مرثیوں کا مجموعہ شائع کرنا، جس میں غیر مطبوعہ کلام بھی شامل کیا جانا تھا، دہلی اور دیگر شہروں میں سمینار کرنا، ریڈیو اور ٹی وی پر انیسؔ سے متعلق پروگرام نشر کرنا، اور انیسؔ صدی یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کرنا بھی تھا۔

کمیٹی کے قیام کے بارے میں ادیب ۱۹۷۱ء کے ایک خط میں نورانی صاحب کو لکھتے ہیں:

''میر انیسؔ کی صد سالہ یادگار منانے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے جس کا نام سرنامے پر اور جس کے ممبروں کے نام حاشیے پر درج ہیں۔ اس کے علاوہ کمیٹی نے ملک کے تیس بتیس شہروں میں اپنے نمائندے مقرر کیے ہیں اور ان سے درخواست کی ہے کہ اپنے اپنے شہروں میں میر انیسؔ کی صد سالہ یادگار منائیں۔ دہلی کے لیے خواجہ صاحب کو نمائندہ مقرر کیا ہے جو امید ہے کہ ایک کمیٹی بنا کر یادگار کا انتظام شروع کریں گے اور آپ کو بھی اس کمیٹی کا ممبر ضرور مقرر کریں گے بغیر آپ کے تعاون کے یہ کام انجام ہی نہ پا سکے گا۔''

ایک اور خط میں ادیب نورانی صاحب کو لکھتے ہیں:

''میری تحریک پر جناب کرنل بشیر حسین زیدی نے دہلی میں مرکزی انہیں صدی کمیٹی قائم کر لی ہے جو عیسوی سن کے حساب سے صد سالہ تقریب دسمبر ۱۹۷۴ء میں منائے گی۔ مالک رام صاحب اور علی جواد زیدی صاحب اس کمیٹی کے سکریٹری ہیں۔ میں بھی کمیٹی کا جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا ہوں لکھنؤ میں جو کمیٹی میر انیسؔ صد سالہ تقریبات کمیٹی کے نام سے قائم ہے وہ ہجری سن کے حساب سے دسمبر ۱۹۷۱ء میں تقریبات منانا چاہتی ہے۔''

لکھنؤ میں اس کمیٹی کی تشکیل بھی ادیب نے کی تھی اور اس کمیٹی کو حکومت کشمیر سے دس ہزار روپے کا عطیہ بھی مل چکا تھا۔ اس رقم سے ملنے سے مزار اور مکانِ انیسؔ کا کام زوروں سے شروع ہو گیا تھا۔ اس بارے میں صالحہ عابد حسین کی کتاب انیسؔ کے مرثیے، ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۷۷ء میں کرنل بشیر حسین زیدی لکھتے ہیں:

''میر انیسؔ کے مزار اور مکان کے سلسلے میں لکھنؤ کی انیسؔ صدی کمیٹی نے کافی پیش رفت کی ہے۔ اگر کچھ کام باقی رہ گیا اور مرکزی کمیٹی کے وسائل نے اجازت دی تو وہ اس کام کی طرف بھی توجہ کرے گی۔''

ماہِ نو، کراچی کے ۱۹۷۲ء کے انیسؔ نمبر میں میر انیسؔ کے مزار کی ایک تصویر ہے جس کے نیچے لکھا ہے:

نو تعمیر مقبرۂ انیسؔ۔ جسے ان کی صد سالہ برسی کے موقع پر مکمل کیا گیا۔''

آج کل نئی دہلی کے ۱۹۷۵ء کے میر انیسؔ نمبر کی پشت پر میر انیسؔ کے مزار کی ایک تصویر ہے جس پر یہ عبارت لکھی ہے:

''میر انیسؔ کا نیا (نامکمل) مزار۔ اب سے کوئی پندرہ سال قبل یادگار انیسؔ کمیٹی نے جس کے سکریٹری علی عباس حسینی مرحوم اور خازن پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ تھے، ایک نیا مزار انیسؔ اور ایک انیسؔ میوزیم بنانے کی کوشش کی تھی۔ صرف مزار جزوی طور پر مکمل ہو سکا۔''

ماہِ نو میں ہی مزار کی پرانی تصویر بھی شامل ہے جس میں سیدھی سیدھی چار دیواروں سے گھرا ہوا ایک بڑا کمرا ہے۔ اس کی چھت بھی پوری نہیں ہے۔ ایک طرف داخل ہونے کے پانچ راستے ہیں، چوڑان میں ایک داخلہ ہے مگر دروازہ کسی میں نہیں ہیں۔ اس سپاٹ عمارت کے پاس ایک کھجور کا درخت لگا ہے، چاروں طرف گھاس پھوس کے جھاڑ جھنکار ہیں تعمیر کے بعد اس کی ایک باقاعدہ مقبرے کی صورت نکل آئی

تھی۔ان بیانوں سے اور چھپی ہوئی تصویروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۷۲ء تک مزار کی عمارت از سرِ نو مکمل ہو چکی تھی۔بس کچھ کام باقی رہ گیا تھا، جیسے رنگائی بیلی کا بندوبست، فرش، اور قبر کا پتھر جو بعد میں مقبول احمد لاری صاحب نے لگوایا۔ادیبؔ کے ذخیرے میں مزار کی تعمیر کی ہر منزل کی تصویر موجود ہے۔سب سے آخری تصویر میں انیسؔ کا مزار ایک شاندار عمارت بن کر سامنے آیا ہے، جس کے اونچے، دوہرے اور نازک درفنِ تعمیر کا عمدہ نمونہ ہیں، خاص کر دروں کے کنگورے۔

ادیبؔ کی ڈائریوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مزار اور مکانِ انیسؔ کے کام میں کس قدر منہمک تھے۔ادیبؔ سے ملنے کے لیے آنے والے تمام احباب بھی اس کام سے باخبر رہتے تھے اور اکثر ادیبؔ کے ساتھ جا کر مزار اور مکانِ انیسؔ کا معائنہ کرتے تھے۔خود ادیبؔ مہینے میں کئی کئی بار مزار اور مکان انیسؔ پر جاتے تھے۔

میر انیسؔ کے مزار اور مکان کی تعمیر اور درستی کے سلسلے سے ہی مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے کئی اقدام کیے تھے جیسے مکانِ انیسؔ پر ۱۲ر دسمبر ۱۹۶۵ء کو ایک دفاعی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔۹ اور ۱۰ر نومبر ۱۹۶۸ء کو مرثیہ خوانی کی مجلس کا انعقاد ہوا۔جس میں خورشید حسین، امیر حیدر خان اور محمد محسن جونپوری وغیرہ نے مرثیے پڑھے۔ان مجلسوں کی پوری روداد نہیں مل سکی۔روزنامہ سرفراز اور نظارہ میں ان مجلسوں کے اعلان، مجلسوں کی روداد تفصیل سے چھپتی تھی۔صد سالہ تقریب کے لیے ایک سمینار کا خاکہ بھی ادیب نے تیار کیا تھا۔اس سمینار کے لیے مضامین کے موضوعات کی فہرست کے ساتھ مقالہ نگاروں کی فہرست بھی تیار کر چکے تھے۔اس کے علاوہ ادیب نے سرفراز میں مزار اور مکان کی تعمیر کے لیے چندے کی اپیلیں بھی چھپوائیں۔انیسؔ پر ایک چھوٹی سی کتاب شاعرِ اعظم انیسؔ بھی ادیبؔ نے اس مقصد سے لکھی کہ اس کی فروخت سے جو رقم آئے گی اس کا استعمال مزار کی تعمیر میں کیا جائے گا۔

میر انیسؔ اور مرثیے سے عشق اور سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کی شرافت اور علم کی وجہ سے اس پوری مہم میں بہت سے لوگوں نے ادیبؔ کا ساتھ دیا۔یہ لوگ کسی طرح کے فائدے کے بغیر کام کر رہے تھے۔اپنے وقت کے خطِ نستعلیق کے ماہر خطّاط جناب ریاض الحسن جو میر انیسؔ کے قدر دان تھے اور ادیبؔ کو بہت مانتے تھے، انھوں نے ادیبؔ سے فرمائش کی تھی کہ مزارِ انیسؔ کی پیشانی کی عبارت وہ لکھنا چاہتے ہیں۔بعد میں ریاض الحسن کی یہ خواہش پوری ہوئی۔مزارِ انیسؔ کی پیشانی پر کندہ مندرجہ ذیل شعر جو ادیبؔ کا ہی کہا ہوا ہے، ریاض الحسن نقوی کی باکمال خطاطی کا نمونہ ہے۔وہ شعر تھا:

چیست　ایں　ایوانِ　عالی　و　نفیس
خواب　گاہِ　شاعرِ　اعظم　انیسؔ

میر انیسؔ کی قبر پر جو پتھر لگا ہوا ہے اس کی کتابت اپنے زمانے کے ایک اور خطّاط اور ذاکر مولوی شوکت حسین نے کی تھی۔

انیسؔ کی صد سالہ یادگار کے سلسلے میں ۱۹۷۵ء میں مکان انیسؔ پر ایک شاندار تحت اللفظ خوانی کا پروگرام منعقد ہوا۔اس میں ایک نوجوان نے بھی شرکت کی تھی جن کو حافظِ مراثیِ انیسؔ کہا گیا۔سیّد سجاد حسین شدیدؔ لکھنوی (وفات ۱۹۷۸ء) نے ضعیفی اور کمزوری کے باوجود مرثیہ خوانی کے روایتی انداز کو بہت خوبی سے پیش کیا۔میر انیسؔ کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے اور ادیبؔ کے پرستار ہادی صاحب لائقؔ نے اس پورے مرحلے میں ادیبؔ کا بہت ساتھ دیا تھا۔پورے پروگرام میں ہادیؔ صاحب لائق بہت گریہ کرتے رہے کیونکہ ادیبؔ اس تقریب میں موجود نہیں تھے۔ادیبؔ اپنے گھر، ادبستان میں بسترِ مرگ پر خاموش لیٹے ہوئے تھے۔اس تقریب کے چند مہینے بعد ہی ۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

عصرِ حاضر میں سماجی اعتبار سے میر انیسؔ کے سلاموں کی معنویت

ڈاکٹر وفاؔ نقوی

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ میر انیسؔ پر ''خدائے سخن'' کا خطاب صادق اترتا ہے۔ وہ اردو ادب کی روح، اردو شاعری کی عظمت اور اردو مرثیے کا عرشِ اعظم ہیں۔ انھوں نے نہ صرف مرثیے کا دامن وسیع ترین کیا بلکہ سلام نگاری کے فن کو بھی محدود دائروں سے آزاد کرتے ہوئے اس کو اہلِ نقد ونظر کے لئے تنقیدی نگارشات کا محور بنایا۔

ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے سلام نگاری میں اپنے دور کے تمام تر علمی وادبی تقاضوں کا پاس رکھتے ہوئے اسے عوام وخواص کی دلچسپی کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے اس میں رثائی عناصر کے ساتھ ساتھ غزل کے مختلف اسالیب سے بھی کام لیا اور سلام نگاری کے دامن میں مختلف رنگا رنگ موضوعات کے پھولوں کو سمیٹ کر یہ ثابت کیا کہ سلام نگاری کا تعلق سماج اور کائنات سے نہایت گہرا ہے۔

ان کے سلاموں کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ان کے معاشرے کے متعدد مناظر اور تصاویر جلوہ افروز ہیں۔ چونکہ ان کی نگاہ دور بین تھی اور قدرت نے انھیں ذہنِ رسا دیا تھا اس لئے انھوں نے سلاموں میں ایسے ایسے اشعار رقم کیے جو غزل کی صنف کے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ ماورائے زمان ومکاں نظر آتے ہیں اور انھیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور ہی کی نہیں بلکہ ہر آنے والے دور کی بات کر رہے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے کے کچھ مسائل رہے ہیں۔ بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں نے ان مسائل میں اضافہ کیا یا ان کی صورتوں کو دوسرے قالب بھی ڈھال دیا لیکن ہر دور کا انسان اپنی زندگی میں مسلسل مسئلوں اور الجھنوں کا شکار رہا ہے۔ کچھ مسائل اور الجھنیں ہر دور میں یکساں رہی ہیں جیسے بدلتے حالاتِ زمانہ، مٹتی ہوئی تہذیبیں، معدوم ہوتے ہوئے اقدار، بے ثباتیٔ کائنات، قدم قدم پر رونما ہونے والی تکالیف، مصائب کے ہجوم، عدالتوں میں انصاف کا فقدان، اخلاقیات سے روگردانی، خواہشات کے ہجوم، انسانوں کا خوابِ غفلت میں مگن ہونا، عزیز واقارب سے بے تعلقی، لالچ وطمع، قناعت نہ اختیار کرنا، احساسِ گناہ نہ ہونا، کبر وغرور، بے راہ روی، بے عملی، حوصلہ نہ رکھنا، خدمتِ خلق سے احتراز، ظاہری حسن وجمال پر فریفتگی وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کا وجود مختلف اسالیب کے سایوں میں ہر دور کے باشعور تخلیق کار کا موضوعِ سخن رہا ہے چاہے وہ کسی صنف کی راہ کا مسافر ہو۔

مذکورہ مسائل آج بھی ہمارے معاشرے میں سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور انسان کی ہستی ان سے کہیں نہ کہیں دوچار ہی رہتی

ہے۔میر انیسؔ نے اپنے سلاموں میں ان موضوعات کو اٹھایا لیکن مثبت انداز میں تاکہ عوام الناس کو ایک حوصلہ بھی ملے اور انسان کی زندگی انسانیت کے لباس میں خوبصورتی کے ساتھ گزر سکے۔

انیسؔ اس ضمن میں کائنات کی نبض پکڑ کر شعر کہتے ہیں انھیں گزرے ہوئے زمانے کا بھی احساس ہے اور آنے والے نئے دور کا کرب بھی ان کے یہاں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔مثلاً تغیراتِ زمانہ کے حوالے سے ان کے یہاں متعدد اشعار نظر آتے ہیں۔ایک جگہ کہتے ہیں:

ہمیشہ فرشِ مشجر پہ جو کہ بیٹھتے تھے　　نہ ان کی قبر پہ بھی سایۂ شجر دیکھا

یعنی وہ لوگ جو کبھی عیش کی زندگی گزارتے تھے اور عمدہ و قیمتی فرش پر بیٹھتے تھے ان کے ساتھ وقت نے ایسا رویّہ اختیار کیا کہ آج ان کی قبور پر بھی کسی طرح کا سایہ نظر نہیں آتا۔لیکن یہ تبدیلی کسی حیرت کا باعث نہیں زمانے کا یہی انداز ہے کہ کبھی کچھ میسّر ہے تو کبھی کچھ میسّر نہیں۔شعر ہے:

ہر اک کے ساتھ ہے روشن دلو! طلوع و غروب　　سحر کو چاند نہ تھا،شب کو آفتاب نہ تھا

انیسؔ چونکہ نوابیت کے دور کے پروردہ تھے اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے لکھنؤ اور اس کے اطراف کی آسودگی و آسائش کا باقاعدہ مشاہدہ کیا تھا اور اس کے بعد ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بھی چشم دید گواہ تھے کہ کس طرح صاحبانِ عروج کے مقدّر میں زوال آیا۔اس لیے اس کی جھلکیاں ان کے سلاموں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔کہتے ہیں:

انھیں کو آج نہیں بیٹھنے کی جا ملتی　　معاف کرتے تھے جو لوگ کل زمینوں کو

ان کے یہاں بچھڑے ہوئے ساتھیوں،ہم نشینوں اور دوستوں کے فراق کی کسک بھی جا بجا نظر آتی ہے۔شعر ہے:

جہاں سے اٹھ گئے جو لوگ پھر نہیں ملتے　　کہاں سے ڈھونڈھ کے اب لائیں ہم نشینوں کو

وہ زندگی کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا بھی اپنے سلاموں میں تذکرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔کہتے ہیں:

قیام کس کا ہوا اس سرائے فانی میں　　ہمیشہ ایک کے بعد ایک کا سفر دیکھا

شباب تھا کہ دمِ واپسیں کی آمد و شد　　یہ مضطرب اِدھر آیا اُدھر روانہ ہوا

پیامِ مرگ ہے موئے سفید اے غافل!　　کبھی سنا ہے کہ پیری گئی شباب آیا

لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو　　قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو

مقام یوں ہوا اس کار گاہِ دنیا میں　　کہ جیسے دن کو مسافر،سرا میں آکے چلے

وہ اس دنیا کو اور اس میں بسنے والے انسانوں کو مختلف تشبیہات و استعارات کے پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔خاص طور سے دنیا کو بار بار ''بحرِ فنا'' یا ''بحرِ ہستی'' اور انسانوں کو ''حباب'' کہہ کر پکارتے ہیں۔چند اشعار دیکھیں:

نہ سر اٹھائیو بحرِ فنا میں ، اے غافل!　　صدا یہ دے گیا پانی پہ جب حباب آیا

وہ کیا نمود کرے آہ بحرِ ہستی میں　　جو ایک دم کے لیے صورتِ حباب آیا

نمود و بود و بشر کیا محیطِ عالم میں　　ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا
ہوا پہ کیوں ہیں تنک مائگانِ بحرِ فنا　　جو بڑھ گیا کوئی قطرہ تو وہ حباب بنا

اس کے علاوہ وہ عالمِ پیری کی تکالیف کا بھی ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

عالمِ پیری میں آئے کون پاس　　اے صبا گرتی ہوئی دیوار ہیں
برق تھی گویا کہ چمکی چھپ گئی　　تیری مدّت اے جوانی دیکھ لی

تکالیف اور مصیبتوں کا سامنا ہر شخص کو کبھی نہ کبھی کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ تکالیف قدرداں باقی نہ رہنے کی صورت میں بھی ہوسکتی ہیں، ناانصافی کی وجہ سے بھی اور بے وفائی کے رنگ میں بھی نظر آسکتی ہیں۔ انیسؔ کہتے ہیں:

یک بیک ایسا زمانے میں ہوا ہے انقلاب　　قدر داں سب اٹھ گئے، ناقدرداں پیدا ہوئے
نیک بد ٹھہرے ، برے اچھے ہوئے　　منصفوں کی قدردانی دیکھ لی
توقّع جن سے تھی وہ لوگ مطلب آشنا نکلے　　انیسؔ افسوس ہم بھی کیا بری تقدیر رکھتے ہیں

اس کے ساتھ انسانوں کی انسانوں سے بے ربطی اور بے تعلقی بھی سماج کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ جو انیسؔ کے دور میں انیسؔ کو متاثر کرتی رہی اور عصرِ حاضر کا انسان بھی جس سے بخوبی آشنا ہے۔ انیسؔ کہتے ہیں:

کوئی انیسؔ کوئی آشنا نہیں رکھتے　　کسی کی آس بغیر از خدا نہیں رکھتے

یعنی انیسؔ کسی سے تعلقِ خاطر کی امید نہیں رکھتے کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ دنیا میں ہر شخص اپنی اپنی ہستی میں گم ہے۔ انھوں نے دنیا کا مطالعہ و مشاہدہ نگاہِ غائر سے کیا ہے جو ان کے کلام سے مترشح ہے۔ وہ خود بھی کائنات کی حقیقت سے آشنا ہیں اور دنیا کو بھی اپنے تجربات و مشاہدات میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بیباکی اور بغیر کسی دریغ کے معاشرے کی سچی تصویر کشی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

جو سخی ہیں مالِ دنیا سے ہیں خالی ان کے ہاتھ　　اہلِ دولت جو ہیں ، وہ دستِ کرم رکھتے نہیں

یعنی جن کی فطرت میں سخاوت ہوتی ہے وہ کبھی اس راہ میں ٹھہرتے نہیں اور مالِ دنیا کو اہمیت نہیں دیتے اور جو دنیادار افراد ہیں یعنی جنھیں مال جمع کرنے کی ہوس ہے وہ کسی کے ساتھ حسنِ سلوک نہیں کرتے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انسان جو عمل انجام دیتا ہے اس کا صلہ اسے مل کر رہتا ہے۔ کہتے ہیں:

گندم سے گندم جَو سے جَو ہے　　کاٹیں گے وہی جو بو رہے ہیں

وہ اپنے سماج میں یہ بھی دیکھتے ہیں عزیز و اقارب زندگی میں ایک دوسرے سے بے ربطی اور دوریاں رہتی ہیں اور کوئی کسی سے غرض نہیں رکھتا لیکن جب ان میں سے کسی کی موت واقع ہوتی ہے تو اشک فشانی کرتے ہیں۔ شعر ہے:

زندگی میں تو نہ اک دم خوش کیا ہنس بول کر　　آج کیوں روتے ہیں میرے آشنا میرے لیے

انیسؔ کا کمال یہ بھی ہے کہ مختلف النوع مضامین کے باوجود ان کی سلام گوئی کی روح مجروح نہیں ہوتی۔ وہ مختلف وادیوں اور سمتوں کے سفر کے بعد سلام کی سنجیدگی اور اس کے تحت عوام تک پہنچنے والے پیغام سے کبھی قطع نظر نہیں کرتے۔ ان کا ہر شعر ذہن سازی اور حیات کے حقیقی مقاصد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہتے ہیں:

پسِ فنا زن و فرزند چھوڑ جائیں گے　　شریکِ حال مسافر ثواب رہتا ہے

اور یہ حقیت ہے کہ کسی انسان کے ساتھی اس کی حیات تک ہی ہوتے ہیں حتیٰ کہ اس کی موت کے وقت قریب ترین افراد بھی اس سے دور ہوجاتے ہیں۔ کہتے ہیں:

قبر میں رکھ کر نہ ٹھہرا کوئی دوست　　میں نئے گھر میں اکیلا رہ گیا

پھرے دوست جب ہوگئی قبر بند　　کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں

انیسؔ کے خیال میں چاہے جیسے حالات ہوں انسان کو اخلاقیات سے کبھی رشتہ منقطع نہ کرنا چاہئے جو کہ معاشرے کا ایک اہم پہلو ہے۔ کہتے ہیں:

خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم　　انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی　　چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

حسنِ اخلاق کے ساتھ ساتھ وہ انکساری کو بھی لازم سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ انکساری ہی انسانیت کی پہچان ہوتی ہے اور اسی کے سبب انسان دلوں میں مقام حاصل کرتا ہے۔ کہتے ہیں:

مثالِ شاخ جھکے جب تو ہم پھلے پھولے　　نہالِ عجز لگا کر عجب ثمر دیکھا

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں　　اس زمیں سے واہ،کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

لیکن جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا کہ وہ سلام کی فضا کو ہر مضمون کے تحت قائم رکھتے ہیں اور یہ ان کا خاصہ بھی ہے کہ وہ سلام کے دامن کو اس طرح بھی وسعت بخشتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک شعر دیکھیں جس میں حضرت علیؑ کی سیرت سے اپنے آپ کو مستفیض کرتے ہیں۔ شعر ہے:

انیسؔ عمر بسر کر دو خاکساری میں　　کہیں نہ یہ کہ غلامِ ابوترابؑ نہ تھا

لیکن وہ خاکساری کے باوجود حاسد کی حسد کا شکار ہوتے ہیں تو اپنے جذبات کا بھرپور اظہار کرتے ہیں اور بلا جھجک کہتے ہیں:

سوکھ کر کانٹا ہوا ہوں اے انیسؔ　　آنکھ میں دشمن کی اب تک خار ہوں

وہ اپنے سماج میں جب کبر و غرور دیکھتے ہیں تو خاموش نہیں رہتے بلکہ متکبر انسانوں کو آئینہ دکھانے اور حقیقتِ کائنات سے آشنا کرانے کی مکمل سعی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

دیکھنا ،کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے ان کے سر　　آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں

جنھیں ملا انھیں افتادگی سے اوج ملا　　انھوں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

وہ اس بات کی بار بار نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان خاکی ہے فنا اس کا مقدّر ہے اسے زیرِ زمین جانا ہے تو اس کا متکبر ہونا اسے زیب نہیں دیتا۔ کہتے ہیں:

زمیں کے تلے جن کو جانا ہے اک دن　　وہ کیوں سر کو تا آسماں کھینچتے ہیں

وہ موت کے خیال کو فراموش کرنے کو غفلت میں شمار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

نہیں خبر انھیں مٹّی میں اپنے ملنے کی　　زمیں میں گاڑ کے بیٹھے ہیں جو دفینوں کو

انسان کے ذہن و دل میں بے شمار آرزوئیں اور تمنائیں وجود رکھتی ہیں وہ زندگی میں بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے لیکن پھر بھی اس کی ہوس پوری نہیں ہوتی۔ شعر ہے:

روئے آسائش نہ دیکھا عمر بھر　　جو گیا دنیا سے وہ بے دل گیا

یہ ممکن نہیں کہ انسان کو اس دنیا میں کبھی خوشی نہ ملی ہو لیکن اس کی خوشی یعنی اس کی آرزوؤں کی کوئی حد متعین نہیں اسی لیے وہ دنیا سے جاتا ہے تو بد دل ہو کر ہی جاتا ہے۔ جب کہ انسان کی بنیادی ضرورت غذا اور مکان ہے اس کے بعد اس کو قبر کے لیے دو گز زمین چاہیے۔ اگر وہ یہ نعمتیں رکھتا ہے تو کامیاب ہے۔ شعر ہے:

کھانے کو رزق ، رہنے کو گھر اور لحد کو جا　　دنیا میں ایک جان کو کیا کیا نہ چاہیے

انیسؔ اپنے سلاموں میں متعدد اشعار میں قناعت اور توکّل کا درس دیتے ہیں کیوں کہ کسی انسان کے آگے دستِ سوال دراز کرنا غیرت مندی کا تقاضہ نہیں ہے۔ اشعار دیکھیں:

جو کچھ تھا رزق مقدّر ، ملا وہ گھر بیٹھے　　ہزار شکر نہ ہم نے کسی کا در دیکھا

تختِ سلطاں سے بھی بالا تر ہے اس کا بوریا　　صاحبِ مسند ہے تکیہ ہے ، جسے اللہ پر

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے　　سر جہاں رکھتے ہیں سب ، ہم واں قدم رکھتے نہیں

کسی کے سامنے کیوں جاکے ہاتھ پھیلاؤں　　مرا کریم تو دیتا ہے، بے سوال مجھے

لیکن قناعت کے یہ معنی نہیں کہ انسان روزی روٹی کے حصول کے سلسلے سے محنت نہ کرے بلکہ رزق کی تلاش میں بعض مرتبہ کشاں کشاں بھی جانا پڑتا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کو محنت و مشقّت سے گریز مناسب نہیں۔ شعر ہے:

کشاں کشاں مجھے جانا پڑا وہاں آخر　　جہاں جہاں مری قسمت کا آب و دانہ ہوا

اور حقیت بھی یہی ہے توکل کا یہ مطلب نہیں کہ انسان بے عمل ہو جائے بلکہ توکل کا اصل مقصد انسان کو صرف اس بات کا احساس دلانا ہے کہ اللہ ہی حقیقی معنی میں اس کا معاون و مددگار ہے اور اس کی کوشش ہی اس کی کامرانی کا ذریعہ ہے۔ شعر ہے:

جو آبرو کا ہے طالب تو کر عرق ریزی　　یہ کش مکش ہوئی تب پھول سے گلاب بنا

ہم معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ بعض افراد کا تساہلی اور کاہلی سے گہرہ رشتہ قائم ہوجاتا ہے اوران کے یہاں عمل کی کوتاہی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے وہ ترقی کی شاہراہ پر گامزن رہنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ میر انیسؔ اپنے سلاموں میں جگہ جگہ دعوتِ عمل دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

سوؤ گے کب تک بس اب اٹھو انیسؔ　　دن بہت غفلت میں تھوڑا رہ گیا

ایک بڑا شاعر کسی کی نکتہ چینی نہ کرتے ہوئے خود کو اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ وہ خود سے مخاطب ہے لیکن اس کا خطاب ساری دنیا کے باشندگان سے ہوتا ہے۔ اسی طرح انیسؔ ایک مقام پر کہتے ہیں:

بھٹک کے راہ سے پیچھے کہیں نہ رہ جاؤ　　اٹھو انیسؔ اٹھو ، قافلہ روانہ ہوا

وہ مسلسل اپنی ذات سے خطاب کرتے ہوئے معاشرے کے خوابیدہ نفوس کو بیدار کرنے کا کام کرتے ہیں۔ شعر ہے:

کوئی بھی سوتا ہے پیری میں اس طرح غافل　　اٹھو انیسؔ اٹھو ، سر پہ آفتاب آیا

یعنی ان کے یہاں عمل کا دور صرف جوانی میں ہی نہیں بلکہ ان کا خیال ہے کہ بشر کو پیری میں بھی سرگرمِ عمل رہنا چاہئے اور یہ عمل دنیا کی کامیابی کے لیے بھی ہوسکتا ہے آخرت کے حصول کے لیے بھی۔

انیسؔ معاشرے کی فضاؤں کو خوبصورت، دلکش اور آسودگی بخش دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ امن وآشتی کو بشریت کا تقاضہ سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

وہ ہے آدمی ، جس سے ہو کارِ خیر　　بشر وہ ، جو دنیا میں بے شر رہے

یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اس دنیا میں کبھی کسی انسان پر ایک جیسے حالات نہیں رہتے وہ عروج وزوال اور رنج وغم کی وادیوں کا مسلسل شکار رہتا ہے۔ اس لیے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ شکوہ وشکایت لب پر نہ لائے بلکہ ہمہ وقت اپنے معبودِ حقیقی کا سپاس گزار رہے۔ شعر ہے:

راحت خدا نے دی تو کیا تو نے شکر کب　　ایذا بھی چار دن ہو تو شکرانہ چاہئے

ان کا خیال ہے کہ جو باشعور شخص ہوتا ہے یا جس کا ذہن ہمیشہ فکرِ عقبیٰ کی وجہ سے بیدار رہتا ہے وہ موت سے غافل نہیں ہوتا۔ یعنی دنیا داری میں اپنے قیمتی اوقات ضائع نہیں کرتا۔ کہتے ہیں:

کب آئے موت ، خدا جانیے طلب کب ہو　　جو شہوار ہے ، پا در رکاب رہتا ہے

ان کے یہاں عمل کے ساتھ ساتھ صبر وتحمل کا پیغام بھی عام طور سے نظر آتا ہے یعنی وہ چاہتے ہیں کہ ہزار صعوبتوں کے باوجود آدمی کو حوصلہ قائم رکھنا چاہئے اور حیات وکائنات میں پرعزم طریقے سے اپنی ہستی کا بھرم رکھنا چاہئے۔ شعر دیکھیں:

ثابت قدم رہے ، رہِ حق میں مثالِ شمع　　گردن سے سر جدا ہو تو پروانہ چاہئے

گویا کہ مایوسی وناامیدی ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی اور یہی درس وہ معاشرے میں بھی عام کرتے ہیں کہ ایک در کے بند ہونے پر سو در کھل جاتے ہیں۔ کہتے ہیں:

صورتِ آئینہ استغنا کے جوہر کھل گئے　　ایک در ، ہم پر ہوا گر بند ، سو در کھل گئے

ان کا اس بات پر یقینِ کامل ہے کہ کوئی کمترین انسان یا اسفل انسان اعلیٰ ظرف شخصیات کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یعنی باطل کبھی حق پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس بات کو وہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ علامتوں اور استعاروں کے جامے میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

محال ہے غلبہ اسفلوں کا اعلیٰ پر　　زمیں کا زور بھلا خاک آسماں سے چلے

ان کے یہاں ہمیشہ مثبت فکر کارفرما نظر آتی ہے اور وہ منفی افکار کو اپنی جانب بھٹکنے بھی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں:

راست بازوں کو دُرِ مقصود مل جاتا ہے جلد　　جو کہ ہے سچّی صدف ، وہ بے گہر ہوتی نہیں

وہ معاشرے کی مختلف خرابیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جس میں جہلا غیر ضروری طور پر علماء پر فوقیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور علماء سے بحث پر آمادہ رہتے ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ عالم کو جاہل سے بحث و تکرار سے بچنا چاہئے۔ شعر ہے:

اپنی زباں سے پوچھ خموشی کی لذتیں　　جاہل سے اعتراض پہ جھگڑا نہ چاہئے

ان کا ماننا ہے کہ بعض مواقع پر خموشی سے زیادہ پُر اثر کوئی زبان نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں:

ضبط دیکھو سب کی سن لی اور نہ کچھ اپنی کہی　　اس زباں دانی پہ ایسے بے زباں پیدا ہوئے

لیکن وہ خموشی کی لذت کے ساتھ ساتھ بعض مرتبہ خموشی کی وجہ سے ہونے والی تکلیف کا بھی شعور رکھتے ہیں۔ شعر ہے:

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر　　کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

حسن و جمال کی جانب متوجہ ہونا بھی انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ اس کا نفس اسے کائنات کی خوبصورتی کی طرف مسلسل آمادہ رہنے کی دعوت دیتا رہتا ہے لیکن جو پاک بیں ہوتے ہیں یعنی جن کی نگاہ گناہوں سے آلودہ نہیں ہوتی وہ اپنے آس پاس میں بکھرے ہوئے مجازی حسن و جمال کے سحر میں حقیقی حسن کی نمود حاصل کر لیتے ہیں۔ شعر ہے:

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو　　خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

یعنی انیسؔ کسی طور معاشرے کو گناہوں کی آماجگاہ نہیں دیکھنا چاہتے اور مسلسل تقویٰ اور پارسائی کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ اسی قبیل کا ایک اور شعر ملاحظہ کریں:

بشر کو چاہئے دنیا میں اس کے حسن کا عشق　　وہ جس نے خلق میں پیدا کیا حسینوں کو

وہ چاہتے ہیں کہ انسان ہمیشہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتا رہے تاکہ اصل مقصدِ حیات سے نہ بھٹکنے پائے۔ شعر ہے:

ہر نفس آئینۂ دل سے یہ آتی ہے صدا　　خاک تو ہو جا ، تو حاصل ہو جلا میرے لیے

ان کا خیال ہے کہ انسان کے لئے احساسِ گناہ لازم ہے تاکہ وہ اپنی اور اپنے معاشرے کی اصلاح کر سکے۔ شعر ہے:

جو ہوا تر دامنی سے منفعل　　اشک دامن میں بھگوتا ہی رہا

لیکن اسی کائنات میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی حیات اپنی ہستی اور اپنی زندگی کی قیمت نہیں سمجھتے اور اسے رائیگاں کر دیتے

ہیں۔ایسے لوگوں کے لئے انیسؔ نے کہا ہے:

نہ کی آہ کچھ عمرِ رفتہ کی قدر　　عجب جنس کو رائیگاں کر دیا

انیسؔ انسانی نفسیات پر عمیق نگاہ رکھتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ جو انسان لگا تار نشیب وفراز سے دوچار ہوتا رہتا ہے اور خود پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے تو معمولی سے معمولی واقعات اسے خوف زدہ کر دیتے ہیں۔شعر ہے:

بلا کسی طرف آئے گی ، رخ ادھر ہوگا　　نشانہ ہوں گے ہمیں تیر جس کماں سے چلے

کہیں کہیں انیسؔ کے یہاں طنزیہ لہجہ بھی در آیا ہے۔روایتی شاعری میں آسمان انسان کا دشمن ہے اس کے دامن میں موجود ستاروں اور سیاروں کی گردش سے انسانی زندگی کا تعلق بتایا جاتا ہے۔جس کو بالفاظِ دیگر تقدیر کا نام دیا گیا ہے۔

گویا کہ آسمان انسان پر ستم ڈھاتا ہے۔اب اس ضمن میں شعر دیکھیں:

اب زمیں کا پیار باقی ہے فقط　　آسماں کی مہربانی دیکھ لی

میرا خیال ہے کہ میر انیسؔ کے سلاموں کا مطالعہ مختلف زاویوں اور پیرایوں سے کرنے کی ضرورت ہے۔وہ محض رونے اور رلانے کی بات ہی نہیں کرتے بلکہ اصلاحِ قوم اور اصلاحِ معاشرہ بھی کرتے ہیں۔ان کے سلام محض خاص مجالس تک محدود نہیں بلکہ وہ رزم وبزم دونوں مقامات پر اپنے فن کا لوہا منواتے ہیں۔جس طرح کائنات مختلف اشیاء اور صورتوں کے ساتھ رواں دواں ہے اسی طرح ان کے سلام بھی اپنے آپ میں وسعتِ کائنات رکھتے ہیں۔جن میں معاشرے کی تلخ حقائق کی سچی تصویریں بھی ہیں اور سماج کے لیے ایک پیغام بھی۔ان کے دامن میں اس حوالے سے قنوطیت نہیں بلکہ رجائیت کارفرما ہے۔اس لیے انیسؔ رثائی ادب کے بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نباضِ وقت اور مصلحِ قوم وملّت بھی ہیں۔

❁❁❁❁

دبیرؔ کے مرثیے
(جلد ششم)
زیرِ طبع
اصغر مہدی اشعر

دبیرؔ کے مرثیے
(جلد پنجم)
شائع ہوگئی ہے
اصغر مہدی اشعر

مونسؔ کے مرثیے
(جلد اوّل تا سوم)
زیرِ طبع
ترتیب وتدوین
اصغر مہدی اشعر

انیسؔ کے گلستانِ سخن کی تہذیبی مہکار

پروفیسر شاہدہ حسن

مری قدر کر اے زمینِ سُخن　　تجھے بات میں آسماں کردیا
سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر　　مگر ہم نے پلّہ گراں کردیا
(میرانیسؔ)

شاعری محض فن نہیں۔ یہ اک ایسا تخلیقی ہنر ہے جس کے ذریعے ایک مخصوص تہذیب، سماج اور زمانے کے جوہر خاص کو پرکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ اس نکتے کو بہت سے نقادانِ ادب وشعر نے اپنے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

میتھیو آرنلڈ کا کہنا ہے ''شاعری ہمارے لیے زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے انسانی تجربات کی بے حد سچی اور واضح تفصیلات مہیا کرتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس عہد کی مخصوص معاشرت، رسوم ورواج اور افکار کو بھی آئینہ دکھاتی جاتی ہے''

ٹی ایس ایلیٹ کا خیال ہے ''شاعری تخلیقی صناعی کا اک ایسا تہذیبی اور تاریخی نمونہ ہے جو اپنے عہد اور مکانی اقدار، مسائل اور اخلاقیات سے آگاہ کرکے ہمیں اس خاص معاشرہ کے اجتماعی شعور تک رسائی فراہم کرتا ہے''

این کارسن Anne Carson کا نقطہ نظر ہے: ''شاعری اپنے عہد کی روح کو مجسّم کردیتی ہے۔ یہ انفرادی تجربات کو وسیع تر سماجی اور ثقافتی سیاق وسباق کے پیچیدہ تعامل کے ذریعے اس طرح پیش کرتی ہے کہ وہ اُس زمانے کی عکاس بن جاتی ہے جس میں وہ تخلیق کی گئی ہو''۔ اسی طرح ہم اسی نقطہ نظر کی حمایت میں دیگر اہم نقادوں مثلاً Northrope Frye,Robert Pinskey,Auden اور Harold Bloom کے بیانات بھی پڑھتے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے الفاظ اور اسلوب میں ہر سچّے اور بڑے شاعر کو اپنے سماج اور تہذیب وزمانے کا نمائندہ قرار دیا ہے۔

اردو کے ممتاز شاعر میرانیسؔ کے جہانِ شعر کو پرکھیں تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے ادب کی آفاقی دردمندی کو بے حد خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ اپنے تخلیقی اظہار کا حصّہ بنایا ہے مگر ان کی شاعری کی اس عظمت ورفعت کو سراہنے میں اور اس کا اعتراف کرنے میں ابتدا سے لے کر آج تک بے حد تنگ دلی کا مظاہرہ کیا جاتا رہا۔

میرانیسؔ کی شاعری سے میں بچپن ہی میں متعارف ہوچکی تھی۔ ابتدائی طور پر میں نے ان کا کلام اپنے گھر میں منعقد ہونے والی مجالس میں سنا اور پڑھا تھا۔ غالباً میں ساتویں یا آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی۔ ان دنوں مجھے بار بار پڑھے اور سُنے جانے کی وجہ سے ان کے کلام کے کچھ حصے زبانی بھی یاد ہوگئے تھے۔ یہ ایک بند اب بھی یاد آتا ہے:

گرمی کا زور جنگ کی کیونکر کروں بیاں　　ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لُو کہ الحذر ، وہ حرارت کہ الاماں　　رن کی زمیں تو سُرخ تھی اور زرد آسماں
آبِ خُنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

گرمی اور لُو کی اس شدید کیفیت کا بیان عام طور پر مجھے دس محرّم کی تپتی ہوئی دوپہر کو اس وقت ضرور یاد آتا تھا جب عاشقانِ امام حُسینؑ کی کثیر تعداد، کراچی کی جھلسا دینے والی شدید گرمی میں، مجلسِ عاشورہ میں شرکت کے بعد آہستہ آہستہ تپتی سڑکوں پر قدم بڑھاتے جلوسِ عاشورہ کی صورت گزر رہی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی میں بھی اس جلوس میں موجود ہوتی تھی جس میں میرے ابّو سیاہ کُرتے میں ملبوس، ننگے سر، ننگے پاؤں، ماتم کناں واشک فشاں چلتے رہتے تھے ایسے میں مجھے دشتِ کربلا کی اس قیامت خیز تپش میں آلِ رسولؐ پر گزرنے والی مصیبتیں بے حد یاد آتی رہتی تھی۔ انیسؔ کی معجز بیانی ہے کہ انھوں نے ہماری تاریخ کی بہت سی بیتی ہوئی ساعتوں کو اپنے خامہء خوش نہاد سے دائمی زندگی عطا کردی ہے۔ اب وہ زمانے اُن کی شاعری میں بولتے رہتے ہیں۔

ہمیں یہ ضرور سمجھنا چاہئے کہ شاعری نہ تو مذہب اور عقیدہ ہوتی ہے نہ ہی کوئی فلسفہ یا تاریخ۔ مگر شاعری کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ اس میں عقائد، انسانی تاریخ وتہذیب اور فلسفہ سب ہی سما جاتے ہیں۔ کسی معاشرے اور کسی ماحول میں پائے جانے والے تہذیبی رویّے کبھی جامد نہیں ہوتے۔ تہذیبیں جب بھی ایک دوسرے سے گلے ملتی ہیں، ان میں گزرتے ہوئے وقت کے تعامل کے ساتھ تبدیلیوں کا پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے اور یہ ایک مستقل عمل ہوتا ہے۔ میر انیسؔ کے حوالے سے اگرچہ کئی مطالعات اور تجزیے وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے ہیں مگر افسوس یہ رہا کہ زیادہ تر توجہ ان کے مرثیوں کے متن میں پائے جانے والے مخصوص مذہبی عقائد اور بیان کردہ تاریخی واقعات کے بیانیہ رخ تک محدود رکھّی گئی اور انھیں جہانِ ادب وشعر کے اک جلیل القدر تخلیق کار کے طور پر اس طرح سراہا نہیں گیا، جیسا ان کا حق تھا۔ ظاہر ہے عقائد میں انحراف کی تو کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انیسؔ کا کام مرثیہ نگاری تھا اور وہ سانحہ کربلا اور شہادتِ عظمیٰ کی تفصیلات وواقعات کو پیش کرتے ہوئے جو مرثیوں کا مرکزی موضوع ہے تاریخ کے اوراق میں بیان کردہ واقعات ہی کو موضوع بنا سکتے تھے۔ پھر یہ کہ ان واقعات میں شامل کردار بھی ہماری عام معاشرتی زندگی کے کرداروں سے قطعی مختلف تھے اور ان کے کسی رویے یا ردِّعمل میں بھی کسی تبدیلی کا کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ ان کی پہچان خیر و شر کے نمائندوں کے طور پر پہلے سے طے شدہ تھی۔ کائنات میں خیر وشر کی یہ کشمکش ازل سے جاری وساری ہے اور قدرت کے اک طے شدہ نظام کے تحت یہ اپنے ہر متعیّن انجام کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔ لہٰذا میر انیسؔ کے شعری اظہار کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ہمیں ان کے جہانِ شعر کی کچھ اور مختلف جہتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ وہ کوئی معمولی درجے کے شاعر نہیں تھے۔ اک اعلیٰ اور تربیت یافتہ ذہن کے تخلیق کار تھے جو فطرت کی ودیعت کردہ تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ ان کی باطنی اور روحانی نمو اُن اعلےٰ وارفع ہستیوں سے ان کی عقیدت وقلبی ربط کا نتیجہ تھی جن کے ذکر کے لیے انھوں نے خود کو وقف کر رکھا تھا۔ مگر ہُوا یہ کہ تعصّباتِ زمانہ نے مسلسل اپنی تنگ نظری اور کوتاہ بینی رائج رکھی اور ان کی شعری عظمت کا اعتراف کرنے میں بے اعتنائی سے کام لیا۔

پہلا اہم کام شبلیؔ نعمانی نے کیا جب انھوں نے تقابلی تنقید کے حوالے سے اپنی کتاب موازنۂ انیسؔ ودبیرؔ کے نام سے پیش کی۔ اس تنقید و تجزیے میں سارا زور انیس کی شعریات پر دیا گیا تھا۔ شبلیؔ نے مرزا دبیر سے اس تقابل میں میر انیسؔ کی حمایت کی تھی اور انھیں دبیرؔ پر ترجیح دیتے ہوئے، ان کے الفاظ کی تراکیب، نشست اور بندش کو زیادہ سراہا تھا اور یوں اسی فرق کو بنیاد بنا کر بعد میں آنے والے نقّادوں نے بھی ان دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا۔ جبکہ ہر بڑے اور قابلِ ذکر شاعر کے پاس صرف زبان کا سرمایہ ہی نہیں ہوتا ہے اس کے

پاس اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کا مشاہدہ و تجزیہ، اپنے عہد اور تہذیب سے اُس کا ربط، اس کے افکار، اس کی جمالیات، عصری صداقتوں کے حوالے سے اس کا ردعمل اور بہت کچھ۔ اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ بلاغت وسوز وگداز اور اثر انگیزی میں میر انیسؔ کی انفرادیت مسلّم ہے مگر پھر یہ ہوا کہ بعد میں آنے والے تجزیہ نگاروں نے شبلیؔ کے اثرات کے تحت میر انیسؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے شعری متن اور ان کی زبان و بیان اور حُسنِ اظہار کی خوبیوں تک ہی خود کو محدود کیے رکھا اور کسی نے بھی اس طرف خاص توجّہ نہیں دی کہ میر انیسؔ کا تخلیقی ذہن کتنے آفاقی اور اعلیٰ خیالات کا حامل تھا۔ ان کی معجز بیانی محض ان کی بلاغت وسوز وگداز اور ان کے کلام کی اثر انگیزی میں پوشیدہ نہیں تھی بلکہ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے جہانِ اظہار میں اک پورے عہد کا اک ایسا تہذیبی مرقّع پیش کر دیا ہے جس میں اس عہد کے خدوخال، اس کی اقدار، اس کی روح مجسّم ہو کر ہمارے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔

اگرچہ میر انیسؔ کا تعلّق اک خاص عقیدے اور مذہب سے تھا مگر انھوں نے شہادتِ عظمیٰ اور امامِ عالی مقام کے تعلق سے اپنے عقیدے کی حدود میں رہتے ہوئے بھی تخلیقی سطح پر اپنے اعلےٰ افکار اور تصورات کو اک ایسی وسعت اور بالیدگی کے ساتھ پیش کیا کہ وہ تمام عالم انسانیت کے نمائندہ نظر آنے لگے ہیں۔ کسی سچے شاعر کی شاعری جمالیاتی بلندیوں سے ہم آہنگ ہو جائے تو ہر فلسفے، ہر عقیدے، ہر نظریے سے بہت آگے چلی جاتی ہے۔ عقیدت مندیاں ایک مخصوص گروہ تک محدود رہتی ہیں لیکن شاعر کی تخلیقی قوّت اگر اک پورے عہد اور پوری تہذیب کو گرفت میں لے لے تو وہ تمام عالمِ انسانیت کا نمائندہ بن کر سامنے آتا ہے۔ میر انیسؔ نے شہدائے کربلا اور پیغامِ حسینؑ ابنِ علی کی آفاقیت کو اردو شاعری کے لیے حق شناسی کی ایک بھرپور روایت میں ڈھال دیا۔ اُس فضا میں جہاں ناسخانہ رنگ میں محض بے رس اور بے جان غزلیں مسلسل لکھّی جا رہی تھیں میر انیسؔ نے تغزل کے سوز وگداز، دردمندی اور اپنے دھڑکتے ہوئے لہجے کی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ایسے ایسے اثر انگیز مسدّس رقم کیے ہیں اور قدرت کے عطا کردہ خزانۂ الفاظ اور سرمایۂ تخیّل سے ایسا سحر انگیز کام لیا کہ اک پوری تہذیب و معاشرت اپنے تمام تر خواص کے ساتھ زندہ نظر آنے لگی۔ ناسخیت کے اُس غلبے میں مرثیے کی صنف کا اپنی دھاک بٹھا دینا اور میکانکی اندازِ غزل کو پیچھے چھوڑ کر مرثیے کی جاذبیت کی طرف سب کی توجّہ مبذول کرا لینا میر انیسؔ اور ان کے ہم عصر مرزا دبیرؔ ہی کا کام تھا۔ میر انیسؔ نے یہ کام اپنے تخلیقی ہنر کی بدولت کیا۔ انھوں نے ناسخیت کے اجزا کی تقلیب کی۔ مرثیہ کہتے وقت مسدّس کے بندوں کو اس طرح قلمبند کیا کہ وہ قصیدے کے معیار کے مطابق آ گئے اور ان میں تغزّل کی خوبیاں پیدا ہو گئیں یوں مسدّس کو اک ایسی تخلیقی جاذبیّت مل گئی جس نے اسے بے حد اثر انگیز بنا دیا۔ انھوں نے عرب کی اک مشہور تاریخی داستان کے کرداروں کو لکھتے ہوئے اپنے تخیّل کی جادوگری اور اپنی تخلیقی ہنرمندی سے ایسے ایسے انوکھے رنگ بھرے کہ وہ سارے جیتے جاگتے کردار حق و انصاف اور خیر کے نمائندے بن کر اُس داستان میں شامل نظر آنے لگے جو ہندوستانی سماج کے پس منظر میں اپنے دکھوں کا بوجھ اٹھائے اور اپنے جان و مال کو لُٹاتے ہوئے اک ایسی قربانی میں شامل ہو گئے جو انسانی تاریخ میں اپنی کوئی اور مثال نہیں رکھتی۔ اب آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ عہد اور وہ تہذیب تھی کیا جو تاریخ کے تسلسل کے ساتھ میر انیسؔ کے حصے میں آئی تھی؟

میر انیسؔ کا زمانہ انیسویں صدی کی ابتدائی سات دہائیوں کا زمانہ تھا (غالباً ۱۸۰۲ء سے ۱۸۷۴ء تک کا) یہ زمانہ کلاسیکی اقدار و روایات کا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی جس تہذیب کو ہم اودھ کی تہذیب کے طور پر پہچانتے ہیں وہ دراصل لکھنؤ کی تہذیب تھی۔ شجاع الدّولہ کے بعد

اُن کے فرزند آصف الدّولہ نے فیض آباد کو چھوڑا اور لکھنؤ کو اپنا مرکز بنالیا۔تب لکھنؤ کو اک ایسا عروج نصیب ہوا تھا کہ دیگر شہروں کے صاحبانِ فن اور اہلِ کمال دیگر تمام شہروں کو چھوڑ چھوڑ کر یہاں منتقل ہونا شروع ہو گئے۔دہلی اگرچہ ہندوستان کا دارالسلطنت تھا مگر وہاں مُغل بادشاہوں کا وقار مٹّی میں مل چکا تھا۔وہ محض کٹھ پتلیوں کی مانند رہ گئے تھے اور ان کی تمام ڈوریاں انگریزوں، مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ان ساری سازشوں اور چیرہ دستیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کے لیے سکون کا سانس لینا دشوار ہو چکا تھا۔زندگیاں کھوکھلی ہو کر رہ گئی تھیں۔ہر جنگ میں ہزاروں جانیں تلف ہو جاتیں اور مرنے والوں کا نہ کوئی وارث ہوتا نہ پس ماندگان کا کوئی پُرسانِ حال۔لوگ اپنے امیر اور حاکم کو پسند کرتے تھے مگر معتوب ہونے کے ڈر سے اپنی آرا کے اظہار کی جرآت نہ کر پاتے تھے۔ایسے میں جب کہ ملک کے بیشتر حصوّں میں جنگ اور انقلاب کے شعلے بھڑک رہے تھے لکھنؤ جیسا شہر بھی ان کی لپیٹ میں آ کر اک بڑے محاذِ جنگ میں بدل چکا تھا۔لکھنؤ میں انیسویں صدی کی پہلی دو ڈھائی دہائیاں ضمیرؔ، دلگیرؔ، فصیحؔ اور خلیقؔ (انیسؔ کے والدِ محترم) کے عروج کا زمانہ ہے۔ان کے بعد آنے والے دور میں انہی کے طے کردہ اصولوں کے پس منظر میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے اپنی اپنی رثائی کائنات ترتیب دینا شروع کی۔خاص طور پر میر انیسؔ نے کلاسیکی مرثیے کے تمام تر تخلیقی امکانات کو انتہائی بلند مقام تک پہنچا دیا۔

انیسؔ کے زمانے میں رقص و موسیقی کا فن بھی اپنے عروج پر تھا ہر فن میں اصولوں اور معیارات کی سخت گیری رائج تھی۔یہ شہ سواری و تیغ زنی کے فنون کو اختیار کرنے کا عہد تھا جہاں شرفا کے خاندانوں میں ان فنون کی تربیت بہت عام تھی۔میر انیسؔ نے بھی سپہ گری اور شہ سواری کے فنون سیکھے۔ابتدا میں غزلیہ شاعری کی لیکن اپنے والد کی ہدایت پر وہ بہت جلد مرثیہ نگاری کی طرف مائل ہو گئے اور پھر اسی پر توجہ مرکوز رکھی صنفِ غزل کی طرف دوبارہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔یہ انیسؔ کی شعری عظمت ہی تھی جس کی بدولت انھوں نے اُس عہد کی تہذیب و ثقافت کی تمام تر نفاستوں اور شائستگی کو عمدگی کے ساتھ اپنے مرثیوں کے ذریعے پیش کر دیا۔ان مرثیوں کو پڑھتے اور سنتے ہوئے ہمیں اس خاص تہذیبی تصویر کو دیکھنے اور اس جاگیردارانہ دور کے مخصوص آدابِ نشست و برخاست کو سمجھنے کا موقع بھی ملتا ہے جو سماج میں نہ صرف رائج تھے بلکہ انتہائی اہمیت کے حامل بھی سمجھے جاتے تھے۔اس زمانے میں درباروں میں بادشاہ اور امرا کے سامنے آنے، ان کے سامنے حاضر ہونے، بیٹھنے یا کھڑے ہونے، گفتگو کرنے، درخواست پیش کرنے، حکم کا انتظار کرنے اور دربار سے واپس جانے کے کچھ خاص آداب ہوتے تھے۔واقعۂ کربلا کا اصل تہذیبی پس منظر اگرچہ بالکل مختلف تھا لیکن میر انیسؔ نے اسے اپنے زمانے اور سماج سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے بھرپور شعری تخیّل سے کام لیا اور اسے اپنے سماج کے تہذیبی پس منظر سے جوڑ کر پیش کیا۔یہ ہے وہ عصری قوت اور عصری آگہی جس سے کسی عہد میں تخلیق کی جانے والی تحریروں کو پہچانا جاتا ہے۔

میر انیسؔ کے ذوقِ شعری کی ایک منفرد جہت یہ ہے کہ اگرچہ انھوں نے اپنے مرثیوں کی بنیاد عقیدے پر رکھّی مگر ان کی شاعرانہ عظمت کی داد اسی وقت ممکن ہوگی جب ہم اس عقیدے کی اصل کو پہچانیں گے۔میر انیسؔ کا عقیدہ، پورے عالمِ انسانیت کا عقیدہ ہے یعنی وہ عقیدہ جو انسان کو اس کے اعلیٰ ترین مقاصدِ حیات کا ادراک بخش کر اسے free man کے تصور سے جوڑ دیتا ہے اور ہر سماج میں جبر و ظلم کے خلاف بھرپور جدّ و جہد کا حوصلہ بخشتا ہے جو انسان کو مسلسل تلاش و جستجو کی خاطر پیش قدمی کی دعوت دیتا ہے۔جو اسے امن و امان کے ساتھ رہنے اور

تمام انسانوں سے محبّت اور حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آنے کی ترغیب دیتا ہے۔امام حسینؑ،ان کے اہلِ بیتؑ،ان کے رفقا اور جاں نثاروں سے بڑھ کر حوصلہ مند بھلا کون ہوگا جو ظالموں کے نرغے میں گھر کر بھی آخری سانسوں تک ظالموں اور قاتلوں کو پیغامِ خیر دیتے رہے اور ان کے دلوں میں انسانیت تلاش کرتے رہے۔یہ اخلاق وعمل کی وہ اعلیٰ قدریں تھیں جن پر تمام عالمِ انسانیت کو فخر ہونا چاہئے۔میر انیسؔ نے مرثیے کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ انسانیت کے عقیدے کو اگر کوئی بلند ترین سطح پر دیکھنا چاہیئے تو اسے چاہیئے کہ وہ میدانِ کربلا میں آئے اور امام حسینؑ کے عزیز واقربا اور جاں نثاروں کے عمل وکردار کو دیکھے کہ وہ کس کس انداز میں انسانی فلاح وخیر،امن پسندی اور محبّت کا پیغام بانٹ رہے تھے اور اپنے عقیدے کی بہاریں دکھا رہے تھے۔دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ہمیں عقیدہ کو بنیاد بنا کر سامنے آنے والی شاہکار تخلیقات مل جاتی ہیں مثلاً ملٹن کی Paradise Lost،دانتے کی Divine Comedy اور کئی دیگر تخلیقات جس میں ہندوستان کی قدیم منظوم داستان مہابھارت کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے لیکن یہاں خیر وشر کے معرکے میں جو کردار شامل ہیں وہ حقیقی نہیں بلکہ شاعرانہ تخیّل کی پیداوار ہیں جن میں شاعر جب چاہے اپنے تصوّر سے کوئی بھی رنگ بھر کر اپنا مقصد پورا ہوتا دکھا سکتا ہے جبکہ میر انیسؔ کے مرثیوں کے تمام کردار حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے انسان ہیں لہذا ان انسانوں کے عقیدے کی شان اور ان کا جلال وجمال بھی حقیقی انسانی رویوں اور اعلیٰ ترین اقدار کی نمائندگی کرتا ہے۔

جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق علمِ طبیعات میں چوتھی Dimension وقت یعنی زمانہ ہے اور یہ ہر شے میں جاری وساری ہے۔اسی طرح انسان کے نفس کی تمام حسوں میں بھی وقت جاری وساری ہے اور انھیں سنبھالتا رہتا ہے یعنی انسان میں تلاش وجستجو کی حِس،اس کی اخلاقی حِس یعنی نیکی اور بدی میں تمیز رکھنے کی حِس،اس کی جمالیاتی حِس یعنی خود کو اور اپنے اطراف اور ماحول کو خوبصورت بنائے رکھنے کی حِس۔عقیدہ بھی حسِ جمالیات ہی کا سرچشمہ ہے۔امام حسینؑ اور ان کے اعزا اور رفقا کے اعلیٰ ترین کردار،ان کی گفتگو،ان کے رویے،ان کی تہذیب ووقار،بہترین انسانی اقدار کے وہ نمونے ہیں جن کی کوئی مثال انسانی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ان کرداروں کی عظمت عرش کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے مگر ان کے پاؤں دشتِ کربلا کی خاک ہی پر جمے نظر آتے ہیں۔امام حسینؑ کے انصار ورفقا کے اوصاف ومحاسن کے لیے انیسؔ کا یہ بیان دیکھئے:

فیّاض ، حق شناس اولوالعزم ، ذی شعور　　خوش فکر و بذلہ سنج و ہنر پرور و غیور

ساونت ، بُردبار ، فلک مرتبت ، دلیر　　عالی منش ، سبا میں سلیمانؑ ، وغا میں شیر

لب پر ہنسی گلوں سے زیادہ شگفتہ رُو　　پرہیز گار و زاہد و ابرار و نیک خُو

حضرت عباسؑ کے حوالے سے یہ طرزِ سُخن بھی منفرد ہے:

عاشق ، غلام ، خادمِ دیرینہ ، جاں نثار　　فرزند ، بھائی ، زینتِ پہلو ، وفا شعار

راحت رساں ، مطیع ، نمودار ، نامدار　　جرّار ، یادگارِ پدر ، فخرِ روزگار

صفدر ہے ، شیر دل ہے ، بہادر ہے ، نیک ہے
بے مِثل سینکڑوں میں ،ہزاروں میں ایک ہے

ان اوصاف اور اعلیٰ کرداروں سے ملیے جو حقیقی انسانی کردار ہیں اور ایک عالمی معاشرہ کا تصور کیجیے کہ اگر ہمارے اردگرد ایسے بلند کردار انسانوں کی کہکشاں سج جائے تو کیا یہ کرۂ ارض ہمارے لیے جنّت کا نمونہ نہ پیش کرنے لگے گا؟

اپنے مرثیوں میں کردار در کردار میر انیسؔ نے دل سوزی اور دردمندی کے ساتھ اک ایسا جہانِ احساس ترتیب دیا ہے جہاں ہم نا قابلِ فراموش مردوں اور اعلےٰ اوصاف کی حامل، لائقِ صد احترام خواتین سے ملتے ہیں۔ بی بی زینب سلام اللہ علیہا کے دونوں فرزند جب امام عالی مقام سے عِلم حاصل کرنے کے لئے تشریف لے گئے اور اُسے اپنا حق قرار دیا تو ہر چند یہ اقدام بی بی زینبؑ کی دلی آرزو کے مطابق تھا مگر ہندوستانی سماج کی تہذیب و روایت کے مطابق وہ ان الفاظ میں بچوں سے اپنے رنج و غم کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔

زینبؑ نے تب کہا کہ تمھیں اس سے کیا ہے کام　　کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امامؑ
دیکھو نہ کیجیو بے ادبانہ کوئی کلام　　بگڑوں گی میں ، جو لوگے زباں سے علم کا نام
لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے ہو یہاں علی اکبرؑ کو چھوڑ کے؟

سرکو ، ہٹو ، بڑھو ، نہ کھڑے ہو علم کے پاس　　ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہِؑ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہو تم مرے حواس؟　　بس قابلِ قبول نہیں ہے یہ التماس
رونے لگو گے تم جو برا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں؟

یہ ہے وہ تہذیب، وہ اصولِ حیات، وہ سرمایہ، وہ ورثہ جو رشتوں ناتوں کی تعظیم سے پہچانا جاتا ہے۔ میر انیسؔ اسی روایت اور اسی تہذیب کے پروردہ تھے اور انھی تہذیبی رویوں کے حُسن کو انھوں نے اپنے مرثیوں کی مجموعی فضا میں رچائے بسائے رکھا ہے۔

یہ موضوع ابھی تشنۂ تحریر ہے۔۔ اسے ابھی اور بہت سے زاویوں سے سوچا اور سمجھا جا سکتا ہے مگر اس تحریر کو اختتام تک لاتے ہوئے میں اچانک سوچنے لگی ہوں کہ ہماری یہ جدید ترین دنیا جس میں سرمایہ دارانہ نظام اپنے گہرے پنجے گاڑے بیٹھا ہے۔ جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہوش رُبا ایجادات نے ہمارے سماج کا سارا تہذیبی اور اخلاقی ڈھانچہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ جہاں نصف دنیا میں خوفناک جنگیں جاری ہیں اور طاقت کے بل بوتے پر ان گنت انسانوں کی زندگیاں خاک اور دھول میں بدل رہی ہیں۔ جہاں ننھّے بچوں کی کلکاریاں چشمِ زدن میں ایک ایٹمی دھماکے سے بجھ جاتی ہیں اور دنیا کے نصف حصے کو اپنی سرمستی و مدہوشی کے عالم میں ان تمام حادثات و سانحات کی کوئی پرواہ تک نہیں ہوتی تو ایسے میں کیا ہمارے عہد کو بھی انیسؔ جیسا کوئی ایسا جادو بیاں شاعر دوبارہ نصیب ہو سکے گا جو وجودِ انسانی کے ان تازہ معرکوں میں عصری آگہی سے وابستہ رہ کر، سانحۂ کربلا کے اصل مقاصد کو کچھ اس انداز سے اجاگر کر دے کہ بے رس شعری تخلیقات کے ڈھیر میں دبے ذہنوں میں، عظمتِ آلِؑ پیمبرؐ کا ادراک اور اسوۂ شبیریؑ کی پیروی کی تمنّا و آرزو سرایت کر جائے اور ہماری اجتماعی زندگی میں روحانی اور فکری توانائیوں کے سرچشمے ظہور کریں۔

❁❁❁❁

انیسؔ اور معترضینِ انیسؔ

پروفیسر سیّد علی عرفان

معترضینِ مراثی اور معترضینِ میر ببر علی انیسؔ کی ایک لمبی فہرست ہے۔جس میں ادباء ناقدین اور علماء تک شامل ہیں۔ان شخصیات میں سے کسی نے صنفِ مرثیہ پر اعتراضات کیے اور کسی نے مرثیہ نگاروں پر انگلیاں اٹھائیں۔لیکن انصاف کسی نے نہیں کیا۔کسی نے مرثیے کی تعریف میں لکھا کہ مردوں کی تعریف جس میں ممدوح کی موت پر تاسف اور افسوس بھی شامل ہو مرثیہ کہلاتا ہے۔تو کسی نے مرثیہ کی تعریف میں لکھا کہ یہ صنف صرف رونے اور رلانے کی چیز ہے۔اور اس میں اعتقاد اس قدر حاوی ہوتا ہے کہ مرثیہ کے کرداروں کی پیروی اور اقتداء کرنے کا تصور بھی دل میں نہیں آتا۔یا پھر ایسے اعتراضات ملے کہ جن میں یہ کہا گیا کہ مرثیے میں ایسے واقعے بھی نظم کیے جاتے جس کا تاریخ کی کتابوں میں نام ونشان تک نہیں ہوتا۔معترضین انہی اعتراضات پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر لکھتے ہیں کہ مرثیے میں مضمون ایک پُرزور مذہبی جذبے سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کے بیان میں وہ شاعرانہ صداقت ممکن نہیں جو رستم وسہراب کی داستان میں ہے اور شاعر وسامعین ایک زبردست مذہبی جذبے سے متاثر ہوتے ہیں اس لیے شاعر مرثیے کو جہاں محض شاعری تصور نہیں کرتا وہاں مرثیے کے سامعین یا قارئین بھی مرثیے کو معیارِ شاعری سے نہیں جانچتے ہیں۔

مذکورہ بالا کلمات ان بھاری بھرکم ادبی شخصیات کے ہیں جن سے مرثیے کا دامن گذشتہ زمانے میں اور حال میں بھی لہولہان ہو رہا ہے۔ان معترضین کا سیدھا سادہ سا جواب یہ ہے کہ انہوں نے نہ کبھی مرثیے سے انصاف کیا اور نہ کبھی بزمِ مرثیہ میں شرکت کی ہے۔ہر صنف کی طرح مرثیہ بھی ارتقاء پذیر رہا ہے۔لہٰذا غور سے دیکھا اور پڑھا جائے تو مرثیے کے موضوعات میں صرف رونا اور رُلانا ہی نہیں ہے بلکہ اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان تمام انسانی جذبات واحساسات کا اظہار بھی ملتا ہے جو ایک صحتمند معاشرے کے لیے ضروری ہے۔پھر کل اور آج بھی مرثیے میں صرف شہادت اور بین کا حصہ نہیں ہوتا۔اگر تمام مراثی کا جائزہ لیا جائے تو ۳۰ فی صد ہی شہادت اور بین کے حصّے ہوں گے۔بقیہ ۷۰ فی صد میں چہرہ سراپا اور رجز اور رزم کے حصّے ملیں گے۔نیز یہ بھی اعتراض غلط ہے کہ مرثیے میں جو واقعہ (بالخصوص جناب قاسمؑ کی شادی کا بیان) نظم ہوتا ہے وہ تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔پہلے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ مرثیہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے اور نہ اسے لکھنے والا کوئی تاریخ نویس ہے بلکہ مرثیے کا تعلّق شاعری سے ہے اور اس کا خالق شاعر ہوتا ہے جو اپنے تخیّل کے زور پر اس صنف کے تانے بنے بنتا ہے۔تاریخ میں ایسے ہزاروں واقعات ہیں جو بعض کے نزدیک ضعیف کہلاتے ہیں۔لیکن مرثیے میں گریہ چونکہ مآلِ مجلس سمجھا جاتا ہے اس لیے اکثر مرثیہ نگاروں نے مصائب میں شدّت پیدا کرنے کے لیے کبھی کبھار ایسی ضعیف روایتوں کا سہارا لیا ہے۔اس سے صنفِ مرثیہ پر تو کوئی آنچ نہیں آتی ہے اور آنا بھی نہیں چاہیے۔صالحہ عابد حسین بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ:

''یاد رکھنے کی بات بھی ہے کہ انیسؔ شاعر ہیں مورّخ نہیں۔انہوں نے واقعۂ کربلا کی تاریخ بیان نہیں کی بلکہ بنیادی واقعات کو لیکر تخئیل کی آنکھ سے ان مناظر کو شاعر نے دیکھا اور اپنے باکمال قلم سے اُس کی جیتی جاگتی تصویر کشی کی کہ وہ حقیقت کے رنگ میں ڈوبی محسوس ہونے لگی۔

(انیسؔ کے مرثیے مقدمہ صفحہ ۴۹)

مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کے دامن پر ایسے کئی اور بھی اعتراضات کئے گئے ہیں جس سے قطع نظر کرتے ہوئے موجودہ دور کے صرف اس اعتراض کا ذکر کیا جاتا ہے جو کسی کُندۂ ناتراش کے پیدا کردہ ہیں۔ میر انیسؔ کے متعلق یہ کہا گیا کہ انہوں نے اپنے کلام میں متروک الفاظ مثلاً ''رانڈ'' کا استعمال کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ اگر آج میر انیسؔ ہوتے تو میں ان سے رانڈ کی جگہ لفظِ ''بیوہ'' کو استعمال کرنے کے لیے کہتا تو وہ خوشی خوشی اسے قبول کر لیتے۔ اس کندۂ ناتراش کے خیال میں کتنا جھول اور خودنمائی پوشیدہ ہے اسے اہلِ نظر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ صالحہ عابد حسین نے شاید ایسے ہی لوگوں کے لئے لکھا تھا کہ:

''میر انیس کے کلام پر جتنی گہری نظر ڈالیے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں ان کی شاعری میں وہ صلاحیت تھی جس کے لیے ''جُز ویست از پیغمبری'' کہا گیا ہے اور جس صلاحیت سے انہوں نے بھرپور کام لیا، اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ اس کی لطافت، سلاست انہوں نے ماں کے دودھ کے ساتھ پی تھی۔ اس میں انہوں نے لُوریاں اور کہانیاں سنیں اور اس طرح بچپن ہی سے اسکی کہاوتیں، محاورے، روزمرہ نے کانوں میں رس گھولا انیسؔ کا کلام پڑھنے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہیں زبان و بیان دونوں پر بے پناہ قدرت حاصل ہے انیسؔ کے پاس محاوروں، کہاوتوں، تشبیہوں، استعاروں، کنایوں اور بے تکلّف بولے جانے والے الفاظ کا بے کراں خزانہ تھا۔ ان کا کلام پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ لاکھوں جواہر پارے اس کلام کے جوہری کے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ جس وقت جس کی ضرورت ہوتی ہے وہ اُسے اُٹھا کر صحیح جگہ پر بٹھا دیتا ہے۔ ایسا کہ جیسے انگوٹھی پر ہیرا جڑ دیا گیا ہو۔ (انیسؔ کے مرثیے، جلد اول، صفحہ ۵۶-۵۷)''

شبلیؔ نعمانی نے بھی انیسؔ کی اس خوبی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ:

''میر انیس نے ۷۲ برس کی عمر پائی - ان کی ابتدائے مشق میں قدیم محاورے اور غلط الفاظ نہایت کثرت سے متداول تھے اور شعراء بے تکلف اُن کو استعمال کرتے ہیں۔ شیخ ناسخؔ نے البتہ اس قسم کے تمام الفاظ کو ترک کر دیا تھا، لیکن جو لوگ دلّی کی طرف منسوب کرتے تھے وہ ان الفاظ اور محاورات کو وطن کی یادگار سمجھتے تھے۔ چنانچہ غالبؔ و ذوقؔ جو خاتم الشعراء ہیں ان کے ہاں وہ الفاظ بے تکلّف ملتے ہیں جن کو شیخ ناسخؔ مدّتوں سے چھوڑ چکے تھے۔ مثلاً مرزا غالب فرماتے ہیں

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں

حالانکہ اس قسم کی جمع ایک مدّت سے متروک ہے۔ اس قسم کے الفاظ میر انیسؔ کے ہاں بھی ہیں اور کثرت سے ہیں لیکن وہ ابتدائی مشق کے ہیں ورنہ شیخ ناسخؔ کے اثر یا خود مذاق کے بدلنے سے جس قدر زمانہ گزرتا گیا میر صاحب قدیم مخصوص الفاظ اور تراکیب چھوڑتے گئے۔

(موازنہ انیسؔ و دبیرؔ از شبلیؔ نعمانی صفحہ ۴۱ اور ۴۲)

اور جنابِ والا اعتراض صرف متروک الفاظ تک محدود ہوتا تو کوئی بڑی بات نہ ہوتی کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ لفظیں ایک زمانے کے بعد خود بہ خود متروک ہو جاتی ہیں یا پھر ایک دبستان میں لوگ کسی طرح ایک لفظ کو بولتے ہیں اور وہی لفظ دوسرے دبستان کے لوگ دوسری طرح

ادا کرتے ہیں۔لیکن اعتراض کرنے والا ناقدین کی تمام صفوں کو چیرتے ہوئے خودنمائی میں اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے عیب جوئی اور تنقیص کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔معترض یہ کہتا ہے کہ میر انیسؔ کے بعض بعض بند ایسے ہیں جس سے سیدالشہد علیہ السلام کی شان میں گستاخی ہوتی ہے۔لہٰذا ایسے سنگین اعتراض کا جواب دینا نہایت ضروری تھا۔اس سلسلے میں بھی شاعرِ آلِ محمدؐ حضرت نسیمؔ امروہوی کا جواب نقل کیا جاتا ہے جو لاجواب ہے کہ:

''میر انیسؔ اعلیٰ اللہ مقامہ کے کلام کی کیفیت جو کلیتہ مراثی وغیرہ پر مشتمل ہے،اس سے بالکل مختلف ہے کیونکہ ان کے کلام میں شروع سے آخر تک ایک بھی ایسا شعر نظر نہیں آتا (الّا ماشاءاللہ) جسے نظری کر کے چھوڑ دیا جائے،اگرچہ ناقدین نے نقد ونظر کے مباحث کی ضرورت کے مطابق اُن کے کلام کا جو انتخاب کیا ہے اور اُس انتخاب میں جو اشعار اُنہوں نے چھوڑ دیئے ہیں اُن کا درجہ بھی منتخب شعروں سے کچھ کم نہیں۔ بلکہ بعض حالات میں وہ محاسنِ شعری کے اعتبار سے منتخب شدہ اشعار سے بھی زیادہ لطیف تر ہیں۔مثال کے طور پر انیسؔ کے ایک نقّاد نے اُس مرثیے کے انتخاب میں جس کا مطلع یہ ہے

کنعانِ محمدؐ کے حسینوں کا سفر ہے

میر انیسؔ کی یہ بیت شاملِ انتخاب نہیں کی

ہوجائیگی صحت جو عطائے شہِؑ دیں ہے　　اب تو مرے منھ کا بھی مزا تلخ نہیں ہے

یہ شعر جن خوبیوں اور لطافتوں پر مشتمل ہے وہ اربابِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔اور شاعر نے جس مشکل اور پیچیدہ تر مرحلے کو سیدھے سادے لفظوں میں طے کرلیا ہے،اس کی نزاکت کو اذہان نکتہ رس خوبیوں سمجھتے ہیں۔شاعر کا موضوع امام حسین علیہ السلام کی بیٹی حضرت فاطمہ صغراؑ ہیں جنہیں امام علیہ السلام تپِ شدید کی حالت میں ان کی دادی (حضرت اُمّ البین اور نانی اُم المومنین اُم سلمہ) کے پاس مدینے میں چھوڑ کر باقی پورے کنبے کے ساتھ سفر میں تشریف لیے جارہے ہیں۔ بیٹی مضر ہے کہ مجھے بھی ساتھ لے چلیے۔امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ تم بیمار ہو، بیماری میں سفر کی تکان سے مرض اور بڑھے گا۔مذہبِ شاعرانہ اور بلاغتِ فن اس بات کی مقتضی ہے کہ موضوع مرثیہ یعنی حضرت صغراؑ کی بات سب پر غالب رہے۔کیونکہ اگر اُسے مغلوب ہوتے دکھایا گیا تو موضوع کا حق ادا نہ ہوا۔لیکن اپنے عقیدے کے اعتبار سے شاعر،امام علیہ السلام کے ارشاد کی مغلوبیت تسلیم نہیں کرسکتا۔دوسرے لفظوں میں فنِ شاعری اور عقیدے کی اس کشاکش سے گزرنا کچھ آسان کام نہیں اس لیے شاعر نے اپنے موضوعِ سخن یعنی حضرت فاطمہ صغراؑ کی زبان سے ایک ایسی بات کہلوادی جسے فطرتِ انسانی کی نگاہ میں دوسرا شخص چاہے وہ طبیبِ حاذق ہو یا مسیحائے زماں اُن سے بہتر محسوس نہیں کرسکتا،یعنی یہ کہ

اب تو مرے منھ کا بھی مزا تلخ نہیں ہے

جس کا منھ ہے وہی سب سے بہتر طور سے جان سکتا ہے کہ اُس کا مزا پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے۔یہ اندازِ بیان اختیار کرنے سے امامؑ کے اس ارشاد کی (نعوذ باللہ) تردید بھی نہیں کہ ''تم تپ میں مبتلا ہو'' مگر بیماری پر بحث کرنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی کیونکہ تپ کا مریض خود کہہ رہا ہے کہ میرے منھ کا مزا اب تلخ نہیں۔یعنی مرض ختم ہوگیا یا خاتمے پر ہے۔یہ اور ایسے ہی ہزارہا اشعار میر انیسؔ کے مرثیوں میں ہیں جو

ناقدین نے اپنے انتخابات میں شامل نہیں کیئے۔لیکن وہ اپنے دامن میں تخیّل اورفن کے انمول موتی لیے ہوئے ہیں۔
(مقصدِ طباعت ازشاعرِ آلِ محمدؐ حضرت نسیمؔ امروہوی مدظلہٗ انتخابِ مراثیِ میرانیسؔ صفحہ ۱۱ اور ۲ ناشر: عباس بک ایجنسی سن ۲۰۰۰ء)
اب کیا کیا جائے کہ کچھ بھاری بھر کم ادبی شخصیات کے مصر کلمات نے اردو مرثیے اور مرثیہ نگاروں کا دامن ہمیشہ تار تار کرنا چاہا۔ایسے میں ان معترضین کا مزید سیدھا سادہ سا جواب یہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی بزمِ مرثیہ میں شرکت نہیں کی ہے۔

لیکن یاد رہے کہ یہ معترضین اپنی پختہ دلیلوں اور شاعرانہ تخیلات سے ماورا کٹ حجتّی اور ذاتی پسند کو اوّلیت دیتے ہیں۔ان کے یہاں میر ببرعلی انیسؔ اور مرثیے سے بغض کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ پہلے تو ان معترضینِ انیسؔ کو تنقیص سے اجتناب فرمانے کی ضرورت ہے اور کُشادہ دلی سے اور اُس عہد اور ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے مدلّل تنقید کی کرنے کی ضرورت ہے۔

لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ یہ معترضین محنت کرنے کے بجائے اس سے فراریت اختیار کرتے ہیں اور خودساختہ ناقد بن کر معاشرے میں پراگندگی پیدا کرتے ہیں۔لہٰذا یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ معترضینِ انیسؔ کو صحیح سمت دکھائی جائے اور مرثیہ اور مرثیہ نگاروں بالخصوص میر انیسؔ کی شخصیت،فن اور خدمات کی روشنی میں ان کی تربیت کی جائے۔

میر ببرعلی انیسؔ کا خاندان چمنستانِ شعروادب میں کوئی عام خاندان نہ تھا۔تعلیم وتربیت سے لیکر مذہب کے اعلیٰ اقدار اور عشقِ ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم میں بلالؓ صفت نیز اہلِ بیتِؑ محمد کی معرفت رکھنے والا خاندان تھا۔ والدِ بزرگوار کی خواہش اور حکم کو تسلیم کرتے ہوئے میر انیسؔ نے سدا کے لیے اردو کی ہردلعزیز صنفِ غزل سے دستبردار ہوگئے۔ یہ بات کسی کو معمولی لگے تو لگے لیکن انیسؔ شناسی کے لیے یہی بات بڑی ہے کہ میر انیسؔ کو اہلِ بیتِؑ ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر محبّت تھی کہ انہوں نے اردو کی ہردلعزیز صنف غزل سے ہمیشہ کے لیے رشتہ منقطع کرتے ہوئے ایک ایسی صنف سے اپنا تعلق استوار کیا کہ اس دور میں اُس صنف سے اپنا رشتہ جوڑنا گویا اپنے مستقبل کو تباہ کرنے کے مترادف تھا۔ بقول صاحب انتخابِ مراثی انیسؔ کی انفرادیت اور نمایاں شخصیت اسی سے نمایاں ہے کہ لکھنؤ کے ماحول میں رہتے ہوئے بھی انہوں نے اُس وقت عام شاعرانہ رُجحان سے بیگانگی برتی اور ایک ایسی زمین کو سرسبز وشاداب کرنا شروع کیا جو ان سے پہلے خُشک و بےمزہ تھی۔جس کا احساس انیسؔ کو ابتدائی مشق ہی میں ہوگیا تھا۔

لیکن میر انیسؔ نے نہ صرف صنفِ مرثیہ کا ہاتھ پکڑا بلکہ اُسے اپنا خونِ جگر بھی پلاتے ہوئے باقاعدہ اس کی پرورش وپرداخت بھی کی۔اور یہی نہیں بلکہ مرثیہ خوانی کے فن کو بھی خوب خوب چمکایا اور نکھارا۔ میر انیسؔ پر اعتراضات کرنے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میر انیسؔ کوئی جزو وقتی مرثیہ نگار نہ تھے۔ بلکہ ان کا اٹھنا،بیٹھنا،سونا اور جاگنا سب سیدالشہد علیہ السلام کے لیے تھا۔ان کی شہرت اور عظمت کسی بادشاہ یا حکمران کی مرہونِ منت نہیں تھی۔اور نہ ہی کسی ازم کے پرستار تھے اور نہ ہی کسی دبستان اور رجحانات کے علمبردار۔جس کی بنیاد پر کہا جائے کہ انیسؔ کی شہرت میں ان کا حصّہ ہے۔ وہ خالصتاً بارگاہِ سیدالشہد سے منسلک تھے اور میر انیسؔ آج جو کچھ بھی نظر آتے ہیں ان ہی مقدّس ذات کا کرم اور عنایت ہے۔

اس لیے جو کچھ اور جس صنف میں لکھا سب کے سب رثائی ادب کے دائرے میں ہی رہ کر لکھا۔ مثلاً رباعیاں کہیں تو کربلا اور کربلا والوں

کے لیے کہیں یا سلام کہا تو اس میں شہدائے کربلا کی مدح اور مصائب بیان کئے۔ اور مرثیے کی بات ہی کیا ہے۔ ختمی مرتبت سے لیکر مولا حسین علیہ السلام تک کے ذکر میں رثائی ادب اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ میر انیسؔ کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ انہوں نے جس خلوص و محبّت سے مرثیے کو سجایا اور سنوارا ہے اور تمام اصناف میں اسے اس قابل بنایا ہے کہ اسے دیکھنے اور پڑھنے کہ بات ہر صاحبِ فن اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھے گا تو مرثیہ ہی کو شاعری قرار دے گا۔ چنانچہ اپنے ایک بیت میں فرماتے ہیں۔

ہو اگر ذہن میں جودت ہے کہ موزونی ہے　　اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

یا پھر یوں فخر کرتے ہیں

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ　　عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

یہ کہہ کر انہوں نے صاف کر دیا کہ یہ صنفِ مرثیہ ہی شاعری ہے اور اس پر صرف اور صرف انیسؔ کی حکمرانی ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے دانشمندوں اور شاعروں کی ضرورت ہے۔ اور اس پر میر انیسؔ کا فخر و مباہات کرنا بجا ہے۔ اس لیے کہ شاعری بالخصوص مرثیہ نگاری ان کی کئی پشتوں سے چلی آ رہی ہے جس میں اللہ، اللہ کے رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی مدح وثنا کی جاتی ہے۔

مطلب یہ کہ میر انیسؔ کو اس بات کا عرفان تھا کہ انہوں نے صنفِ مرثیہ کو اس مقام پر لا بٹھایا ہے جہاں سے ہر صنف اس پر رشک کرتی نظر آئے گی۔ اور ان کی طرف للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھے گی۔ ملاحظہ ہو یہ بیت جس میں یہ احساس کارفرما ہے:

وصف جوہر کا کروں یا صفتِ ذات کروں　　اپنے رتبے پہ نہ کیوں آپ مباہات کروں

میر انیسؔ نے مرثیے کے سلسلے میں اپنے خاندان کی خدمات اور اپنی محنت اور لگن کا ذکر کرتے ہوئے مرثیے کا پہلی بار جو تصوّر پیش کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ کیونکہ عجز و انکساری کے ساتھ مرثیے کی خوبیوں پر جس طرح روشنی ڈالی ہے اس کا تصوّر میر انیسؔ سے پہلے کہیں بھی نہیں ملتا۔ چند بند کو اس مقام پر نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ جسے پڑھ کر آپ خود سمجھ جائیں گے کہ میر انیسؔ زبان کے معاملے میں کتنے محتاط تھے اور الفاظ کے انتخاب اور اس کے محلِ استعمال پر کتنی قدرت رکھتے تھے نیز وہ مرثیہ میں مضامین کس درجے کا پسند کرتے تھے:

نمک خوان تکلم ہے ، فصاحت میری　　ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری

رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری　　شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؔ کی مداحی میں

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کردوں　　بحر مواج فصاحت کا تلاطم کر دوں

ماہ کو مہر کروں ذرّوں کو انجم کردوں　　گنگ کو ، ماہرِ اندازِ تکلّم کر دوں

دردِ سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

اس ثنا خواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مدّاح　　جدِّ اعلیٰ سے نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مدّاح
باپ مدّاح کا مدّاح ہے دادا مدّاح　　عم ذی قدر ثنا خوانوں میں یکتا مداح
جو عنایاتِ الٰہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

طبع ہر ایک کی موزوں قدِ زیبا موزوں　　صورتِ سرو ازل سے ہیں سراپا موزوں
نثر بے سجع نہیں ، نظم معلّیٰ موزوں　　کہیں سکتہ نہیں آ سکتا ، کجا ناموزوں
تول لے عقل کی میزاں میں جو فہمیدہ ہے
بات جو منھ سے نکلتی ہے وہ سنجیدہ ہے

خلق میں مثل خلیقؔ اور تھا خوش گو کوئی کب　　نام لے دھو لے زباں کوثر و تسنیم سے جب
بلبلِ گلشنِ زہراؑ و علیؑ عاشقِ رب　　متبع مرثیہ گوئی میں ہوئے جس کے سبب
ہو اگر ذہن میں جودت ہے کہ موزونی ہے
اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

بھائی خوش فکرت و خوش لہجہ و پاکیزہ خصال　　جن کا سینہ گہر علم سے ہے مالا مال
یہ فصاحت ، یہ بلاغت ، یہ سلاست یہ کمال　　معجزہ گر نہ اسے کہیے تو ہے سحرِ حلال
اپنے موقعے پہ جسے دیکھیے لاثانی ہے
لطف حضرت کا یہ ہے رحمتِ یزدانی ہے

کیوں نہ ہو بندۂ موروثیٔ مولا ہوں میں　　قلزمِ رحمتِ معبود کا قطرہ ہوں میں
جس میں لاکھوں در و مرجاں ہیں وہ دریا ہوں میں　　مدح خوانِ پسرِ حضرتِ زہراؑ ہوں میں
وصف جوہر کا کروں یا صفتِ ذات کروں
اپنے رتبے پہ نہ کیوں آپ مباہات کروں

مبتدی ہوں مجھے توقیر عطا کر یارب　　شوقِ مداحِ شبیرؑ عطا کر یارب
سنگ ہو موم وہ تقریر عطا کر یارب　　نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یارب
جد و آباد کے سوا اور کوئی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہوں گنجلک نہ ہوں تعقید نہ ہو

وہ مرقّع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہل شعور　　ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
غل ہو یہ ہے کششِ موقلمِ طرۂ حور　　صاف ہر رنگ سے ہو صنعتِ صانع کا ظہور
کوئی ناظر جو یہ نایاب نظیریں سمجھے
نقشِ ارژنگ کو کاواک لکیریں سمجھے

قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ　　شمعِ تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانیؔ ہو تو بہزادؔ ہو دنگ　　خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روزمرّہ شرفا کا ہو سلامت ہو وہی　　لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے ، صنعت ہو وہی　　یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے　　تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے　　زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لیے
داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

بزم کا رنگ جدا ، رزم کا میداں ہے جدا　　یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو ، تو ہر نامے کا عنواں ہے جدا　　مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو ، مصائب بھی ہوں ، توصیف بھی ہو
دل بھی محفوظ ہوں ، رقّت بھی ہو تعریف بھی ہو

مذکورہ بالا ۱۳ بند میں میر انیسؔ نے مرثیے کے بارے میں اپنے خاندان کی شاعری بالخصوص مرثیے میں خدمات کا ذکر اور خود میر انیسؔ نے مرثیے کے سلسلے میں جو خلوص، محنت اور لگن کا ثبوت دیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی کامیابی کی جو دعا مانگی ہے، ان سب کے پیشِ نظر یہ بات بلاشبہ کہی جاسکتی ہے کہ میر انیسؔ نہ صرف مرثیے کے بڑے شاعر ہیں بلکہ اردو شاعری میں بھی صفِ اوّل کے شاعر ہیں۔

صنفِ مرثیہ سے میر انیسؔ کا خلوص اور محبت کا جائزہ تو لیجیے کہ وہی صنف جسے منھ لگانا شعراء ننگ و عار سمجھتے تھے اب اسی میں شعر کہنے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ اور مرثیے کو بھی میر انیسؔ نے زبان و بیان اور مختلف النوع مضامین اور صنعتوں کے زیورات سے کچھ اس طرح سجایا اور سنوارا کہ ہر صنف کو اپنا حُسن مرثیے میں نظر آنے لگا۔

بقول ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی:

''مراثی میں غزل کی لطافت، قصیدے کا آہنگ، مثنوی کا تسلسل، رباعیات کا طرزِ فکر، ڈراموں کا تحیر اور نقطۂ عروج، رزم نگاری کا ہمہمہ و رجز، تلوار کی جھنکار، موسیقی کی چہار، مظلوم کی فریاد۔ غرض یہ کہ کتنے اسالیب، کتنی کیفیتیں، کتنے پیکر مرثیے کے دامن میں یکجا موجود ہیں جس کا اعتراف اکثر ناقدینِ فن نے اپنے اپنے انداز اور الفاظ میں کیا ہے۔ (معاصرینِ مرزا دبیرؔ: تقابلی مطالعہ صفحہ ۱۳۷)

میر انیسؔ پر بہتان تراشی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔اس لیے کہ جتنے الفاظ میر انیسؔ نے جس خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیے ہیں شاید وہ نظیرؔ اکبرآبادی کے یہاں نظر بھی آجائیں لیکن ان میں وہ سنجیدگی اور بلندی نہیں جو میر انیسؔ کے یہاں ہے۔ایامِ جاہلیت میں عرب کے شعراء سال بھر محنت کرتے تھے اور اپنا اپنا قصیدہ کہہ کر کعبے کی دیوار پر آویزاں کرتے تھے اور پھر جس کا کلام بہتر ہوتا اسے انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔لیکن جب سورۂ کوثر کعبے کی دیوار پر آویزاں کیا گیا تو سب نے اپنا اپنا کلام اُتار لیا اور کہا کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔کچھ ایسا ہی کرشمہ ہم میر انیسؔ کے سلسلے میں ملاحظہ کرتے ہیں۔اردو کے بڑے بڑے نامی گرامی شعراء کہ جن کا اپنے اپنے صنفِ شاعری میں جواب نہ تھا مرثیہ لکھتے ہوئے دم پھولتا تھا۔میر تقی میرؔ اور سوداؔ نے بھی مرثیہ کہا ہے اور کم وبیش ان کے مراثی کی ایک اچھی خاصی تعداد بھی ہے لیکن دوسرے بڑے شعراء میں سے اکثر نے مرثیہ نگاری میں میر انیسؔ کے آگے سپر ڈال دی ہے۔وہ بات پیدا نہ کر پائے جو میر انیسؔ کا طرۂ امتیاز ہے۔مثلاً حالیؔ نے یادگارِ غالب میں مرثیہ نگاری اور غالب کے حوالے سے جو قصّہ سنایا ہے وہ بڑا دلچسپ ہے۔حالیؔ فرماتے ہیں کہ ایک بار غالباً مجتہد العصر سید محمد صاحب مرحوم کی خواہش پر مرزا غالبؔ نے تین بند اردو مرثیے کے لکھنے کے بعد آگے لکھنے کے لیے معذرت چاہی اور بقول صاحبِ ''واقعاتِ انیسؔ'' جو مرثیے کے تین بند غالبؔ نے لکھّے تھے وہ میر انیسؔ کے پاس برائے اصلاح بھیجے تھے۔اور اس کے ساتھ جو خط تھا اُس کی عبارت ہے:

''امتثالِ امر سے مجبور تھا صرف تین بند لکھ کر جو غور کیا تو مرثیہ کا ہے کو ہے واسوخت معلوم ہوتا ہے،اصل بات تو یہ ہے کہ یہ آپ ہی کا کام ہے۔'' (واقعاتِ انیسؔ صفحہ ۸۵)

غالبؔ نے جو مرثیے کے تین بند کہے ہیں اس میں سے ۲ بند ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ملاحظہ فرمائیں اور پھر غور کریں کہ آج کے معترضین کیا میر انیسؔ کے ایک بند کا جواب لا سکتے ہیں:

(۱)

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو　　اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لبِ عیسیٰؑ پہ فغاں ہو　　اے ماتمیانِ شہِؑ مظلوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بتائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو　　ماتم میں شہِؑ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو　　گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو
یہ خرگۂ نہ پایا جو مدّت سے بپا ہے
کیا خیمۂ شبیرؑ سے رتبے میں سوا ہے

میر انیسؔ کو واقعہ نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری اور اسی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر جو قدرت حاصل ہے وہ نہ ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد نظر آتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت اور معاشرت کے زبردست ماہر تھے۔ان کا کمال یہ ہے کہ وہ بعض اجمالاً واقعہ یا غیر وقوع پذیر واقعے کو بھی اس طرح تناسب، ربط اور موزونی کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں کہ واقعے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔اس پر طرۂ امتیاز یہ کہ جس ماحول، جذبے اور مقام پر بیان ہو رہے ہیں اس کے جملہ جزئیات کو بھی نظر میں رکھتے جاتے ہیں اور افراد کے سن وسال کو بھی

ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ رزمیہ شاعری کو ہی لے لیں۔ رزمیہ شاعری کے لیے جو جو چیزیں لازمی ہیں وہ سب کچھ آپ کو میر انیسؔ کے یہاں مل جائیں گی۔ اور وہ بھی سلیقے، ترتیب اور اس خوبی کے ساتھ ہر شے کا بیان کثرت کے ساتھ نظر آئے گا کہ دل ونظر پھڑک اٹھتے ہیں۔ معرکہ آرائی کا ذکر اس خوبی سے کرتے ہیں کہ جیسے لگتا ہے کہ میر انیسؔ اس موقع پر وہاں موجود تھے۔ مثلاً یہ دو بند ملاحظہ فرمائیں۔

آئی جس غول پہ لاشوں سے زمیں پاٹ گئی　　ہاتھ منھ صدر و کمر گردن و سر کاٹ گئی
چاٹ ایسی تھی لہو کی کہ صفیں پاٹ گئی　　دیکھی تیغوں کی جدھر باڑھ اُسی گھاٹ گئی
جس پہ جاتی تھی نہ بے جاں کیے پھرتی تھی
ایک بجلی تھی مگر لاکھ جگہ گرتی تھی

یا پھر گھوڑے سے متعلق کہے گئے اس بند کو دیکھیں:

گھوڑے تھے چھلاوہ کبھی یاں تھے کبھی واں تھے　　پتلی میں تو پھرتے تھے پر آنکھوں سے نہاں تھے
یاں تھے جو سُبک رو تو اُدھر گرم عناں تھے　　مچھلی تھے کسی جا تو کہیں آبِ رواں تھے
ہوسکتی تھی مچھلی سے یہ سُرات نہ ہرن سے
جھونکے تھے ہوا کے کہ نکل جاتے تھے سن سے

میر انیسؔ کے سلسلے میں بعض معترضین کی زبان سے جو یہ کلمہ نکلتا ہے کہ انیسؔ کے بعض کلام میں سید الشہد علیہ السلام کے شان میں گستاخی (نعوذ باللہ) ملتی ہے تو ان سے یہ سوال کریں کہ گستاخی سے آپ کی مراد کیا ہے؟ کیا انسانی جذبات واحساسات کی ہو بہو تصویر اتارنا گستاخی ہے۔ ذیل کے اس بند کو ملاحظہ کریں جہاں جنابِ زینبؑ حضرت علی اکبرؑ سے یہ شکوہ کر رہی ہیں کہ ان سے اجازت طلبی کیوں نہ کی گئی

اکبرؑ سے مجھ کو یہ نہ توقّع تھی ہے غضب　　اتنا نہیں خیال کہ ہے کون جاں بلب
اس گل نے ہائے میری ریاضت بھلائی سب　　نامِ خدا جواں ہوئے کیا ہم سے کام اب
ہیں محوِ رن کے شوق میں رخصت کے دھیان میں
سچ ہے کسی کا کون ہوا ہے جہان میں

اب اگر ایسے جذبات واحساسات کی بنیاد پر کوئی میر انیسؔ کو گستاخِ سید الشہد علیہ السلام سمجھتا ہے تو اس نااہل کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ ثانیِ زہراؑ کے کلمات میں جو پیار موجِ زن ہے اس کا عرفان صرف اہلِ عشق ہی لگا سکتے ہیں۔ ذرا غور کریں کہ ان ناموسِ رسالتؐ کے چھوٹے چھوٹے جذبات واحساسات کو جس سلیقے اور ترتیب سے انیسؔ نے پیش کیا ہے اُسے دیکھ کر کیا بے ساختہ دل یہ کہنے کو بے تاب نہیں ہوتا کہ میر انیسؔ انسان کے بھیس میں فرشتہ تھے۔ کیونکہ خیامِ حسینؑ کے باہر کے حرکات وسکنات اور گفتگو کو سمجھا اور بیان کیا جا سکتا ہے لیکن خیامِ حسینؑ کے اندر ناموسِ رسولؐ کے حرکات وسکنات اور باتوں کو کس طرح رقم کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام صرف فرشتہ ہی کر سکتا ہے۔

❁❁❁❁

میر انیسؔ کے مرثیوں میں داستانوی عناصر

ڈاکٹر فرحت نادر رضوی

میر انیسؔ کے تقریباً تمام ہی مرثیوں میں داستانوی عناصر کم یا زیادہ کسی نہ کسی صورت موجود ہیں۔صنف مرثیہ کو قبولیتِ عوام مجالس عزا میں مرثیہ خوانی کے رواج کے سبب حاصل ہوئی۔نثر خوانی ہو یا شعر خوانی، سامعین کو مخاطب رکھنے کے لیے اور ان کی مکمل توجّہ کی حصول کے لیے بیان دلچسپ، پر لطف اور پر اثر ہونے کے ساتھ ساتھ مجمعے کی پسند اور توقع کے مطابق بھی ہونا چاہیے،اس کے علاوہ بیان میں ایک ایسی سحر انگیزی بھی ہونی ضروری ہے کہ مجمع دم بخود، بیان کے طلسم میں اسیر، اپنے گرد و پیش سے بیگانہ،خود کو اسی فضا میں سانس لیتا محسوس کرے جہاں اس کا مقرّر یا شاعر اسے پہنچانا چاہتا ہے۔انیسؔ کے لیے بھی مرثیہ گوئی کے حوالے سے ان ضرورتوں کی تکمیل ضروری تھی۔انیسؔ کے سامعین خواہ مذہبی اور جذباتی تعلّق کے سبب مرثیہ خوانی کی مجالس میں شرکت کرتے رہے ہوں لیکن انیسؔ کے مرثیوں میں سے زیادہ تر کی طوالت سامعین کے لیے بارِ خاطر ہوسکتی تھی اگر ان میں لطفِ بیاں ملحوظ نہ رکھا گیا ہوتا۔تاہم آج بھی جب ہم ان مرثیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو خیالات وجذبات کے جوش،فکر کے بہاؤ اور لفظوں کی روانی اور واقعات کے تسلسل میں خود کو گم گشتہ پاتے ہیں۔

توجّہ طلب یہ امر ہے کہ وہ کون سی خصوصیات ہیں جنھوں نے ان مرثیوں میں اتنی زبردست کشش پیدا کردی ہے کہ سامعین دم بخود سنتے چلے جاتے ہیں اور کبھی بھی بیزار نہیں ہوتے۔ہم اس پہلو پر جس قدر غور کرتے ہیں اس قدر ہمیں انیسؔ کی معجز بیانی کا اعتراف برملا کرنا پڑتا ہے۔مرثیوں کی دیگر خصوصیات سے قطعِ نظر انیسؔ نے جو اندازِ بیان اختیار کیا ہے اس میں تاثیر کا ایسا طلسم، جذبہ کا ایسا پر جوش اظہار ہے اور لفظوں کے بہاؤ کی ایسی مقناطیسیت ہے جو ہمارے حواس کو مکمل طور پر حصار میں لے لیتی ہے۔ان کے انداز بیان کی ڈرامائیت خود اپنے آپ میں ایک مکمّل فن ہے جو انکی تخلیقی کاوشوں سے ہم آہنگ ہوکر ادبی دنیا میں معجز نما ہوا ہے۔

انیسؔ نے اپنے مرثیوں کو خواہ اس پہلو سے نہ دیکھا ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ انکی رزمیہ نظموں میں فنِ داستان گوئی کی جو نکھری ہوئی صورت ہمارے سامنے آتی ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انیسؔ کے اندر ایک اعلیٰ درجے کے قصہ گو کی تمام خصوصیات موجود تھیں اور انھوں نے اپنے ماحول اور ذاتی رجحان کے تحت مرثیہ گوئی اختیار کرنے کے باوجود فنِ قصّہ گوئی کے تمام لوازمات سے اپنے مرثیوں کو اس طرح آراستہ کیا ہے کہ یہ رزمیے منظوم داستانوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

انیسؔ کے مرثیوں میں،خواہ ان کا انداز بیان ہو، واقعات کی ترتیب اور ان کے درمیان تسلسل کا اہتمام ہو،مخصوص صورت حال کی منظر کشی یا مرثیوں کے پس منظر کی تشکیل ہو، کرداروں کی تجسیم یا انکے نفسیاتی محرکات اور داخلی کشمکش کی عملی پیشکش ہو، بیانیوں اور مکالموں کے اہتمام میں پوشیدہ طور پر رکھے جانے والے کرداروں کے باطنی روزن ہوں، احساسات کی شدت ہو یا یا قصّے میں حرکت وعمل، جرآتِ پیکار

اور داخلی و خارجی تصادم اور ٹکراؤ کی صورت حال کی پیشکش ہو، ہر جگہ وہ ایک نہایت مشاق، ہنرمند، تربیت یافتہ اور قادرالکلام داستان گو کی طرح صورت حال کے تمام تر کیف وکم سمیٹے نظر آتے ہیں۔

دیگر مرثیہ گویوں کی طرح ہی انیسؔ نے بھی مرثیوں میں ایک تاریخی واقعہ کو بنیادی قصّے کی صورت میں پیش کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان مرثیوں میں انھیں ایک داستان گو کے جیسی تخیلی آزادی حاصل نہیں۔ انہیں تاریخ کے حدود میں رہتے ہوئے ہی واقعات کا تسلسل قائم کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیوں میں داستانوں کی طرح منظّم پلاٹ کی تشکیل ممکن نہ ہوئی۔ کربلا کی سرزمین پر پیش آنے والے خونیں سانحے کی ابتدا امام حسینؑ اور انکے کنبے کی مدینے سے روانگی کے واقعہ سے ہوتی ہے اور پھر اسی دشوار سفر کے ساتھ ساتھ مرثیے کا قصّہ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا ہے۔ امام حسینؑ کربلا کی سرزمین پر قدم رکھتے ہیں، یزید کے ایک چھوٹے سے رسالے کی مداخلت کے نتیجہ میں امام کے خیمے ترائی کو چھوڑ کر ریگستان میں نصب کیے جاتے ہیں، دوسرے ہی دن سے یزید کے لشکر کثیر تعداد میں اس میدان میں یکجا ہونے لگتے ہیں۔ یزید کی جانب سے امام حسینؑ سے بیعت کا تقاضہ کیا جاتا ہے جس کو آپ رد کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں عاشور کی صبح جنگ کا اعلان یزیدی لشکر کی طرف سے تیروں کی بارش کی صورت میں ہوتا ہے۔ عاشور کا پورا دن جنگ وجدل میں گزرتا ہے، یہاں تک کہ عصر کا وقت آتے آتے امامِ حسینؑ کا پورا لشکر شہید ہو چکا ہوتا ہے اور اب امامؑ راہِ خدا میں سر دے کر بارگاہ ایزدی میں اپنی جان کی آخری قربانی پیش کر دیتے ہیں۔ بظاہر حسینؑ کی شکست ہوتی ہے اور یزید کی فتح ہوتی ہے، حسینؑ کے اہل وعیال قیدی بنا کر زندانِ شام کی طرف لے جائے جاتے ہیں۔ انیسؔ نے اس بنیادی واقعے کو ابتدا سے آخر تک کسی ایک مرثیے میں نہ پیش کر کے الگ الگ مرثیوں میں سلسلہ وار پیش کیا ہے۔ ہر مرثیہ اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ انفرادی حیثیت سے بھی مکمل ہے اور اجتماعی طور پر بھی واقعاتی تسلسل میں ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس طرح اسی بنیادی واقعہ کا ایک ایک حصّہ (Episode) بن جاتا ہے۔

اس طرح انیسؔ نے واقعات کی ترتیب میں اگرچہ ایک مخصوص قصّہ پن پیدا کر دیا ہے پھر بھی اس ترتیب کو ایک مکمل پلاٹ کی حیثیت نہیں دی جاسکتی کیوں کہ کسی بھی ایک مرثیے سے کربلا کے مکمل واقعے کی آگاہی حاصل نہیں ہوسکتی۔

فرزندِ پیمبرؐ کا مدینے سے سفر ہے

اس مرثیے میں سانحۂ کربلا کی تقریباً مکمل تمہید پیش کر دی گئی ہے۔ مدینے سے رخصت بزرگوں کی قبروں سے جدائی، حج کو عمرے میں تبدیل کرتے ہوئے کربلا کا سفر اختیار کرنا، راستے میں شہادتِ مسلمؑ کی خبر ملنا، حر کے رسالے سے سامنا ہونا اور خیام حسینی کا ریگستان پر بپا کیا جانا۔ یہ تمام واقعات اس ایک مرثیے میں مکمل تفصیل کے ساتھ پیش کر دیے گئے ہیں۔

فرزندِ پیمبرؐ کا مدینے سے سفر ہے　　سادات کی بستی کے اجڑنے کی خبر ہے
درپیش ہے وہ غم کہ جہاں زیر و زبر ہے　　گل چاک گریباں ہیں صبا خاک بسر ہے

گل رو صفت غنچہ کمربستہ کھڑے ہیں
سب ایک جگہ صورتِ گلدستہ کھڑے ہیں

امام حسینؑ کے مدینے سے رخصت ہونے کی خبر سے مدینہ ویران ہوگیا ہے۔ سادات کی بستی اجڑ گئی ہے، امامؑ کی مدینے سے روانگی وہ سانحۂ عظیم ہے جس کے غم میں سارا عالم تہہ وبالا ہورہا ہے۔

آراستہ ہیں بہرِ سفر سروِ قبا پوش　　عمّامے سروں پر ہیں قبائیں بہ سرِ دوش
یارانِ وطن ہوتے ہیں آپس میں ہم آغوش　　حیراں کوئی تصویر کی صورت کوئی خاموش
منھ ملتا ہے رو کر کوئی سرورؑ کے قدم پر
گر پڑتا ہے کوئی علی اکبرؑ کے قدم پر

جانے والے عبائیں کاندھوں پر ڈالے، عمامے سروں پر باندھے، جدائی کے احساس دلگیر ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ وفورِ غم میں اہلِ وطن امامِ حسینؑ اور علی اکبرؑ کے قدموں سے لپٹ لپٹ کر رو رہے ہیں۔

عباسؑ کا منھ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ　　اب آنکھوں سے چھپ جائے گی تصویرِ یداللہ
کہتے ہیں گلے مل کے یہ قاسمؑ کے ہواخواہ　　واللہ دلوں پر ہے عجب صدمۂ جاں کاہ
ہم لوگوں سے شیریں سخنی کون کرے گا
یہ انس یہ خلق حسنی کون کرے گا

روتے ہیں وہ جو عونؑ و محمدؑ کے ہیں ہم سِن　　کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلے گا تم بِن
اس داغ سے چین آئے ہمیں یہ نہیں ممکن　　گرمی کا مہینہ ہے سفر کے نہیں یہ دن
تم حضرتِ شبیرؑ کے سائے میں پلے ہو
کیوں دھوپ کی تکلیف اٹھانے کو چلے ہو

ان اشعار میں انیسؔ نے مرثیے کے خاص خاص کرداروں سے متعارف کرادیا ہے۔ حضرت عباسؑ جو امام حسینؑ کے چھوٹے بھائی ہیں جرأت وشجاعت میں حضرت علیؑ کی نشانی ہیں لہٰذا اہلِ مدینہ جب ان کو دیکھتے ہیں تو علیؑ کے دیدار کا لطف پاتے ہیں۔ جنابِ قاسمؑ امامِ حسینؑ کے بھتیجے اور انکے بڑے بھائی امام حسنؑ کے صاحبزادے ہیں، اخلاق ملنساری اور شیریں سخنی میں یہ اپنے والد کی نظیر ہیں۔ عونؑ و محمدؑ امام حسینؑ کے بھانجے اور انکی بہن زینبؑ کے کم سن بیٹے ہیں۔

تدبیرِ سفر میں ہیں ادھر سبطِ پیمبرؐ　　گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر
اسباب نکلواتے ہیں عباسِؑ دلاور　　تقسیم سواری کے تردد میں ہیں اکبرؑ
شہؑ کو جنھیں لے جانا ہے وہ پاتے ہیں گھوڑے
خالی ہوئے اصطبل چلے آتے ہیں گھوڑے

امام حسینؑ کنبے کے سربراہ اور میرِ کارواں ہیں لہٰذا انتظاماتِ سفر میں آپ بہت زیادہ مصروف ہیں کبھی گھر کے اندر اور کبھی باہر آجارہے

ہیں، حضرت عباسؑ بھائی کے مددگار اور قوّتِ بازو ہیں، ہر کام میں امامؑ کے معاون اور مددگار ہیں، اکبرؑ کو انکی عمر کے اعتبار سے تقسیمِ سواری کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

''خالی ہوئے اصطبل چلے آتے ہیں گھوڑے''

ہماری نگاہوں میں سفر کے انتظامات کا نقشہ اور روانگی کے بعد کی ویرانی کا منظر پیش کر رہا ہے۔

عوراتِ محلّہ چلی آتی ہیں بصد غم　　کہتی ہیں یہ دن رحلتِ زہراؑ سے نہیں کم
پرسے کی طرح رونے کا غل ہوتا ہے ہر دم　　فرش اٹھتا ہے کیا بچھتی ہے گویا صفِ ماتم
غل ہوتا ہے ہر سمت جدا ہوتی ہیں زینبؑ
ہر اک کے گلے ملتی ہیں اور روتی ہیں زینبؑ

اندرونِ خانہ عورتیں چلی آ رہی ہیں، گھر سے بار بار اس طرح رونے کا غل بلند ہو رہا ہے جیسے کسی کے پُرسے کو آنے والے لوگ روتے ہیں۔ جگہ جگہ سے فرش سمیٹے جا رہے ہیں، گھر میں ویرانی چھا رہی ہے، آنے والی عورتیں جناب زینبؑ سے گلے مل مل کر رو رہی ہیں۔

غرض سفر کی اس تیاری کی تصویر کشی میں انیسؔ نے خاص تفصیل سے کام لیا ہے۔ خصوصاً امامؑ کی بیمار بیٹی صغریٰؑ کی کیفیات کا ذکر نہایت پُراثر انداز میں کیا ہے۔ صغریٰؑ کو شدید علالت کے سبب ساتھ نہیں لے جایا جا رہا ہے۔ ادھر تمام لوگ جانے کی تیاری میں مشغول ہیں جناب زینبؑ آنے والی عورتوں سے محوِ گفتگو ہیں۔ ادھر امام حسینؑ اسبابِ سفر مہیّا کر چکے ہیں اور اب بہن کو سوار ہونے کے لیے پکارتے ہیں۔

کہتی تھیں یہ زینبؑ کہ پکارے شہِؑ عادل　　تیّار ہیں دروازے پہ سب ہودج و محمل
طے شام تلک ہوگی کہیں آج کی منزل　　رخصت کرو لوگوں کو نہیں رونے سے حاصل
چلتی ہے ابھی سرد ہوا وقتِ سحر ہے
بچّے کئی ہمراہ ہیں گرمی کا سفر ہے

جناب شہر بانوؑ جو امام حسینؑ کی زوجہ اور صغریٰؑ کی والدہ ہیں بیمار بیٹی کے سرہانے بیٹھی ہیں، پریشان ہیں کہ کس طرح اس بیمار بچی کو تنہا چھوڑ کر جائیں۔

سن کر یہ سخن بانوئے ؑ ناشاد پکاری　　میں لٹتی ہوں کیسا سفر اور کیسی سواری
غش ہو گئی ہے فاطمہؑ صغریٰ مری پیاری　　بے کس کے لیے کرتے ہیں سب گریہ و زاری
اب کس پہ میں اس صاحب آزار کو چھوڑوں
اس حال میں کس طرح میں بیمار کو چھوڑوں

بیمارِ صغریٰؑ کی بے ہوشی کی خبر سن کر امامؑ بیٹی کے پاس تشریف لاتے ہیں، صغریٰؑ بابا کی خوشبو پا کر آنکھیں کھول دیتی ہیں۔ جب ان کو گھر بھر کی جدائی کا علم ہوتا ہے تو باپ سے خود کو ہمراہ لے چلنے کی منّتیں کرتی ہیں، وہ طرح طرح سے اس بات کا یقین دلاتی ہیں کہ راستے میں کسی کو

ان کی ذات سے کسی طرح کی پریشانی کا سامنا نہیں ہوگا۔

صغریٰؑ نے کہا کھانے سے خود ہے مجھے انکار　　پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہ گار
کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار　　تبرید فقط آپ کا ہے شربت دیدار
گرمی میں بھی راحت سے گزر جائے گی بابا
آئے گا پسینہ ٹپ اتر جائے گی بابا

مگر امام حسینؑ بیٹی کے اصرار کے آگے معذور ہیں۔ انکے انکار سے بیمار صغریٰؑ کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ ایک ایک سے ساتھ لے چلنے کے لیے سفارشیں کرتی ہیں، کبھی علیؑ اصغر کو گلے لگا کر روتی ہیں، کبھی بڑے بھائی اکبرؑ سے محبّت آمیز شکوے کرتی ہیں، صغراؑ کی بے قراری دیکھ کر اہلِ خانہ بیقرار ہوجاتے ہیں دفعتاً عباسؑ ڈیوڑھی سے پکارتے ہیں۔

عباسؑ نے اتنے میں یہ ڈیوڑھی سے پکارا　　چلنے کے لیے قافلہ تیّار ہے سارا
لپٹا کے گلے فاطمہؑ صغریٰ کو دوبارا　　اٹھے شہؑ دیں گھر تہہ و بالا ہوا سارا
جس چشم کو دیکھا سو وہ پرنم نظر آئی
اک مجلسِ ماتم تھی کہ برہم نظر آئی

رخصت کے اس پر درد بیان کے بعد انیسؔ، اہلِ حرم خصوصاً حضرت زینبؑ کے بہ اہتمام سوار ہونے کا بیان کرتے ہیں۔ جنابِ زینبؑ کے سوار ہونے کی وہی شان ہے جو ایک شہزادی کے سوار ہونے کی ہونی چاہئے۔

بیت الشّرف خاص سے نکلے شہؑ ابرار　　روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عطرتِ اطہار
فرّاشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار　　پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار
باہر حرم آتے ہیں رسولؐ دو سرا کے
شقّہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے

آ پہنچی جو ناقے کے قریں دخترِ حیدرؑ　　خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبطِؑ پیمبرؐ
فضہؑ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشۂ چادر　　تھے پردہ محمل کو اٹھائے علیؑ اکبر
فرزند کمربستہ چپ و راس کھڑے تھے
نعلین اٹھا لینے کو عباسؑ کھڑے تھے

گھر سے رخصت ہوکر امام حسینؑ بزرگوں کی قبروں پر پہنچتے ہیں۔ ایک ایک کر کے نانا رسولِ خدا، والدہ جناب فاطمہؑ زہرا اور بھائی حسنؑ کی قبر سے رخصت ہوتے ہیں۔ امامؑ کے گرد ہم وطن دوستوں کا ہجوم ہے سب غمزدہ اور اداس نظر آرہے ہیں، امامؑ گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں اور عزیز و اقربا روتے ہوئے گھر واپس جاتے ہیں۔

روتے ہوئے وہ لوگ پھرے شاہؑ سدھارے　　جو صاحبِ قسمت تھے وہ ہمراہ سدھارے
کس شوق سے مردانِ حق آگاہ سدھارے　　عابد طرفِ خانۂ اللہ سدھارے
اترے نہ مسافر کسی مخلوق کے گھر میں
عاشق کو کشش لے گئی اللہ کے گھر میں

امامؑ مدینے سے روانہ ہوکر حج کے لیے خانۂ کعبہ تشریف لے جاتے ہیں مگر۔

کعبے میں بھی اک دن نہ ملا شاہؑ کو آرام　　کوفے سے چلے آتے تھے نامے سحر و شام
اعدا نے گزرنے نہ دیے حج کے بھی ایّام　　کھولا پسرِ فاطمہؑ نے باندھ کے احرام
عازم طرفِ راہِ الٰہی ہوئے حضرت
تھی ہشتمِ ذی الحجہ کہ راہی ہوئے حضرت

غرض اس طرح حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے کربلا کی طرف روانہ ہوتے ہیں، راہ میں ملنے والے مسافروں سے سرزمینِ کربلا کی خصوصیات رکھنے والی کسی جگہ کا پتہ پوچھتے چلتے ہیں، ایک مسافر امامؑ کو ایک ایسے مقام کے بارے میں بتاتا ہے جو نہایت ہولناک ہے، اجنبی مسافر سے اس مقام کی تفصیل دریافت کرنے کے بعد امامؑ یہ کہہ کر آگے بڑھتے ہیں۔

اس شخص سے کہہ کر یہ چلے قبلۂ عالم　　اللہ نے چاہا تو بسائیں گے اسے ہم
عاشق پہ بلا بعد بلا آتی ہے ہر دم　　غم اور بڑھا وصل کا عرصہ جو رہا کم
آفت یہ نئی فوجِ شہنشاہ میں آئی
مسلمؑ کی شہادت کی خبر راہ میں پائی

ابھی قافلہ کربلا سے کچھ دور ہی ہے کہ مسلم ابن عقیل جو امامؑ کے چچازاد بھائی تھے اور جن کو اہلِ کوفہ کے پیام کی صداقت جاننے کے لیے آپ نے خود سے پہلے کربلا روانہ کیا تھا، ان کی شہادت کی خبر آپ کو راہ میں ملتی ہے۔ اس خبر سے کئی دنوں تک امامؑ کی سپاہ پر غم کی گھٹا چھائی رہتی ہے حتیٰ کے آپ کا سفر تمام ہوتا ہے اور آپ کا داخلہ سرزمینِ کربلا میں ہوتا ہے جہاں نہرِ فرات کے کنارے قافلہ ٹھہرتا ہے۔

اترے اسی میدانِ بلاخیز میں سرورؑ　　استادہ ہوئے خیمۂ ناموسِ پیمبرؐ
صحرا کی طرف دیکھ کے خوش ہو گئے اکبرؑ　　دریا پہ ٹہلنے لگے عباسؑ دلاور
شہؑ بولے ہوا نہر کی بھائی تمھیں بھائی
ہاں شیر ہو دریا کی ترائی تمھیں بھائی

اس طرح انیسؔ نے اس ایک مرثیے میں مدینہ سے روانگی اور کربلا تک پہنچنے کی تفصیل بیان کر دی ہے۔

ہے جب سے کھلا حالِ سفر بند ہے بازار　　یہ جنسِ غم ارزاں ہے کہ روتے ہیں دوکاں دار

خاک اڑتی ہے ویرانیٔ یثرب کے ہیں آثار　　ہر کوچے میں ہے شور کہ ہے ہے شہِؑ ابرار
اب یاں کوئی والی نہ رہا آہ ہمارا
جاتا ہے مدینے سے شہنشاہ ہمارا

فنِ قصہ گوئی کے اعتبار سے اگرچہ اس مرثیے میں دوسرے مرثیوں کے بالمقابل ڈرامائی عنصر کسی حد تک کم ہے مگر واقعاتِ مرثیہ کی ترتیب میں ابتدائی تفصیلات کے نقطۂ نظر سے اس مرثیے کی خصوصی اہمیت ہے۔ مرثیے کی ابتدا سے ہی انیسؔ ایک حزنیہ ماحول پیش کرتے ہیں۔ سفر کے اندیشے، راستے کے خطرات اور آئندہ پیش آنے والے سانحات کی ایک ہلکی سی جھلک اس مرثیے میں موجود ہے۔ جناب زینبؑ کا یہ بیان کہ۔

اس کوچ کے انجام سے آگاہ ہے زینبؑ

اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ امام حسینؑ اور دیگر اہل خانہ کو اس صورت حال کا بخوبی اندازہ تھا جس سے وہ عنقریب دوچار ہونے والے تھے لیکن یہ انکی حق پرستی اور امام حسینؑ کے لیے انکی جانثاری تھی کہ سب کے سب سفر کے لیے امامؑ کے ہمراہ جانے کے لیے تیار تھے۔ اس طرح اگر ایک طرف انیسؔ نے مرثیوں کے کرداروں کی حق آگاہی، جانثاری اور حکم خدا پر جان و مال قربان کر دینے کا جذبہ پیش کیا ہے تو دوسری طرف ابتدائی تفصیلات میں ہی واقعہ کے انجام کی طرف ایک لطیف سا اشارہ کر کے سامع کے ذہن کو متجسس کر دیا ہے اور اس طرح انہوں نے اپنے سامعین کو ذہنی طور پر مرثیے کے بنیادی واقعے کی طرف پوری طرح متوجہ بھی کر لیا ہے۔

واقعات کی تفصیل کو بالترتیب آگے بڑھانے والے بیانات انیسؔ نے اپنے دوسرے مرثیے

جب کربلا میں داخلۂ شاہِؑ دیں ہوا

میں پیش کیے ہیں۔ جس میں ساحلِ دریا پر خیامِ حسینیؑ برپا کیے جانے کے انتظامات، لشکرِ حرؑ کی دخل اندازی، حالات کا سنگین صورت اختیار کر لینا، حضرت عباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ کا جوشِ غیظ و غضب اور امام حسینؑ کا استقلال اور صبر و تحمل اور جناب زینبؑ کا حضرت عباسؑ کو غیظ و غضب تھام لینے کے لیے قسمیں دینا، امام حسینؑ کا چھوٹے بھائی حضرت عباسؑ کو ساحلِ دریا سے خیموں کو ہٹا لیے جانے پر راضی کر لینا، وغیرہ واقعات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ جس سے کربلا میں آمد کے فوراً بعد پیش آنے والے واقعات کی تفصیل سامنے آتی ہے۔

اس مرثیے میں انیسؔ نے اصحاب و اعزّہ کے علاوہ بہت تفصیل کے ساتھ حضرت عباسؑ کا کردار پیش کیا ہے۔ ابوالفضل العباسؑ کا ابتدائی تعارف انیسؔ مدینہ سے وقت رخصت ہی پیش کر چکے ہیں جس سے امام حسینؑ کے کنبے میں انکی خصوصی اہمیت اور امام حسینؑ کے ہر کام میں انکی خصوصی شمولیت کا احساس سامع کے ذہن میں پہلے سے ہی پیدا ہو چکا ہے۔ لہٰذا جب سرزمینِ کربلا پر امام حسینؑ کا قافلہ پہنچتا ہے تو سب سے زیادہ فعال اور متحرک نظر آنے والا کردار بھی فطری طور پر حضرتِ عباسؑ کا ہی ہوتا ہے۔ آپ کو خیام جلد از جلد برپا کیے جانے کی فکر لاحق ہے کیونکہ ہمراہ کئی ایسے بچے ہیں جو نازکی میں گلوں سے بھی زیادہ تر ہیں۔ چنانچہ آپ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کرتے ہیں۔

خیمہ کہاں بپا کریں اے شاہِؑ نامور

حضرت عباسؑ امام حسینؑ کے قوّتِ بازو ہیں، کنبے کے ایک ذمہ دار جوان ہیں، ہر معاملہ کے انتظام کی ذمہ داری آپ ہی پر ہے لہٰذا آپ کو تمام افراد خاندان کے آرام و تکلیف کا بھی سب سے زیادہ خیال ہے۔ جس کا اظہار ان کی زبان سے ادا ہونے والے ان الفاظ سے واضح طور پر ہو رہا ہے۔

ایذا ہے محملوں میں بہت اہلِ بیت پر　　بچّے ہیں نازکی میں گُلوں سے زیادہ تر

اور

کب سے عماریوں کے ہیں پردے چھٹے ہوئے　　گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے گھٹے ہوئے

حضرت عباسؑ گرمی کے اس موسم میں پردہ دار خواتین کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے جلد از جلد خیمے لگانا چاہتے ہیں تاکہ وہ عورتیں جو محملوں کے پردوں کے پیچھے گرمی کی اذیتّیں جھیل رہی ہیں آرام پائیں اور نازک بدن کم سن بچوں کو بھی گرمی سے راحت حاصل ہو۔ امام حسینؑ ہر معاملے میں بہن زینبؑ کے مشورے کی قدر کرتے ہیں، چنانچہ یہ جواب دیتے ہیں۔

کچھ سوچ کر امامِ دو عالم نے یہ کہا　　زینبؑ جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو بپا

حضرت عباسؑ یہ سنتے ہی جناب زینبؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کرتے ہیں۔

برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا؟

ان جملوں سے اگر ایک طرف قیام کے موقع پر پیش آنے والی صورت حال کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے تو دوسری طرف خاندان کے افراد کا باہمی تعلق، ایک دوسرے کے لیے عزّت و احترام کے جذبات کا اظہار اور خصوصاً حضرت عباسؑ کی بھائی اور بہن کے احکامات کے سلسلہ میں اطاعت گزاری اور فرماں برداری کا نہایت خوبصورت بیان انیسؔ نے کیا ہے۔

غرض حضرت عباسؑ خیمے نصب کرنے کی اجازت لے کر مصروف ہو جاتے ہیں لیکن اسی وقت دور سے ایک رسالہ آتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کی طرف سب سے پہلے حضرت عباسؑ کی ہی توجہ جاتی ہے ان کو آنے والوں کی یہ گستاخانہ آمد سخت ناگوار گزرتی ہے کیونکہ یہاں پردہ دار بیبیاں قیام پذیر ہیں جنکا تعلق اہلِ بیتؑ رسولؐ سے ہے لہٰذا ہر ایک پر ان کا احترام لازمی ہے۔

بولے ملازموں سے یہ عباسِؑ باوفا　　دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے ان کا کیا

آتے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کون سا　　کہہ دو کہ اہلِ بیتؑ کے خیمے کی ہے یہ جا

لازم رسولؐ زادیوں کا احترام ہے
اتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے

اس کے علاوہ امام حسینؑ جن کا مرتبہ حضرت عباسؑ کے لیے کسی شہنشاہ سے کم نہیں وہ اس مقام پر کرسی نشین ہیں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑ کر آنے والی گرد ان کے جسم مبارک کو آلودہ کر رہی ہے، یہ بات عباسؑ کو سخت ناگوار ہے۔

کرسی نشیں ہے لختِ دلِ سیّدالبشر　　آئین خسروی سے یہ واقف نہیں مگر

آتی ہے اڑ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد ادھر　　کیا ہے جو روکتے نہیں باگیں یہ خیرہ سر

بھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں
شاید ہوا کے گھوڑے پہ ظالم سوار ہیں

یہاں حضرت عباسؑ کے لب و لہجے میں وہی رعب و دبدبہ اور تحکم و وقار ہے جو کسی اعلیٰ فوجی افسر کے شایانِ شان ہے اور ''اتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے'' یہ تحکمانہ انداز اگر ایک طرف عباسؑ کے جاہ و حشم کو ظاہر کرتا ہے تو دوسری طرف خاندانِ رسالتؐ سے انکی بے پناہ عقیدت کے جذبات کا بھی آئینہ دار ہے۔ انیسؔ نے ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے نکات سے اپنے کرداروں کے نقوش ابھارے ہیں۔ بظاہر ان باتوں میں کسی صورتِ حال کو پیش کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن اس صورت حال کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ انیسؔ اپنے کرداروں کی زبان سے ادا ہونے والے ہر جملے کے لفظ لفظ کو کردار کی سیرت کا آئینہ دار بنا دیتے ہیں جس میں اس کی شخصیت کے تمام پہلو عکس ریز ہوتے ہیں۔ ''بھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں'' یہ جملہ حضرت عباسؑ کی شخصیت سے پردے اٹھاتا ہے۔ اور شجاعت اور بہادری کے ساتھ ساتھ اس کردار کی بے پناہ قوتِ ضبط کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ مگر آنے والے فوجی دستہ کا یہ ایک جملہ۔

ہم گھاٹ روکنے کے لیے آئے ہیں ادھر

حضرت عباسؑ کے غیظ و غضب کو یک لخت نقطۂ عروج تک پہنچا دیتا ہے

سنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیر نر　　تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضے پہ کی نظر

اور۔۔۔۔۔۔۔

کم تھا نہ ہمہمہ اسدِ کردگار سے　　نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

اور۔۔۔۔۔۔۔

غصّے میں رکھ کے دوش پہ شمشیرِ برق دم　　نعرہ کیا اسد نے کے تم سے ہٹیں گے ہم
گر فوجِ قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم　　گرنا ہے کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم

بپھریں جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی

انیسؔ نے اپنے کرداروں میں ضبط و تحمّل کے ساتھ ساتھ غیظ و غضب کے عنصر کو اس طرح ابھارا ہے کہ اس کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا ہے۔ جب ہم اس مصرعے کو پڑھتے ہیں 'نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے'' تو حضرت عباسؑ کے غیظ و غضب اور جلال و ہیبت کا رعب ہمارے دل پر طاری ہو جاتا ہے۔ حضرت عباسؑ کا جوشِ شجاعت میں شانے پر تلوار رکھ کر یہ کہنا کہ ''تم سے ہٹیں گے ہم'' ان کی خود اعتمادی اور ان کے بالمقابل مخالفین کی بے بضاعتی کا خوبصورت اشاراتی بیان ہے۔

انیسؔ واقعہ نگاری کے اس موڑ پر ایک زبردست تصادم کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ حضرت عباسؑ مخالف دستے کی اس روک ٹوک سے

شدید طور پر مشتعل ہیں اور ایک بپھرے ہوئے شیر کی مانند ترائی میں مخالفین کو للکار رہے ہیں اس کے جواب میں دوسری طرف مکمل خاموشی ہے۔ کسی کی ہمّت نہیں ہے کہ بڑھ کر کچھ کلام کرے۔ غضب کے عالم میں بھی عباسؑ جنگ میں پیش قدمی نہیں کرتے اور اپنے طور پر مخالفین کو ہر طرح سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تم کون ہو حسینؑ ہیں مختارِ خشک و تر　　انکے سوا ہے کون شہنشاہِ بحر و بر
دیکھو فساد ہو گا بڑھو کے اگر ادھر　　شیروں کا یاں عمل ہے تمھیں کیا نہیں خبر
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

یہاں ''دیکھو فساد ہوگا بڑھو گے اگر ادھر'' اور ''بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں'' ان دو جملوں سے انیسؔ نے حضرت عباسؑ کا غیظ و غضب اور صبر و تحمّل دونوں اس خوبی کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے جس سے بہتر بیان کیے جانے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سامع کسی بڑے معرکے کی امید کرنے لگتا ہے، لشکرِ حسینؑ کے جوان مشتعل ہیں اور قریب ہے کہ لڑائی ٹھن جائے۔ مگر حسینؑ کا بھائی علمدارِ لشکرِ حسینؑ اپنے غیظ و غضب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ہر صورت میں ٹکراؤ سے بچنا چاہتا ہے، لہٰذا نہایت مدلّل گفتگو کرتے ہوئے مخالفین کو مداخلت سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہم پہلے آئے ہیں کہ تم آئے ہو تا بہ نہر　　کیوں غاصبو یہ نہر نہیں فاطمہؑ کا مہر
چھوڑ آئیں ہیں تمھارے بلانے پہ اپنا شہر　　کوئی مسافروں پہ یہ کرتا ہے جبر و قہر
اترے ابھی نہیں کہ لڑائی ٹھہر گئی
وعدے وہ کیا ہوئے وہ محبّت کدھر گئی

ہر چند خاکسار ہیں فرزندِ بوترابؑ　　پر سرکشی کی ہم سے کسی کو نہیں ہے تاب
کہنی تک آستیں کو جو الٹیں دمِ عتاب　　گردوں پہ تھرتھرا کے چھپے قرصِ آفتاب
آجائے انقلاب کہ آفت جہان پر
ہو آسماں زمیں پہ زمیں آسمان پر

کسی بھی مقام پر دنیاوی اعتبار سے پہلا حق اس شخص کا ہوتا ہے جو پہلے اس مقام پر پہنچا ہو۔ اس اعتبار سے چونکہ دریا کے کنارے فوجِ حسینؑ پہلے آئی لہٰذا اس کے حق کو اوّلیت حاصل ہے، مزید برآں ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ جب جنابِ فاطمہؑ کا عقد حضرت علیؑ کے ساتھ ہوا تو خدا نے تمام عالم کے دریا آپ کے مہر میں دے دیئے۔ اس اعتبار سے بھی پانی پر اولادِ فاطمہؑ کے حق کی اولیّت مسلّمہ ہے۔ ان دو وجوہات کے علاوہ تیسری اہم وجہ عرب کی مہمان نوازی کی روایت ہے، خود مہمان بلا کر مہمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کرنا اس روایت کے برخلاف ہے، اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ علیؑ کے بیٹے بظاہر خاکسار ہیں مگر ان کو کسی کی سرکشی کی تاب نہیں اور اگر جلال آجائے تو یہ سارے عالم کو تہ و

بالا کر سکتے ہیں۔لہٰذا ان چار اہم دلیلوں کے ذریعہ علیؑ کا شیر فوجِ مخالف کو دریا سے دور رہنے کی تنبیہ کرتا ہے۔ہاشمی خون رگوں میں موجیں مار رہا ہے، انکی حمیّت کسی طور پر اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی کہ اس خطۂ زمین میں کسی اور کا عمل دخل ہو جس کو اس شیر بیشۂ شجاعت نے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔حضرت عباسؑ کی اس مدلّل تقریر سے مخالفین کے حواس گم ہیں، ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے، صرف ایک شیر ہے جس کے گرجنے کی صدا ترائی میں گونج رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انیسؔ نے اس مقام پر واقعے کو ایک سنسنی خیز موڑ دیا ہے، سامع دم بخود آئندہ پیش آنے والے واقعات سننے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتا ہے۔کبھی ایسا لگتا ہے کہ اب جنگ چھڑ جائے گی اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ بات چیت سے معاملہ رفع دفع ہو جائے گا اور ساحلِ دریا پر سپاہِ حسینیؑ کا قبضہ برقرار رہے گا۔حضرت عباسؑ غیظ وغضب کی شدّت کے باوجود تحمّل سے کام لے رہے ہیں جس کی وجہ سے مخالفین کے حوصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔

ظالم بگڑ بگڑ کے بڑھے ایک بار سب　　بلوہ جو ہو گیا سمٹ آئے سوار سب
نیزے علم کیے ہوئے تھے نیزہ دار سب　　باندھے تھے ایک غول ضلالت شعار سب
لیکن ملا نہ سکتے تھے آنکھیں دلیر سے
اک شور تھا کہ چھین لو دریا حسین سے

فوجیں بڑھ بڑھ کر آ رہی ہیں مگر حضرت عباسؑ کی دہشت سے کسی کو پیش قدمی کی جرأت نہیں ہو رہی ہے۔اس طرف رفیقانِ حسینیؑ کا طیش بھی ضبط کی حدوں سے تجاوز کر چکا ہے، حضرت عباسؑ پر دوہری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، حکمِ امامؑ کے بغیر جنگ میں پیش قدمی بھی نہیں کرنی ہے لہٰذا ہاشمی جوانوں کو پیش قدمی سے روکنا ہے ساتھ ہی مخالف کو بھی پیش قدمی سے باز رکھنا ہے، اور خود اپنے جلال پر بھی قابو پانا ہے۔حسینؑ کا قوّتِ بازو ان تمام ذمہ داریوں کو بہ حسن وخوبی انجام دے رہا ہے۔

آگے تھے سب کے حضرتِ عباسِؑ ذی حشم　　بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دم بہ دم
تیغیں جو تولتے تھے ادھر بانیِ ستم　　کہتے تھے سر نہ ہوگا بڑھایا اگر قدم
لرزاں تھا رعبِ حق سے ہر اِک نابکار کو
روکے تھا ایک شیرِ جری دس ہزار کو

حضرت عباسؑ کے جلال سے سب واقف ہیں ترائی پر ہونے والی ہلچل سے جب جنابِ زینبؑ خبردار ہوتی ہیں تو گھبرا جاتی ہیں۔کیا وجہ ہے کہ عباسؑ اس قدر ناراض ہیں۔امام حسینؑ کے بعد کنبہ کی بزرگ ترین ہستی آپ ہی ہیں لہٰذا ہمہ وقت سب کی فکر آپ کو لاحق رہتی ہے۔خصوصاً امام حسین اور علی اکبرؑ سے خاص تعلق رکھنے کے سبب آپ فوراً یہ سوچ کر پریشان ہو جاتی ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر کوئی مصیبت آ جائے۔

چلّائی رو کے زینبِؑ ناشاد و نامراد　　ہے ہے خبر تو لو کہ یہ کس سے ہوا فساد

غربت زدوں سے کیا سببِ کینہ و عناد　　دیکھے کوئی کدھر ہیں شہنشاہِ خوش نہاد
ہمشیر کو نثارِ امامؑ امم کرو
لوگوں دعائیں اکبرؑ مہ رو پہ دم کرو

جنابِ زینبؑ ساحلِ دریا پر پیش آنے والی کشمکش سے گھبرا کر فضہؑ کو آواز دیتی ہیں اور فضہؑ اس صورت حال کے سلسلے میں مزید تفصیلات بہم پہنچاتی ہیں۔

بلوہ کنارے نہر ہے یا بنتِ مصطفیٰؐ

اور پھر حضرت عباس کی ناراضگی کی خبر ان لفظوں میں دیتی ہیں۔۔۔

کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو　　سب دشت گونجتا ہے وہ غصّہ ہے شیر کو

جنابِ زینبؑ چھوٹے بھائی کے غیظ و غضب کے تصوّر سے پریشان ہوجاتی ہیں۔

ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انھیں جلال

پھر حضرت عباسؑ سے غصّہ ضبط کرنے کی گزارش کرتی ہیں اور ہر حالت میں لڑائی کو ٹالنے کی گذارش کرتی ہیں، اس کے لیے اگر ترائی چھوڑنے کی بھی نوبت آجائے تو گوارہ ہے۔

قربان ہو گئی نہ لڑائی کا نام لو　　میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصّے کو تھام لو

اور۔۔۔

دریا کو روکتے ہیں اگر بانیِ ستم　　جلتی زمیں پہ بچّوں کو لے کر رہیں گے ہم

حضرت عباسؑ کے کردار کے خاص اوصاف سعادت مندی اور بزرگوں کا احترام ہیں، وہ کوئی بھی فیصلہ امام حسینؑ کی رضا حاصل کیے بغیر نہیں کر سکتے، ہر چند کے تمام اصحاب و اعزّہ تلواریں سونت سونت کر آمادۂ جدال ہیں مگر عباسؑ ضبط سے کام لے کر حکمِ امامؑ کا انتظار کر رہے ہیں۔ شیر سے ترائی چھین لینا ناممکن ہے مگر امامؑ کی خواہش کچھ اور ہی ہے۔ وہ تو یہاں ہر طرح کی قربانیاں بارگاہِ خدا میں پیش کرنے آئے ہیں، آرام و راحت سے کوئی سروکار نہیں اور ذاتی مقاصد کے حصول کی خاطر جنگ کرنا شیوۂ امامت نہیں۔ لہٰذا امامؑ حضرت عباسؑ کو ترائی سے جدا خیمے نصب کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہیں اور غم و غصّے کو ضبط کرنے کے لیے دلیر بھائی کو اپنے سر کی قسم دے دیتے ہیں۔

آقا نے دی جو اپنے سرِ پاک کی قسم　　بس تھر تھرا کے رہ گیا وہ صاحب کرم
پر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم　　چپ ہو گئے قریب جو آئے شہ امم
گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

اس موقعے پر انیسؔ نے واقعے کو ایک بالکل غیر متوقع موڑ دیا ہے۔ سامعین دم بخود ہیں کہ دیکھیں ساحل دریا پر کیا ٹھہرتی ہے۔ سننے

والوں کو یقین محکم ہے کہ شیر کو ترائی سے ہٹانا ممکن نہیں اور عنقریب یزیدی رسالے کو ہی ساحل سے ہٹنا پڑے گا۔ مگر دیکھتے دیکھتے واقعہ ایک بالکل نیا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ ساحل پر بپا ہونے والی ہلچل سے ایک طرف حضرت زینبؑ پریشان ہو کر بھائی کو ساحل سے ہٹ جانے کے لیے کہہ رہی ہیں تو دوسری طرف امام حسینؑ اپنے سرِ پاک کی قسم دے دیتے ہیں۔ عرب کے بہادر اور دلیر نوجوان کے لیے یہ مرحلہ نہایت دشوار ہے، ایک طرف بزرگوں کا احترام اور دوسری طرف اپنے جذبات پر قابو پانا، ساحل کو چھوڑ کر ہٹنا ایسا ہی ہے جیسے شیر کے منھ سے شکار چھین لیا جائے مگر اطاعتِ امامؑ جزوِ دین ہے جس سے سرتابی کا تصوّر بھی ممکن نہیں، لہٰذا حکمِ برادر پر سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔۔۔

تیغ و سپر کو پھینک کے بولا وہ نامور　　کہہ دیجے ان سے کاٹ کے لے جائیں میرا سر
حکمِ خدا ہے حکمِ شہنشاہِؑ بحر و بر　　اب کچھ کہوں زبان سے کیا تاب کیا جگر
میں ہوں غلام آپکے ادنیٰ غلام کا
آقا مجھے خیال تھا بابا کے نام کا

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انیسؔ کے مرثیوں میں واقعات خود عناصر ترکیبی کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں، ان مرثیوں کو سلسلہ وار پڑھ کر جو واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔۔۔

ایک شخص اپنے وطن اور ایک بیمار دختر کو چھوڑ کر، پورے کنبہ کے ساتھ جنگلوں اور پہاڑوں کی دشوار مسافتیں طے کر کے ایک بیابان و ویران میں پہنچتا ہے، پورے صحرا میں ایک ہی دریا ہے، سفر سے تھکے ماندے مسافر اس دریا کے کنارے اتر پڑتے ہیں مگر ابھی کمریں کھول بھی نہیں پائے ہیں کہ ایک لشکر مخالف سمت سے آ کر دخل انداز ہوتا ہے اور خیمے ساحل دریا سے الگ ہٹا لے جانے کو کہتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں دونوں لشکروں کے درمیان سخت کشمکش کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے قریب ہے کہ لڑائی چھڑ جائے مگر میر کارواں کی مداخلت اور صبر و تحمل کے نتیجہ میں جنگ اور خونریزی نہیں ہوتی اور بالآخر خیام ساحل دریا سے ہٹ کر برپا کئے جاتے ہیں۔

یہاں تک کے واقعات ان دو مرثیوں ''فرزندِ پیمبرؐ کا مدینے سے سفر ہے'' اور ''جب کربلا میں داخلہ شاہِؑ دیں ہوا'' کے ذریعہ سلسلہ وار طور پر آتے ہیں۔ یہ واقعات محرّم کی دوسری تاریخ تک کے ہیں۔ جس روز امامِ حسینؑ کا داخلہ سرزمین کربلا میں ہوا تھا لیکن اس کے بعد دو محرّم کے بعد سے شبِ عاشور تک کی کوئی تفصیل مذکورہ مرثیہ میں نہیں ملی البتہ روزِ عاشورہ حضرت عباسؑ کی جنگ اور شہادت کے مناظر پیش کر کے انیسؔ نے مرثیہ تمام کر دیا۔ سرزمینِ کربلا میں داخل ہونے سے لے کر شب عاشورہ تک کے واقعات کسی بھی مرثیہ میں تفصیل کے ساتھ نہیں ملتے۔ البتہ شبِ عاشورہ کا بیان انیسؔ نے خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انکے دو اہم مراثی۔

جب دشتِ مصیبت میں علیؑ کا پسر آیا

اور

جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی

خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مرثیوں میں انیسؔ نے شبِ عاشورہ کی ہیبت ناکی، پرحول ماحول اور پراندوہ تاریکی کا موثر بیان کیا ہے۔

یہ مرثیے رات کی اس منظرکشی کے اعتبار سے ایک مخصوص ڈرامائی کیفیت رکھتے ہیں۔مگر مجموعی قصّے کے ارتقا کے سلسلہ میں یہ مراثی بھی تہی داماں نظر آتے ہیں۔ واقعات کا یہ تسلسل صبحِ عاشورہ کے بیان سے دوبارہ شروع ہوتا ہے اور واقعات کے ترتیب وار بیان کے ساتھ عصرِ عاشورہ پر ختم ہوتا ہے۔کچھ مرثیوں میں شہادتِ امام حسینؑ کے بعد کے واقعات، کربلا سے زندان شام تک کے سفر کی روداد اور راستے میں شیریں کے ملنے کے واقعہ کا بھی بیان ملتا ہے۔انیسؔ نے ان واقعات کو الگ الگ مرثیوں میں علیحدہ علیحدہ پیش کیا ہے جن کو مرتّب کرنے پر روزِ عاشورہ کے تمام واقعات سامنے آتے ہیں۔

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

اس ایک مرثیے میں انیسؔ نے صبحِ عاشورہ سے لے کر شہادتِ امام حسینؑ تک کے تمام واقعات مختصراً پیش کیے ہیں۔اس مرثیے کے ذریعے واقعات کے تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے انیسؔ نے مرثیے کی ابتدا صبحِ عاشورہ کی منظرکشی سے کی ہے۔

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے　　جلوہ کیا سحر کے رُخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہِؑ گردوں رکاب نے　　مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہوا عیاں　　تشریف جانماز پہ لائے شہِؑ زماں
سجّادے بچھ گئے طرفِ شاہِؑ انس و جاں　　صوتِ حسن سے اکبرِؑ مہرو نے دی اذاں
ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسولؐ کی کانوں میں آ گئی

عاشور کی پرہول رات ختم ہوتی ہے اور آسمان پر صبح صادق کا اجالا نمودار ہوتا ہے اور امام حسینؑ آسمان کی طرف نگاہ کر کے رفیقوں کو نماز کیلئے پکارتے ہیں۔خود جانماز پر تشریف لاتے ہیں، اطراف میں اعزہ واحباب مصلّے بچھا کر صفیں آراستہ کرتے ہیں، علی اکبرؑ اپنی مخصوص آواز میں اذان دیتے ہیں جس کو سن کر حضرت محمدؐ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، سب کی آنکھیں اشکبار ہوجاتی ہیں۔اب انیسؔ فوجِ یزیدی کی طرف توجہ دیتے ہیں۔

زاری تھی التجا تھی مناجات تھی ادھر　　واں صف کشی و ظلم و تعدّی و شور و شر
کہتا تھا ابنِ سعد یہ جا جا کے نہر پر　　گھاٹوں سے ہوشیار ترائی سے با خبر
دو روز سے ہے تشنہ دہانی حسینؑ کو
ہاں مرتے دم بھی دیجو نہ پانی حسینؑ کو

ایک طرف نمازیں ادا ہو رہی ہیں، تسبیح وتہلیل کی صدائیں گونج رہی ہیں دوسری طرف لشکرِ مخالف میں زبردست صف آرائیاں ہیں،

خصوصاً ابنِ سعد گھاٹ کے پہرے داروں کو ہوشیار رہنے کے لیے سخت ترین تاکیدیں کر رہا ہے۔

بیٹھے تھے جانماز پہ شاہِؑ فلک سریر　　ناگہ قریب آ کے گرے تین چار تیر
دیکھا ہر اک نے مڑ کے سوئے لشکرِ شریر　　عباسؑ اٹھے تول کے شمشیرِ بے نظیر
پروانہ تھے سراجِ امامت کے نور پر
روکی سپر حضورِ کرامت ظہور پر

ادھر لشکرِ حسینؑ میں نماز کی ادائیگی کے بعد تمام اصحاب اور اعزّہ بڑھ بڑھ کر مصافحہ کے لیے آ رہے ہیں۔ دفعتاً لشکرِ مخالف سے دو چار تیر آ کر مصلّے کے قریب گرتے ہیں۔ یہ گویا لشکرِ مخالف کی جانب سے آغازِ جنگ کا اعلان ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے حضرت عباسؑ فوراً امامؑ کو سپر کے سائے میں لے لیتے ہیں۔ اسی صورت میں آپ ڈیوڑھی تک تشریف لاتے ہیں اور رفیقوں کو ہدایات دیتے جاتے ہیں۔ ''کمریں کسو جہاد پہ منگواؤ راہوار'' یہ کہہ کر آپ حرم میں داخل ہوتے ہیں،۔

فرما کے یہ حرم میں گئے شاہِؑ بحر و بر　　ہونے لگیں صفوں میں کمر بندیاں ادھر
جوشن پہن کے حضرتِ عباسؑ نامور　　دروازے پر ٹہلنے لگے مثلِ شیرِ نر
پرتو سے رخ کے برق چمکتی تھی خاک پر
تلوار ہاتھ میں تھی سپر دوشِ پاک پر

خیمے میں جا کے شہؑ نے یہ دیکھا حرم کا حال　　چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینبؑ کی یہ دعا ہے کہ اے ربِّ ذوالجلال　　بچ جائے اس فساد سے خیرالنساءؑ کا لال
بانوئےؑ نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

آفت میں ہے مسافرِ صحرائے کربلا　　بے کس پہ یہ چڑھائی ہے سیّد پہ یہ جفا
غربت میں ٹھن گئی جو لڑائی تو ہو گا کیا　　ان ننھے ننھے بچّوں پہ کر رحم اے خدا
فاقوں سے جاں بلب ہیں عطش سے ہلاک ہیں
یارب ترے رسولؐ کی یہ آلِؑ پاک ہیں

امامؑ خیمے کے اندر تشریف لے جاتے ہیں۔ ادھر مجاہدینِ حق کے درمیان جنگ کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ خصوصاً حضرت عباسؑ کو سب سے زیادہ امامؑ کی حفاظت کا خیال ہے۔ اس لیے آپ جوشن پہن کر خیمے کے دروازے پر ہی ٹہلنے لگتے ہیں۔ امامؑ خیمے کے اندر یہ حال دیکھتے ہیں کہ تمام بی بیاں بال بکھرائے پریشان حال کھڑی ہیں۔ خصوصاً بہن زینب حد سے زیادہ مضطرب ہیں امامؑ بہن کو دلاسہ دیتے ہیں۔

مضطر نہ ہوں دعائیں ہیں تم سب کی مستجاب

امام کو اب بھی نانا کی اُمّتِ عاصی کی ہدایت کی تمنّا ہے۔

خود جا کے میں دکھاتا ہوں انکو رہ ثواب

اور پھر بہن سے بزرگوں کے تبرکات طلب کرتے ہیں۔۔۔

لاؤ　تبرکّات　رسالتؐ　پناہ　کا

امام لشکرِ یزید کو اب بھی ہدایت دینا چاہتے ہیں، ان کا مقصد جنگ کرنا نہیں بلکہ اطاعتِ حق کی تعلیم دینا ہے، لہٰذا اس خطاب کے لیے کچھ خصوصی تیاریاں بھی مقصود ہیں۔

معراج میں رسولؐ نے پہنا تھا جو لباس　　کشتی میں لائیں زینبؑ اسے شاہِ دیں کے پاس
سر پر رکھا عمامۂ سردارِ حق شناس　　پہنی قبائے پاکِ رسولؐ فلک اساس
بر میں درست و چست تھا جامہ حسینؑ کا
رومال فاطمہؑ کا عمامہ رسولؐ کا

آج نواسے کو نانا کی اُمّتِ عاصی کی ہدایت کرنی ہے لہٰذا لباس بھی وہ منتخب کیا ہے جس کو دیکھ کر دیکھنے والوں کے ذہن میں رسولِ عربی کی یاد تازہ ہو جائے۔ انہیں احساس ہو کہ آج وہ اس شخص سے آمادۂ جدال ہیں جس کے نانا کے امتّی ہونے کا دم بھرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ امامؑ کو لباسِ محمدیؐ میں دیکھ کر لشکرِ مخالف قتلِ حسینؑ کا ارادہ ترک کر دے مگر یقین نہیں لہٰذا جنگ کی تیاری بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اسلحوں کا صندوق منگا کر کھولتے ہیں، سامنے ذوالفقارِ حیدری ہے جسے آپ زیبِ کمر کرتے ہیں، ادھر امامؑ اسلحہ جات سے آراستہ ہو رہے ہیں اور اس طرف لشکرِ حسینیؑ کا علم تیار ہو رہا ہے۔ امامؑ کی یہ تیاریاں دیکھ دیکھ کر اہلِ حرم کا حال غیر ہے، سیدانیاں بال بکھرائے زیرِ علم گریاں کناں ہیں۔ زینبؑ چوبِ خیمہ سے سر ٹکائے اشک فشاں ہیں۔ ادھر عونؑ و محمدؑ جو جعفرِ طیّار کے پوتے اور علیؑ کے نواسے ہیں خود کو ورثہ دارانِ علم سمجھتے ہوئے نہایت جوش و خروش کے ساتھ زیرِ علم آ کھڑے ہوتے ہیں۔ بچّوں کو معلوم ہے کہ ماموں جان بغیر اماں کے مشورے کے کوئی کام نہیں کرتے لہٰذا ماں کی خدمت میں سفارشیں پیش کرتے ہیں۔

کچھ مشورہ کریں جو شہنشاہ خوش خصال　　ہم بھی محق ہیں آپ کو اس کا رہے خیال

ایک طرف علم پانے کی تمنا بچوں کے دلوں کو بے تاب کر رہی ہے، دوسری طرف اندیشے ہیں کم سنی راہ میں آڑے آ سکتی ہے۔ لہٰذا ماں سے پر جوش انداز میں اپنے حق کے سلسلہ میں دلیل پیش کرتے ہیں۔

طاقت میں کچھ کمی نہیں گو بھوکے پیاسے ہیں　　پوتے انہیں کے ہم ہیں انہیں کے نواسے ہیں

رسولؐ کی علمداری کا شرف چونکہ ایک طرف ان کے نانا اور دوسری طرف ان کے دادا کو حاصل رہا لہٰذا ان کم سن بچوں کے دلوں میں بھی ولولہ ہے کہ اب علم کے اصلی حق دار صرف اور صرف وہی ہیں، ماں بچوں کی اس معصومانہ ضد پر حیران رہ جاتی ہے، ایک طرف انکے حوصلوں کی داد بھی دینا چاہتی ہے مگر دوسری طرف بچوں کی اس بے جا خواہش سے پریشان بھی ہے لہٰذا شفقت و محبّت کے ساتھ یہ جواب دیتی ہے۔

عمریں قلیل اور ہوسِ منصبِ جلیل　　　اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمّت کی ہے دلیل　　　ہاں اپنے ہم سنوں میں تمھارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے

بچّوں کو انکی کم عمری کا احساس دلانا بھی ضروری ہے کہ وہ اس ناجائز ضد پر قائم نہ رہیں۔

ان ننھے ننھے ہاتھوں سے اٹھے گا یہ علم　　　چھوٹے قدوں میں سب سے سنوں میں سبھوں سے کم

تم ابھی بچّے ہو تمھارے ہاتھوں سے علم نہیں سنبھلے گا، تم تو بس امامؑ کے قدموں پر جان نثار کرنے کی فکر کرو کیوں کہ آج کے دن سب سے زیادہ عزّت اور نام اسی میں ہے۔ اصل جوہر وہی ہے جو خود کھل کر سامنے آئے، لہٰذا آج کے دن تم ایسی جنگ کرو کہ۔

فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علیؑ کے ہیں

پھر ماں بچّوں کو اپنی حالتِ زار کی طرف متوجّہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ آج کے دن تو تم کو ماں کی پریشانی کا خیال ہونا چاہیئے نہ کہ تم منصب کے طلبگار رہو اب معلوم ہوا کہ۔۔۔

غم خوار تم مرے ہو نہ عاشق امامؑ کے　　　معلوم ہو گیا مجھے طالب ہو نام کے

ماں کی ناراضگی کو دیکھ کر بچے گھبرا جاتے ہیں اور فوراً ننّھے ننّھے ہاتھوں کو جوڑ کر استدعا کرتے ہیں۔

غصّے کو آپ تھام لیں اے خواہرِ امامؑ

اور

واللہ کیا مجال جو لیں اب علم کا نام

اور پھر اپنے عزائم کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں۔۔۔

فوجیں بھگا کے گنجِ شہیداں میں سوئیں گے　　　تب قدر ہوگی آپکو جب ہم نہ ہوئیں گے

امام حسینؑ بھی بچوں کی ان تیاریوں سے بے خبر نہیں مگر ان کی کمسنی کا خیال منصب علمداری کی راہ میں حائل ہو رہا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

بے شک یہ ورثہ دار جنابِ امیرؑ ہیں　　　پر کیا کروں کہ دونوں کی عمریں صغیر ہیں

امامؑ بہن سے مشورہ طلب کرتے ہیں اور جناب زینبؑ کی زبان سے نکلنے والا نام سوائے عباسؑ کے اور کس کا ہوسکتا ہے۔

شوکت میں قد میں شان میں ہم سر کوئی نہیں　　　عباسِؑ نامدار سے بہتر کوئی نہیں

کیونکہ یہ جوان۔

صفدر ہے شیردل ہے بہادر ہے نیک ہے　　　بے مثل سیکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے

بہن کی زبان سے چھوٹے بھائی کا نام منصب علمداری کیلیئے سن کر امامؑ آب دیدہ ہو جاتے ہیں اور بابا کی وصیّت آپ کو یاد

آجاتی ہے۔۔۔

ہاں تھی یہی علیؑ کی وصیّت بھی اے بہن

منصب علمداری کے لیے فی الحقیقت زینبؑ کی نگاہ میں عباسؑ سے بہتر کوئی ہے بھی نہیں۔انکو اپنے چھوٹے بھائی پر بڑا بھروسا ہے لہٰذا وہ ان سے امام حسینؑ کو اس آفت ومصیبت سے ہر حالت میں بچالے جانے کی گزارش کرتی ہیں۔۔۔

ہو جائے آج صلح کی صورت تو کل چلو　　ان آفتوں سے بھائی کو لے کر نکل چلو

حضرت عباسؑ جناب زینبؑ کا احترام اسی طرح کرتے ہیں جس طرح کوئی غلام کسی شہزادی کا احترام کرتا ہے۔انہوں نے خود کو کبھی امام حسینؑ اور جنابِ زینبؑ کا بھائی نہیں سمجھا۔خود کو غلام اور بھائی بہن کو آقا وشاہزادی جیسا احترام دیا ہے۔اب تو بحیثیت علمدار ان کے فرائض میں مزید اضافے ہوگئے ہیں اور آپ کو اپنے فرائض کی اہمیت کا شدید احساس بھی ہے۔چنانچہ جناب زینبؑ کو تسلّی دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کی عرض میرے جسم پہ جس وقت تک ہے سر　　ممکن نہیں ہے یہ کہ بڑھے فوجِ بد گہر
تیغیں کھنچیں جو لاکھ تو سینہ کروں سپر　　دیکھیں اٹھا کے آنکھ یہ کیا تاب کیا جگر
ساونت ہیں پسر اسدِ ذوالجلال کے
گر شیر ہوں تو چھینک دیں آنکھیں نکال کے

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ علی اکبرؑ آکر مخالف فوجوں کی پیش قدمی کی خبر دیتے ہیں۔امام یہ خبر سن کر خیمے سے باہر تشریف لاتے ہیں۔آگے آگے علم سنبھالے ہوئے حضرت عباسؑ بڑھ رہے ہیں۔امامؑ کو خیمے سے نکلتے دیکھ کر اہل حرم میں قیامت برپا ہوتی ہے۔

شہؑ کے قدم پہ زینبؑ زار و حزیں گری　　بانوؑ پچھاڑ کھا کے پسر کے قریں گری
کلثومؑ تھرتھرا کے بہ روئے زمیں گری　　باقرؑ کہیں گرا تو سکینہؑ کہیں گری
اجڑا چمن ہر اک گل تازہ نکل گیا
نکلا علم کہ گھر سے جنازہ نکل گیا

غرض اس کہرام کے عالم میں امام حسینؑ خیمہ سے باہر تشریف لاتے ہیں،اس کے بعد انیسؔ نے لشکرِ حسینؑ کی زینت اور آرائش وزیبائش کا بیان جن وانس کی زبانوں سے پیش کیا ہے۔اس سلسلہ میں امام کے گھوڑے کی سبک رفتاری،علم کی تنویر،اور لشکر حسینی کی شان وشوکت کی تفصیلیں بیان کرتے ہوئے بالآخر انیسؔ بیان واقعہ کو اس موڑ پر لاتے ہیں جب لشکرِ حسینیؑ پر سمتِ مخالفت سے ایک بار پھر تیروں کی بارش ہوتی ہے جس کے جواب میں امامؑ گھوڑا بڑھا کر ایک بار پھر فوج شام کو نصیحت فرماتے ہیں مگر مخالف فوج سے اسکے جواب میں پھر حملے ہوتے ہیں بالآخر امامؑ خاموش ہوجاتے ہیں اور اب جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔لہٰذا ادھر سے ایک ایک جوان نکل کر مخالف لشکر کے حملوں کا جواب دیتا ہے۔پہلے اصحاب راہ خدا میں اپنے سروں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

نکلے ادھر سے شہؑ کے رفیقانِ تشنہ کام　　بے سر ہوئے پروں میں سرانِ سپاہِ شام

جب دیرینہ رفیقوں کا پرا خالی ہوتا ہے تو عزیزان حسینؑ پئے جہاد روانہ ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے عونؑ و محمدؑ اپنی تلواروں کے جوہر دکھاتے ہیں اور ایسی جنگ کرتے ہیں کہ فوج مخالف میں تہلکہ مچ جاتا ہے۔

ڈر ڈر کے کاٹتے تھے کماں کش کنائیاں　　فوجوں میں تھیں نبیؐ و علیؑ کی دہائیاں

اور

شوکت ہُو ہُو تھی جنابِ امیرؑ کی　　طاقت دکھا دی شیروں نے زینبؑ کے شیر کی

عونؑ و محمدؑ کی شہادت کے بعد قاسمؑ ابن حسنؑ رجز خواں ہو کر فوجِ مخالف پر حملہ آور ہوتے ہیں، جنگ، اور دو روز کی بھوک پیاس میں اس شدّت کی جنگ کہ مخالف فوج میں بھگدڑ مچ جاتی ہے اور آخر کار شام کے نامی گرامی پہلوان ازرق کو واصلِ جہنّم کرنے کے بعد جامِ شہادت نوش فرماتے ہیں۔

کس حسن سے حسنؑ کا جوانِ حسیں لڑا　　گھر گھر کے صورتِ اسدِ خشمگیں لڑا

اور

حملے دکھا دیئے اسدِ کردگار کے　　مقتل میں سوئے ازرقِ شامی کو مار کے

غرض اس طرح اٹھارہ جوانانِ بنی ہاشم میں سے ایک ایک نوجوان شوقِ شہادت میں رزم گاہ میں جاتا ہے اور حرب وضرب کے جوہر دکھانے کے بعد جامِ شہادت نوش کرتا ہے، یہاں تک کہ پورے کنبے میں اب صرف عباسؑ و علیؑ اکبرِ امام حسینؑ کے ساتھ بچتے ہیں، بالآخر علمدارِ حسینؑ بھی رخصت جہاد لے کر وارِ دِمیدانِ کربلا ہوتا ہے اور ایسی غضب کی جنگ کرتا ہے کہ دشمن فوج کی صفیں درہم برہم ہو جاتی ہیں۔ گھاٹ کے پہریدار گھبراہٹ میں دریا میں گر گر کر فوت ہو جاتے ہیں اور علیؑ کا شیر ترائی میں پہنچ کر خشک مشک کو تر کرتا ہے، مگر وفاداری کا جذبہ پانی پینے سے باز رکھتا ہے، مگر افسوس عباسؑ کی ساری محنتیں رائیگاں جاتی ہیں، علمدارِ حسینؑ جب مشکِ سکینہؑ بھر کر ترائی سے لوٹتا ہے تب تک بھاگی ہوئی فوجیں دوبارہ صفیں جما لیتی ہیں، ادھر ایک تنہا جوان اور ادھر ہزاروں کا لشکر، ایک طرف علم کی حفاظت کا خیال دوسری طرف مشکِ سکینہؑ کی حفاظت کی تمنّا، جنگ کریں کہ پانی کی حفاظت، غرض اسی کشمکش میں ہر طرف سے علمدارِ حسینؑ کو گھیر کر ہلاک کر دیتے ہیں، اس تمام واقعہ کو انیسؔ نے درحقیقت مذکورہ بالا مرثیہ میں مختصراً صرف یہ کہتے ہوئے تمام کر دیا ہے کہ۔۔۔

عباسؑ بھر کے مشک کو یوں تشنہ لب لڑے　　جس طرح نہرواں میں امیرِ عرب لڑے

مگر ایک دوسرے مرثیے۔

جب رن میں سر بلند علی کا علم ہوا

میں انیسؔ نے اس واقعہ کو مکمل تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے جس کا ذکر طوالت کے سبب ملتوی کیا جا رہا ہے۔ حضرت عباسؑ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ کے صاحب زادے اور ہم شکلِ رسول علی اکبرؑ میدان جنگ میں آتے ہیں۔

آفت تھی حرب و ضربِ علی اکبرِؑ دلیر　　غصّے میں جھپٹے صید پہ جیسے گرسنہ شیر

سب سر بلند پست، زبردست سب تھے زیر　　جنگل میں چار سمت ہوئے زخمیوں کے ڈھیر
سران کے اترے تن سے جو تھے رن چڑھے ہوئے
عباسؑ سے بھی جنگ میں تھے کچھ بڑھے ہوئے

غرض اس طرح صبحِ عاشورہ سے وقتِ ظہر تک کے مناظر پیش کرتے ہوئے انیسؔ مختصراً خاص خاص شخصیتوں کی جنگ اور شہادت کا بیان کرتے ہیں، یہاں تک کہ ''ہنگامِ عصر خاتمۂ فوج ہوگیا''۔

لاشے سبھوں کے سبطِ نبیؐ خود اٹھا کے لائے　　قاتل کسی شہید کا سر کاٹنے نہ پائے
دشمن کو بھی نہ دوست کی فرقت خدا دکھائے　　فرماتے تھے بچھڑ گئے سب ہم سے ہائے ہائے
اتنے پہاڑ گر پڑیں جس پر وہ خم نہ ہو
گو سو برس جیوں تو یہ مجمع بہم نہ ہو

وقتِ ظہر امام حسینؑ کے لشکر کا خاتمہ ہوتا ہے اور اب امام کی تنہائی کا یہ عالم ہے کہ۔۔۔

لاشے تو سب کے گرد تھے اور بیچ میں امامؑ　　ڈوبی ہوئی تھی خوں میں نبیؐ کی قبا تمام
افسردہ و حزین و پریشان و تشنہ کام　　برچھی تھی دل کو فتح کے باجوں کی دھوم دھام
اعدا کسی شہید کا جب نام لیتے تھے
تھرّا کے دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیتے تھے

حسینؑ میدانِ کارزار میں تنہا کھڑے ہیں، جسم پر خون میں ڈوبی ہوئی ایک ردا ہے اور چاروں طرف عزیزوں اور دوستوں کے لاشے بکھرے پڑے ہیں، حسینؑ نوجوان پسر اور ہم شکلِ رسولؐ کی میّت خاک پر پڑی ہے۔

پڑتی تھی دھوپ سب کے تنِ پاش پاش پر　　چادر بھی اک نہ تھی علی اکبرؑ کی لاش پر

اب امامؑ کے پاس بارگاہِ ایزدی میں نذر کرنے کے لیے سوا ایک شیر خوار بچے کے اور کوئی تحفہ نہیں لہٰذا اب درِ خیمہ پر تشریف لاتے ہیں اور اس آخری ہدیے کو بھی ربّ العزت کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لیے غمزدہ ماں سے طلب کرتے ہیں، ماں سے یہ کیونکر کہیں کہ تمھارے اس چھ ماہ کے بچے کی قربانی بھی اس مقصدِ عظیم کی تکمیل کے لیے ضروری ہے لہٰذا فرماتے ہیں۔

پھر ایک بار اس مہِ انور کو دیکھ لیں　　اکبرؑ کے شیر خوار برادر کو دیکھ لیں

جنابِ شہر بانوؑ اصغرؑ کو ہاتھوں پر لیے ہوئے آتی ہیں، آپ خاک پر بیٹھ کر بچّے کے منھ پر منھ رکھ دیتے ہیں۔

بچّے کو لے کے بیٹھ گئے آپ خاک پر　　منھ سے ملے جو ہونٹ تو چونکا وہ سیم بر

ابھی امامؑ بچّے سے ملتفت تھے کہ کمین گاہ سے بنِ کاہل نے ایک تیر سے بچّے کی گردن کو نشانہ بنایا حسینؑ اس آخری ہدیہ کو سپردِ خاک کر کے اب اپنے سر کی قربانی پیش کرنے میدان کارزار میں تشریف لاتے ہیں، دن ڈھل رہا ہے گرمی کی شدت سے نہرِ علقمہ کا پانی کھولا ہوا ہے،

پیڑوں کے پتّے زرد ہو رہے ہیں اور شاخیں شدّت تپش سے سوکھ کر کانٹا ہو چکی ہیں، چرند و پرند گرمی سے پناہ حاصل کرنے کے لئے پانی میں اتر آئے ہیں اور اس شدّت کی تپش میں امامِ حسینؑ تن تنہا میدان کارزار میں کھڑے ہیں، اب نہ علمدار ہے اور نہ سایۂ علم، تین دن کی بھوک پیاس، عزیزوں کے غم اور جوان بھائی کے صدمے سے زبان کو لکنت ہے، کمر خمیدہ ہے، ادھر لشکرِ یزید میں جانوروں کو سیراب کیا جا رہا ہے، اور ادھر نواسۂ رسولؐ کے لیے قطرۂ آب بھی حرام ہے۔ ادھر پسرِ سعد اس شان سے کھڑا ہے کہ۔۔۔

سر پر لگائے تھا پسرِ سعد چترِ زر　　خادم کئی تھے مروحہ جنباں اِدھر اُدھر

اور ادھر۔۔۔

فرزندِ فاطمہؑ پہ نہ تھا سایۂ شجر

پسرِ سعد اب بھی آپ سے بیعت کا متقاضی ہے۔۔۔

بیعت جو کیجے اب بھی تو حاضر ہے جامِ آب

اور حسینؑ کا جواب تھا۔۔۔

دریا کو خاک جانتا ہے ابنِ بوترابؑ

اور۔۔۔

فاسق ہے پاس کچھ تجھے اسلام کا نہیں　　آبِ بقا ہو اب تو مرے کام کا نہیں

امام حسینؑ اس عالم مظلومیت میں بھی کس قدر با اختیار ہیں کہ۔۔۔

کہہ دوں تو خوان لے کے خود آئیں ابھی خلیلؑ　　چاہوں تو سلسبیل کو دم میں کروں سبیل

اور...

گر جم کا نام لوں تو ابھی جام لے کے آئے　　کوثر یہیں رسول کے احکام لے کے آئے

روح الامیں زمیں پہ مرا نام لے کے آئے　　لشکر ملک کا فتح کا پیغام لے کے آئے

چاہوں جو انقلاب تو دنیا تمام ہو
الٹے زمین یوں کہ نہ کوفہ نہ شام ہو

یہاں انیسؔ نے امام حسینؑ کے لہجے میں ایسا رعب و دبدبہ اور شان و شوکت سمو دی ہے جس سے ان کی شخصیت کے غیر معمولی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ بہ ظاہر حسینؑ تنِ تنہا، بے کس مظلوم اور بے یار و مددگار ہیں، جبکہ دوسری طرف ہزاروں کا مجمع ہے، کوئی اکیلا انسان ایسی صورت میں کہاں تک اپنے حوصلوں کو برقرار رکھ سکتا ہے، پسرِ سعد کو امید ہے کہ اب تو حسینؑ کے سارے جانثار ختم ہو چکے ہیں، خیمے میں اہلِ حرم تنہا ہیں، اب کون سی طاقت ہے جس کے بھروسے پر حسینؑ انکار کریں گے لہٰذا اس نازک موقع پر وہ ایک بار پھر بیعت طلب کرتا ہے، یہاں انیسؔ نے واقعہ کو ایک زبردست ڈرامائی موڑ دیا ہے، سننے والا سکتے میں ہے کہ دیکھیں حسینؑ اب کیا کرتے ہیں، مگر حسینؑ کے عزائم ابھی

تک بلند ہیں، اس کشت وخون کے باوجود آپ کے اعصاب مضمحل نہیں ہوتے ہیں اور اب بھی فوجِ مخالف پر آپ کا رعب ودبدبہ اور جلال و ہیبت طاری ہے اور عالم یہ ہے کہ جب امامِ حسینؑ ذوالفقار کی طرف دیکھتے ہیں تو۔۔۔

تھرّا کے پچھلے پاؤں ہٹا وہ ستم شعار

امامؑ کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ کوئی ان کے مقابل آنے کے لیے تیار نہیں ہے، لہٰذا ایک ساتھ ہر طرف سے نرغہ کیا جاتا ہے اور بیک وقت حسینؑ پر نیزوں، تیروں اور تلواروں کی بارش ہونے لگتی ہے مگر اس عالمِ تنہائی میں بھی حسینؑ نے ایسی جنگ کی ہے کہ ہر طرف سے حسینؑ کی دہائی دی جانے لگتی ہے۔

پھر تو یہ غل ہوا کہ دہائی حسینؑ کی　　اللہ کا غضب ہے لڑائی حسینؑ کی
دریا حسینؑ کا ہے ترائی حسینؑ کی　　دنیا حسینؑ کی ہے خدائی حسینؑ کی
بیڑا بچایا آپ نے طوفاں سے نوحؑ کا
اب رحم واسطہ علی اکبرؑ کی روح کا

امام حسینؑ شدّت کی جنگ کرتے ہیں، پروں کے پرے خالی ہو جاتے ہیں، تلوار باز، کماں دار، نیزہ باز سب کے سب حسینؑ کی ضرب کے آگے پسپا ہیں، ہر طرف الامان، الحفیظ کا شور برپا ہے، اور جنگ کے اس منظر کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب فتح حسین کی ہے، مگر یہ کیا امامؑ نے یہ دفعتاً ہاتھ کیوں روک لیے، شاید کسی نے علی اکبرؑ کے نام کا واسطہ دیا تھا۔۔۔اب حسینؑ کیونکر جنگ کر سکتے ہیں لہٰذا منھ موڑ کر لاشِ پسر سے ہم کلام ہوتے ہیں۔

قسمیں تمہاری روح کی یہ لوگ دیتے ہیں　　لو اب تو ذوالفقار کو ہم روک لیتے ہیں

امامؑ کا ہاتھ رکنا تھا کہ پسرِ سعد بھاگی ہوئی فوجوں کو پھر للکارتا ہے۔۔۔

چلّایا ہاتھ مار کے زانو پہ ابنِ سعد　　اے وا فضیحتا یہ ہزیمت ظفر کے بعد
زیبا دلاروں کو نہیں ہے خلافِ وعد　　اک پہلواں یہ سنتے ہی گرجا مثالِ رعد
نعرہ کیا کہ کرتا ہوں حملہ امامؑ پر
اے ابنِ سعد لکھ لے ظفر میرے نام پر

پسرِ سعد کی آواز سن کر بھاگا ہوا لشکر پلٹ آتا ہے اور حسینؑ کو قتل کرنے کی غرض سے ایک پہلوان آگے بڑھتا ہے، اس بدنہاد کے ساتھ ایک اور پیل تن بھی ہے۔ ایک کو اپنی ضرب گرز پر ناز ہے تو دوسرے کو تلوار زنی پر۔ مگر حسینؑ دونوں ملعونوں کو انہیں اسلحوں سے واصل جہنّم کرتے ہیں جن کے چلانے میں وہ طاق تھے۔

واں اس نے بائیں ہاتھ میں لی تیغِ آبدار　　یاں سر سے آئی پشت کے فقروں پہ ذوالفقار

اور۔۔۔

قربان تیغِ تیزِ شہِؑ نام دار کے　　دو ٹکڑے تھے سوار کے دو راہوار کے

اس طرح ایک ظالم کو قتل کرنے کے بعد اب دوسرے دشمن دیں کا کام گرز سے تمام کرتے ہیں۔۔۔

پھر دوسرے پہ گرز اٹھا کر پکارے شاہؑ　　کیوں ضرب ذوالفقار پہ تو نے بھی کی نگاہ

سرشار تھا شرابِ تکبّر سے روسیاہ　　جاتا کہاں کہ موت تو روکے ہوئی تھی راہ

غل تھا اسے اجل نے بڑھایا جو گھیر کے

لو دوسرا شکار چلا منھ میں شیر کے

آتا تھا وہ کہ اسپِ شہِؑ دیں پلٹ پڑا　　ثابت ہوا کہ شیرِ گرسنہ جھپٹ پڑا

تیغِ شقی نے ڈھال پہ مارا تو پٹ پڑا　　ضربت پڑی کہ گنبد دوّار پھٹ پڑا

پیوند صدرِ زیں جسد و فرق ہو گیا

گھوڑا زمیں میں سینے تلک غرق ہو گیا

غرض اس شکستہ حالی میں بھی حسینؑ نے شدّت کی جنگ کی یہاں تک کہ غیب سے ندائے مرحبا آتی ہے اور حسینؑ لبیک کہہ کر تلوار نیام میں رکھ لیتے ہیں، یہ دیکھ کر بھاگی ہوئی فوجیں سمٹ آتی ہیں، ہر طرف سے نیزہ و تیر و شمشیر کی بارش ہونے لگتی ہے حتیٰ کہ عورسلمٰی اور سنان ابنِ انس بیک وقت سنان و تلوار سے ایسی ضرب لگاتے ہیں کہ امام کا گھوڑے پر سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

قرآن رحلِ زیں سے سر فرش گر پڑا　　دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

ادھر حسینؑ پشتِ فرس سے زمین پر آتے ہیں ادھر۔

پردہ الٹ کے بنتِ علیؑ نکلیں ننگے سر

اور جب قتل گاہ میں جنابِ زینبؑ پہنچتی ہیں تو۔

دیکھا سرِ حسینؑ کو نیزے کی نوک پر

اور اس طرح شہادتِ حسینؑ پر انیسؔ اس واقعہ کا خاتمہ کرتے ہیں جس کا آغاز مدینہ سے روانگی کے ذریعہ ہوا تھا۔

یہی وہ بنیادی واقعہ ہے جس کو انیسؔ نے علیحدہ علیحدہ طور پر پیش کیا ہے۔ ایک ایک مرثیہ ایک ایک مخصوص شخصیت کو مرکز نگاہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ کسی میں عونؑ و محمدؑ کی جنگ اور شہادت کی تفصیل ہے تو کسی میں علی اکبرؑ و عباسؑ کی اور کسی میں خود امام حسینؑ کی۔ انیسؔ نے ان مرثیوں میں جو واقعات پیش کیے ہیں وہ تاریخ سے ماخوذ ہیں مگر ان واقعات کی جو تفصیلات انیسؔ نے پیش کی ہیں جن کے ذریعہ انہوں نے ان واقعات کو زندگی کی حرارت اور روشنی بخشی ہے وہ تفصیلات خود انکی قوّتِ متخیّلہ کی مرہونِ منّت ہیں۔ ان واقعات کے بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا انیسؔ خود حرب و ضرب کے ان معرکوں میں شریک رہے ہوں۔ ہر مجاہد کے ساتھ اس کے گھوڑے کے پہلو بہ پہلو خود بھی چلے ہوں۔ تلواروں کے داؤں پیچ، نیزوں کا ٹکرانا، ڈانڈ کو ڈانڈ پر مار کر مخالف کو بے بس کرنا ایسے بیانات ہیں جن سے خود انیسؔ کی جنگی مہارت کا

ثبوت ملتا ہے۔ دراصل انیسؔ نے ان واقعات کو تاریخ کی محدود روشنی میں نہ پیش کرتے ہوئے خود اپنے تصوّر میں ان واقعات کی جو صورت مرتّب کی تھی اس کو پیش کیا ہے۔ کیا ہوسکتا ہے جب ایک بیمار بیٹی کو تنِ تنہا چھوڑ کر پورا کنبہ کوچ کر رہا ہوتا ہے، پرخطر راستوں پر چلتے ہوئے عورتوں اور بچّوں کو سفر کی کن کن اذیتّوں کا سامنا ہوسکتا ہے۔ کسی دلیر اور شجاع نوجوان کو اگر کوئی بلا سبب روک ٹوک کرے تو اس کے غیض و غضب کا عالم کیا ہوسکتا ہے۔ اٹھّارہ برس کے کڑیل جوان کا لاشہ اٹھاتے ہوئے ایک ضعیف باپ کے قلب وجگر کی کیا حالت ہوسکتی ہے، ان تمام جذبات کی آنچ انیسؔ کے خود اپنے قلب پر محسوس کی، یہی وجہ ہے کہ انکے قلم سے عالمِ تحریر میں آنے والے واقعات میں جذبے کی وہ سچّائی حقیقت کا وہ زندہ احساس اور خلوص کی وہ سادگی نظر آتی ہے جس نے انکے مرثیوں کو ایک زبردست داستانوی آہنگ عطا کیا ہے۔

کسی بھی فن کی تکمیل کے لیے فنکار کو اپنا خون جگر صرف کرنا پڑتا ہے۔ انیسؔ نے بھی اپنا خون جگر صرف کر کے ان مرثیوں کو فن کا ایک لازوال شاہکار بنا دیا ہے۔ کسی بھی واقعہ یا قصّہ کا بیان اسی وقت اثر انگیز ہوسکتا ہے جب اس واقعہ کا بیان کرنے والا بذاتِ خود اس واقعے یا قصّہ میں پیش آنے والے حالات سے عملی یا تخیلی طور پر خود کو اس حد تک وابستہ کر لے کہ یہ واقعہ اس کی ذاتی سرگزشت کی حیثیت اختیار کر جائے۔ انیسؔ نے جس دور میں مرثیہ گوئی کی طرف توجّہ دی وہ دور صنفِ غزل کے عروج کا دور تھا اور مرثیہ گویوں کو کم تر درجہ کا شاعر سمجھا جاتا تھا۔ اس تہذیبی رویے کے باوجود انیسؔ نے اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کو مرثیہ گوئی پر صرف کرنا پسند کیا اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے اس فن کو درجہ کمال پر پہنچا دیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ انیسؔ واقعاتِ کربلا سے ذہنی طور پر عہد طفولیت سے ہی وابستہ رہے اور اس واقعہ کے تمام پہلوؤں پر ان کو مکمل دسترس حاصل تھی۔ نیز انکی زبان اور قوّت متخیّلہ کی تربیت اس دور میں ہوئی جو داستانوں کے عروج کا دور تھا، لہٰذا انیسؔ کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں ہی پر داستانوی رنگ وآہنگ کا اثر نمایاں رہا۔ انیسؔ اپنے طویل مرثیے جب منبر سے ادا کرتے تھے تو لفظوں کی ادائیگی کے وقت چشم وابرو اور ہاتھوں سے اشارے بھی کرتے تھے اور ایسی فضا قائم کر دیتے تھے کہ مجمع مبہوت ہو کر ان کو سنتا رہتا تھا، عین ممکن ہے کہ ادائیگی کا یہ سلیقہ بھی انہوں نے داستان سرائی کے فن سے ہی حاصل کیا ہو جہاں ایک تنہا داستان گو ایک مکمل تخیلاتی اسٹیج کی تشکیل صرف اپنی ذاتی صلاحیتوں کے دم خم پر کرتا اور سامعین سے داد وصول کرتا تھا۔

❁❁❁❁

رباعی

وزن اخرم

جوہر جو تقریر کا دکھلاتے ہیں　　شُستہ لہجہ وہی تو بتلاتے ہیں
جتنے بھی ہیں زباں دان دنیا میں　　اردو سب کو انیسؔ سکھلاتے ہیں

قیصر عباس قیصر

مراثی انیسؔ میں ذکرِ اطفالِ اسیرانِ کربلا

ڈاکٹر ریحان حسن

ہر انسان بچوں سے محبّت کرتا ہے یہ ایک ایسا فطری جذبہ ہے کہ جس کے تحت وہ بچّوں پر تشدد برداشت نہیں کرسکتا شاید اسی لیے دنیا بھر میں معصوم بچوں پر تشدد کو سنگین جرم قرار دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بچوں سے مزدوری کرانے والوں کے خلاف کڑے قانون بھی بنائے گئے ہیں کیوں کہ بچوں سے مزدوری ان میں ذہنی، جسمانی، معاشرتی اور اخلاقی نقصانات کا باعث بنتی ہیں۔ یوں تو دنیا کے تمام مذاہب میں بچوں کے حقوق کی حفاظت پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے بچوں کے حقوق کو پورا کرنے کی تاکید جس طرح کی ہے اس کی نظیر ہمیں دیگر مذاہب میں نظر نہیں آتی۔ اسلام نے بچوں کے ساتھ نیک سلوک اور رحم کرنے کا حکم کچھ یوں دیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

احبوا الصبیان وارحموھم، واذا وعدتموھم ففوالھم، فانھم لا یرون الا انکم ترزقونھم۔ بچوں سے محبت کرو اور ان پر رحم کرو۔ جب ان سے وعدہ کرو تو پورا کرو کیوں کہ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ تم ہی انہیں رزق دیتے ہو۔

بالخصوص یتیم بچوں کے حقوق کی حفاظت و نگہداشت پر قرآن کریم میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں تیئس مقامات پر ہمیں یتیم کا ذکر ملتا ہے۔ جس میں حسن سلوک، اموال کی حفاظت، بچوں کے ساتھ زیادتی اور حقوق و مال غصب کرنے والے پر وعید کی گئی ہے۔ اسلام نے بچوں کے حقوق کی ضمانت اس کی پیدائش سے پہلے دیتے ہوئے مثالی تہذیب کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر ہم لٹریچر کا مطالعہ کریں تو بچوں پر ہونے والے ظلم و زیادتی کا ذکر مختلف زبانوں کے ادباء اور شعراء کے یہاں مل جائے گا۔ لیکن اردو شعراء میں انیسؔ نے جس انداز سے بچوں پر ہونے والے ظلم کو مراثی میں نظم کیا ہے اس کی نظیر ہمیں دیگر زبانوں میں بہت کم دیکھنے کو ملے گی۔ اردو شاعری میں بچوں پر ہونے والے ظلم و تشدد کے خلاف انیسؔ نے جس انداز سے صدائے احتجاج بلند کیا ہے وہ بچوں کے حقوق کی حمایت میں آواز اٹھانے والوں کیلئے نمونہ عمل ہے۔ حضرت امام حسین کے ہمراہ جو اطفال تھے ان کی شجاعت، صبر، استقلال اور بہادری و جاں نثاری کا ذکر انیسؔ نے اپنے مراثی میں اس انداز سے کیا ہے کہ وہ انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے بالخصوص ان پر روا ہونے والے جبر و ظلم کی داستان کو جس انداز سے انیس نے بیان کیا ہے وہ بچوں کے حقوق کی آواز اٹھانے والوں کے لئے ایسا اثاثہ ہے کہ جو اقوام متحدہ کے کارکنان کے لئے بھی بیحد مفید ہے۔ اطفال کربلا میں امام محمد باقرؑ، جناب قاسمؑ، جناب عون و محمدؑ، جناب علی اصغرؑ، اور جناب سکینہؑ پر ہونے والے تشدد کو انیسؔ نے جس دلدوز انداز میں نظم کیا ہے وہ خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے انسان کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ ظالموں کے خلاف صدائے احتجاج اور اظہار نفرت کرنے پر انسان کو مجبور کر دیتا ہے۔ اطفالِ کربلا میں حضرت علی اصغرؑ کے بعد جناب سکینہؑ پر ہونے والے جبر و تشدد کو انیسؔ نے نظم

کرنے میں جو جوہر کمال دکھایا ہے وہ قابل غور ہے۔ کمسن بچی کے سفر کی صعوبتیں، موسم کی شدت اور بھوک اور پیاس کی تکالیف، باپ اور بھائی کے قتل ہونے اور اسیری میں لامتناہی مصائب وشدائد کو برداشت کرنے کی جو مثال انیسؔ نے پیش کی ہے اس کی نظیر تاریخ عالم وآدم پیش کرنے سے قاصر ہے۔

میر انیسؔ نے اطفال کربلا کی اسیری کے درمیان اضطراب و بے قراراور بے کسی کی کیفیت کو اس طرح نظم کیا ہے کہ جبر وتشدد کی منھ بولتی تصویریں نظروں کے سامنے آ گئی ہیں۔

وہ قافلہ دمشق کی جانب ہوا رواں　　نیزوں پہ تھے شہیدوں کے سرہائے خونچکاں
رسّی لیے تھے اونٹوں کی سجادؑ ناتواں　　ہے ہے حسینؑ کہتی تھیں سر کھولے بیبیاں
بچے بھی ماں کی گودیوں میں بے قرار تھے
عابدؑ پیادہ پا تھے، ستم گر سوار تھے

حضرت امام حسینؑ کی ایک کنیز شیریں تھیں۔ انھیں امامؑ عالی مقام نے آزاد کرتے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے یہاں مہمان بن کر ضرور آئیں گے اس وعدہ کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ کوفہ چلی گئیں لیکن وہ حضرت امام حسینؑ کی آمد کی ہمیشہ منتظر رہتیں۔ ایک دن اس نے سنا کہ کوفہ میں کوئی قافلہ آنے والا ہے۔ جب قافلہ قلعہ شیریں کے قریب پہنچا تو شیریں نے اہلِ قافلہ اور حضرت امامِ حسینؑ کے سر کو مطلقاً نہ پہچانا۔ اس موقع پر انیسؔ نے قافلہ میں شامل بیبیوں اور بچوں کی پیاس کی کیفیت کو کچھ یوں نظم کیا ہے۔

آگے بڑھا عزیز تو دیکھا یہ اُس نے حال　　کچھ بیبیاں ہیں خاک نشیں کھولے سر کے بال
روتے ہیں مارے بھوک کے اطفال خرد سال　　اک نوجوان ضعف کی شدّت سے ہے نڈھال
طاقت نہیں جو دھوپ سے آ بیٹھے چھاؤں میں
گردن میں بھاری طوق ہے زنجیر پاؤں میں

ظاہر ہے کہ بھوک سے زیادہ پیاس کی اذیت ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ میدان کربلا میں ننّھے ننّھے بچوں کی پیاس سے جو کیفیت تھی اسے انیسؔ نے بڑے ہی دلدوز انداز میں نظم کیا ہے بالخصوص اسیری کے درمیان بچوں کی پیاس سے جو حالت ہوگئی تھی انیسؔ نے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ انسان بلبلا اٹھتا ہے وہ کہتے ہیں:

اونٹوں پہ نبیؐ زادیاں تھیں گردنیں ڈالے　　اور پیاس سے بچے تھے زبانوں کو نکالے
عابدؑ تھے بندھے ہاتھوں سے زنجیر سنبھالے　　دل میں بھی پھپھولے تھے کفِ پا میں بھی چھالے
منزل پہ اُتر کر بھی نہ سوتے تھے سحر تک
بابا کے لیے شام سے روتے تھے سحر تک

شدّتِ عطش سے بچوں کے منھ سے زبان کا نکل آنا، شدّتِ عطش کی ایسی کیفیت کو بیان کرتا ہے کہ جسے سن کر ہر صاحب ضمیر کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ صداقت تو یہ ہے کہ اطفالِ کربلا کے مصائب وشدائد کو انیسؔ نے مراثی میں جس انداز میں نظم کیا ہے اسے پڑھ کر قاری پر جو غم والم

کی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ نا قابلِ بیان ہے۔ بطور ثبوت یہ بند ملاحظہ ہو۔

رانڈوں کی چھاتیوں سے لپٹے ہوئے تھے اطفال　　اشک آنکھوں میں بھرے پیاس کے مارے بے حال
ہونٹ گلبرگ سے سوکھے ہوئے رخ دھوپ سے لال　　راہ کی گرد سے آلودہ جھنڈولے وہ بال
دل دھڑکتے تھے پڑے خوف سے چہرے فق تھے
جور اعدا سے کئی بچوں کے چہرے فق تھے

تھیں کئی لڑکیاں چھوٹی کئی لڑکے چھوٹے　　آنسو آنکھوں میں بھرے ضبط کیے سہمے ہوئے
گورے گورے وہ گلے اور گریبان پھٹے　　نرگسی آنکھوں سے تھے ماؤں کی صورت تکتے
مانگ سکتا تھا نہ رو کر کوئی بچہ پانی
ڈر کے اعدا سے ہوا جاتا تھا زہرہ پانی

مرثیے کے بند کے ہر مصرعے میں اطفالِ کربلا پر ہونے والے جبر وتشدد اور ظلم کی ایسی داستان کو بیان کیا گیا ہے کہ جو انسانی قلوب کو بے قرار کر دیتا ہے۔ قید خانے میں اطفالِ کربلا کی حالتِ زار کو انیسؔ نے متعدّد مراثی میں بیان کیا ہے اس حوالے سے مرثیے کا یہ بند بھی ملاحظہ ہو:

ان باتوں سے رو دیتے تھے ناموسِ پیمبرؐ　　تھا فرش فقط خاک کا بالش تھا نہ بستر
بچوں کو نہ کھانا تھا نہ پانی تھا میسّر　　سایا بھی نہ تھا دھوپ میں سب جلتے تھے دن بھر
ہر شام مصیبت تھی غریب الوطنی میں
ہوجاتی تھی رانڈوں کو سحر سینہ زنی میں

مذکورہ بالا مرثیے کے بند کے ہر مصرعے سے بچوں کے رنج وتعب اور کلفتوں کا اظہار جس انداز سے ہوا ہے وہ ہر انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ ایّامِ اسیری میں اطفالِ کربلا پر روا رکھے گئے شدائد ومصائب کو مرثیوں میں کچھ ایسے انداز سے بیان کیا ہے کہ بچّوں کی کلفتوں کا احساس قاری کو بخوبی ہو۔ بطور ثبوت مرثیہ کا یہ بند بھی ملاحظہ ہو:

رسّی میں ہے جکڑے ہوئے الماس سے بازو　　اور نرگسی آنکھوں سے پرے بہتے ہیں آنسو
ان بی بیوں کے ساتھ ہیں بچے کئی مہرو　　کیا چاند سے چہروں پہ بھلے لگتے ہیں گیسو
ایک ایک کا منھ رو رو کے تکتے تھے وہ بچے
اور بھوک کے صدمے سے بلکتے تھے وہ بچے

انیسؔ نے اس بند میں ننھے ننھے بچوں کے بازوؤں کو رسیوں سے جکڑنے کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ اطفالِ کربلا نے بھوک اور پیاس کی جس طرح اذیّت کو برداشت کیا ہے کہ وہ نا قابلِ معافی جرم ہے۔

میر انیسؔ نے واقعۂ کربلا کے بیان میں بچوں کے مصائب وشدائد کو بیان کرنے میں جس ہنرمندی کا ثبوت بہم کیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ وہ بیشتر مراثی میں ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں کہ بچوں کی تکالیف اور مصائب وشداد کا منظر نگاہوں کے سامنے پھر سکے۔

یہ کہتے تھے اور روتے تھے ناموس پیمبرؐ　　تھا فرش فقط خاک کا بالیں تھا نہ بستر
بچّوں کو نہ کھانا تھا نہ پانی تھا میسّر　　سایہ بھی نہ تھا دھوپ میں سب جلتے تھے دن بھر
ہر شام مصیبت تھی غریب الوطنی میں
ہوجاتی تھی رانڈوں کو سحر سینہ زنی میں

انیسؔ نے اطفال کربلا کے پر ہونے والے جبر وظلم کی داستان کو بیان کرتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ لامتناہی مصائب وشدائد میں بھی بچوں کے ہاتھ سے صبر کا دامن نہیں چھوٹا تھا۔ واقعہ کربلا کے بعد بچوں پر ہونے والے مظالم کو دیکھ کر جب مائیں بے قرار ہوتی تھیں تو وہ بچے ماں کی تکالیف کا احساس کر کے صبر کی تلقین کرتے تھے۔ انیسؔ نے بچوں کی ماں سے فطری محبت کو دکھاتے ہوئے اطفالِ کربلا کے مظالم کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

چاند سے چہرے سے اک اک کے یتیمی تھی عیاں　　کئی فاقے جو کیے تھے تو نہ تھی تاب و تواں
بیبیاں ان کی غریبی پہ جو کرتی تھیں فغاں　　جوڑ کر ہاتھ وہ کہتے تھے نہ روؤ اماں
کھینچ کر تیغ نہ پھر تم کو ڈرا دے کوئی
نوک نیزے کی نہ شانے پہ چبھائے کوئی

ظاہر ہے کہ قافلۂ اہلِ بیتؑ کو ایسے گھر میں مقیّد کیا گیا تھا کہ جہاں نہ سورج کی روشنی تھی اور نہ ہی ہوا۔ ایسے قید خانہ میں تو بڑوں کا رہنا بھی دشوار ہوتا ہے تو بچوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ ذہن انسان ان مصائب کو سن کر مفلوج ہوجاتا ہے چنانچہ انیسؔ نے قید خانے میں بچوں کی حالتِ زار کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ انسان کے ہوش وحواس گم ہوجاتے ہیں بطور ثبوت یہ بند ملاحظہ کیجیے۔

اس شب کا اندھیرا تھا شبِ گور سے بدتر　　بچوں کا یہ عالم تھا کہ تھے مضطر و ششدر
سہمی ہوئی کہتی تھی یہ شبیرؑ کی دختر　　دم گھٹتا ہے اماں مجھے تم لے چلو باہر
کھلوا دو ذرا حجرے کو اب ہونٹوں پہ جاں ہے
اس گھر میں ہوا بھی نہیں یہ کیسا مکاں ہے

انیسؔ نے مرثیے کے اس بند میں بچوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کو بے نقاب کرتے ہوئے بچوں کی فطری جبلت اور اطفالِ کربلا کو مثالی پیکر بنا کر پیش کیا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ انیسؔ نے بھوک اور پیاس سے پیدا ہونے والی کیفیات کو مراثی میں جا بجا نت نئے انداز سے نظم کیا ہے۔ تاکہ قاری کو بھوک اور پیاس کی اذیّت کا احساس ہوسکے۔ وہ فاقوں کے نتیجے میں ہونے والی حالت کو تین سال کی کمسن بچی جناب سکینہؑ کے حوالے سے اس طرح بیان کرتے ہیں:

مرجاتا ہے جو پھر اسے زنداں سے ہے کیا کام　　یاں بعدِ فنا بھی نہیں مطلق مجھے آرام
زنداں میں حرم روتے ہیں میرے سحر و شام　　بچے مرے چلّاتے ہیں لے لے کے مرا نام
فاقوں سے سکینہؑ کا مری رنگ جو فق ہے
اے ہند مری روح کو واللہ قلق ہے

یہ صداقت ہے کہ اطفالِ کربلا کو اثناءِ اسیری بھوک اور پیاس کی جس اذیت سے دوچار ہونا پڑا اس کیفیت کو انیسؔ سے بہتر کوئی اور شاعر نظم نہ کر سکا بالخصوص حضرت سکینہؑ کی بھوک اور پیاس کی شدّت کو جس انداز سے انہوں نے بیان کیا ہے وہ ہر صاحبِ دل کو بے قرار کر دیتا ہے۔ انیسؔ باپ کی زبان سے بیٹی کی پیاس کی تکلیف کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

یہ سن تین برس کا اور تشنہ دہانی　　ہو جاتی ہے غش مانگتے ہی مانگتے پانی
ہر بار گھڑکتے ہیں اسے ظلم کے بانی　　کیا ضد ہے کہ بچوں کے بھی ہیں دشمن جانی
کی جاتی نہیں بات بھی اس تشنہ دہن سے
ننھا سا گلا شمر نے باندھا ہے رسن سے

باپ کی زبان سے بیٹی کی شدّت عطش کی یہ کیفیت انسانوں کے قلوب کو برما دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بچوں پر تشدد دنیا کے ہر گوشے میں ایسا سنگین جرم ہے۔ کہ جس کی تلافی ناممکن ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ ظلم بھی اطفال کربلا کے ساتھ روا رکھا گیا حتیٰ کہ باپ اور بھائیوں کی شہادت کے بعد قیدی بنا کر ان پر نت نئے ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ انیسؔ نے امام حسینؑ کی زبان سے تین سال کی کمسن بچی پر جو ظلم کے پہاڑ ڈھائے گئے اسے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

کیا کہوں ننھے سے بچوں پہ جو ہے ظلم و ستم　　نام لے کر مرا روتی ہے سکینہؑ ہر دم
مارتے ہیں اُسے جھنجلا کے طمانچے اظلم　　کان بھی زخمی ہیں گالوں پہ بھی ہے اس کے ورم
آج جو اس مری پیاری پہ ستم ہوتے ہیں
یہ مری روح پہ واللہ الم ہوتے ہیں

انیسؔ نے مسدس کے آخری مصرع میں کمسن بچی پر ہونے والے ظلم کو بیان کرنے کے بعد باپ کی قلبی کیفیات کو جس پیرائے میں بیان کیا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں شاذ ہی ملے گی۔

دربار میں جب ایک دشمن دیں تلوار لے کر جناب زینبؑ کو قتل کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے تو یہی ننھے ننھے بچے بالخصوص جناب سکینہؑ یزیدیوں کو اس فعل سے باز آنے کا موجب بنتی ہیں۔ انیسؔ نے اس واقعہ کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ بچی کی پھوپھی سے بے پایاں محبت کا ایسا اظہار ہے کہ جو رہتی دنیا تک کے لیے نمونۂ عمل ہے۔

بلبلانے لگے یہ دیکھ کے ننھے بچے　　پیٹ کر سر کو سکینہؑ نے کہا ہاتھوں سے
میری بے کس پھوپھی اماں میں تمھارے صدقے　　آپ کے بدلے ستم گر مری گردن کاٹے
اب کہاں ہیں شہؑ والا جو بچاویں تم کو
ہائے جیتے نہیں بابا جو بچائیں تم کو

اطفال کربلا میں جناب سکینہؑ کی ذات گرامی ایسی ہے کہ جن پر یزیدیوں کے ہاتھوں بے پناہ ظلم کے پہاڑ توڑے گئے انیسؔ نے ان مظالم و شدائد کو جس طرح بیان کیا ہے وہ ہر صاحب دل کو تڑپا دیتا ہے۔ دیکھیے انیسؔ نے تین سال کی کمسن بچی پر ہونے والے مظالم کو کس

دلدوز انداز میں نظم کیا ہے:

ہے اسی رسی میں ننھا سا سکینہؑ کا گلا　　دم گھٹا جاتا ہے آنکھوں سے رواں ہیں آنسو
چاک کُرتے کا گریباں ہے پریشاں گیسو　　سوجے تو گال ہیں کانوں سے ٹپکتا ہے لہو
آہ ہر گام پہ سینے سے نکل جاتی ہے
جب گھڑکتے ہیں ستم گر تو دہل جاتی ہے

ماں سے کرتی ہے اشارہ وہ گرفتار ستم　　رسی کھلوا دو نہیں گھُٹ کے نکل جائے گا دم
روکے وہ کہتی ہے مجبور ہوں میں کشتۂ غم　　ہائے بچی تری قسمت میں تھا یہ درد و الم
صدقے اماں یہ گرہ عقدہ کشا کھولے گا
بی بی اس عقدۂ مشکل کو خدا کھولے گا

میر انیسؔ کے مرثیے کے ہر مصرعے میں بالخصوص بند کے آخری مصرعے میں کمسن بچی پر ہونے والے مظالم وشدائد کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے وہ ہر صاحبِ ضمیر کے دل کو مضطرب کر دیتا ہے۔ باپ اور بیٹی کی محبت مثالی ہوتی ہے بالخصوص باپ کو بیٹی سے جو بے انتہا محبت ہوتی ہے اس پر بیٹی کو ناز بھی ہوتا ہے اور فخر بھی۔ جس کے نتیجے میں بیٹی اپنے باپ سے دل کھول کر ہر وہ بات کر لیتی ہے جو کسی اور سے نہیں کر سکتی۔ انیسؔ چونکہ ماہرِ فطرت تھے لہٰذا انہوں نے اپنے ماہرِ فطرت ہونے کا ثبوت مراثی میں جا بجا بہم کیا ہے۔ انیسؔ کی فطرت شناسی کا یہ ثبوت ملاحظہ کیجیے:

کہیں دربار میں اماں وہ اگر مجھ کو ملے　　دیکھنا کرتی ہوں کیسے شہؑ والا سے گلے
وہ خبر لیویں نہ، گردن مری رسی سے چھلے　　اُس کو یوں بھولتے ہیں باپ سے بچہ جو ملے
وجہ کیا کون سی تقصیر پہ منھ موڑا ہے
سیلیاں کھانے کو اعدا میں مجھے چھوڑا ہے

مراثیِ انیسؔ میں جناب سکینہؑ کے مصائب وشدائد کے بیان میں انیسؔ نے جس ماہرِ فطرت ہونے کا ثبوت بہم کیا ہے اس کی مثال ہمیں اردو شاعری میں شاذ ہی نظر آتی ہے۔ بطور ثبوت مرثیے کا یہ بند بھی ملاحظہ ہو۔

سر پیٹ کے ماں کہتی تھی ہے ہے میں کروں کیا　　مظلومی پہ اس بچی کے پھٹتا ہے کلیجا
اس قید میں گذرا ہے ابھی فاقہ پہ فاقا　　اے لوگو! سکینہؑ کا مری دم ہے نکلتا
بند آنکھیں ہیں منھ کھولو مری ماہ جبیں ہے
کیا منھ میں چواؤں کہیں پانی بھی نہیں ہے

جناب سکینہؑ کی مظلومی و بے کسی انیسؔ کے مرثیہ کے ہر مصرع سے ہویدا ہے۔ صداقت تو یہ ہے کہ انیسؔ نے بیشتر مراثی میں جناب سکینہؑ کے مظالم وشدائد کا بیان بڑے ہی دلدوز انداز میں کیا ہے بالخصوص

جس طشت طلا میں رکھا تھا سرِ سرورؑ

ایسا مرثیہ ہے کہ جس میں جناب سکینہؑ پر ہونے والے مظالم کو پڑھ کر انسان خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ یہ پورا مرثیہ بچوں پر ہونے والے مظالم و شدائد کے خلاف کھلا احتجاج ہے۔ اس کے علاوہ

جب قیدیوں کو خانہ زنداں میں شب ہوئی　　بچوں کے مارے خوف کے حالت عجیب ہوئی

بھی ایسا مرثیہ ہے کہ جس میں انیسؔ نے بچوں پر ہونے والے مصائب و شدائد کو بہترین پیرائے میں بیان کیا ہے بالخصوص جنابِ سکینہؑ کے مصائب کی کیفیات کو جس طرح بیان ہے اسے پڑھ کر انسان سے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے۔ اس مرثیے میں زندان کے اندھیرے میں بچوں کے بچھڑنے کی کیفیت کو نظم کرتے ہوئے بچوں کی حالت خصوصا امام محمد باقرؑ اور جنابِ سکینہؑ کہ زبان سے کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

بانوؑ کے اس بیاں پہ بلکتے تھے سب حرم　　باقرؑ پکارتے تھے کہ کیونکر جئیں گے ہم
چلّاتی تھی سکینہؑ کہ گھٹتا ہے میرا دم　　زنداں کا در بھی ہوگیا معمولی ہے ستم
کھولے گا قفل کون جو عباسؑ آئیں گے
لو اب پدر کدھر سے مرے پاس آئیں گے

اطفالِ کربلا کے مصائب و شدائد کی کلامِ انیسؔ میں ایسی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔ بالخصوص بچوں کی بھوک اور پیاس کی شدّت اور قیدخانہ کی اذیت کو جس فنکارانہ انداز میں انیسؔ نے بیان کیا ہے وہ انیسؔ کے ماہر فطرت اور ''ایک رنگ کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں'' کی بہترین مثالیں ہیں۔

مراثیِ انیسؔ کے مندرجہ بالا بندوں کے مطالعے کے پیشِ نظر بلا جھجک یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مراثی میں جس انداز سے بچوں کی تکالیف کو بیان کیا ہے پوری اردو شاعری میں ہنوز اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس طرح انیسؔ اچھے مرثیہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ حقوقِ اطفال کے ایسے علم بردار ہیں کہ جس کی مثال دنیائے شاعری میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

www.emarsiya.com
دنیا کی سب سے بڑی ڈیجیٹل مرثیہ لائبریری جہاں آپ انیسؔ و دبیرؔ کے مکمل مطبوعہ مراثی کے علاوہ ۳۲۰ مرثیہ نگاروں کے ۴۰۰۰ سے زائد مراثی حاصل کر سکتے ہیں۔ سوزخواں خواتین و حضرات کے لیے بستۂ سوزخوانی کا بھی انتظام ہے۔ اگر آپ مزید مراثی اس ویب سائٹ پر شامل کرنا چاہیں تو اس ای میل پر رابطہ کریں۔
faroghemarsiya@gmail.com

کلامِ انیسؔ میں ہندوستانی تہذیب وثقافت

ڈاکٹر کشور جہاں زیدی

قبل اس کے کہ میر انیسؔ کے کلام میں تہذیبی وثقافتی عناصر تلاش کئے جائیں، مفکرین کی نظر میں تہذیب وثقافت کیا ہے اس پر مختصر روشنی ڈالنا مناسب ہے۔تہذیب کی تعریف مختلف زمانوں میں لوگوں نے اپنے نظریہ کے مطابق کی ہے۔کسی کے نزدیک تہذیب انسانی روّیوں کے اُس مجموعے کا نام ہے جس میں انسانی جماعت کی بہتری کے عناصر ہوتے ہیں۔کسی نے اسے نیکی، خیر اور پاکیزگی کی قدروں کا نام دیا ہے۔بعض مفکرین کے نزدیک تہذیب عظیم انسانوں کی شخصی اور تخلیقی توانائی کا ظاہری روپ ہے۔کسی نے تہذیب کو اخلاقی احساس کا نام دیا ہے۔

پروفیسر ہمایوں کبیر کے مطابق ''تہذیب زندگی کی اس تنظیم کا نام ہے جو ایک متمدن سماج کو ممکن بناتی ہے۔''

(بحوالہ: اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر سید مجاور حسین)

ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں۔''تہذیب نام ہے اقدار کے ہم ہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے۔''(بحوالہ: قومی تہذیب کا مسئلہ)

تہذیب وثقافت یا کلچر ارتقائے حیات انسانی کی تاریخ میں ایک ایسا منظم اور خود کار عمل ہے جسے کوئی قوم اپنے پیش روؤں سے سماجی ورثہ کے طور پر حاصل کرتی ہے اور پھر اپنی سماجی، تہذیبی وثقافتی ضرورتوں کے پیشِ نظر اپنے ذہنی اکتسابات اور خلاقانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس میں قطع وبرید اور اضافے کرتی ہے۔ماہرین سماجیات نے تہذیب وثقافت کو سماجی ورثہ قرار دیا ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہے۔ہندوستان میں اردو زبان مشترکہ تہذیبی ضرورتوں اور تقاضوں کی بنیاد پر ارتقاء پزیر ہوئی، اس لیے اردو اَدب کا تمام تر سرمایہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور روایتوں سے مملو ہے۔صوفی سنتوں کے اقوال وگیتوں اور اِشلوکوں کے رنگ اس بات کے گواہ ہیں کہ قوموں نے ایک دوسرے کا رنگ کس طرح اختیار کیا۔بطورِ خاص اودھ میں اسے ایک ایسا معاشرتی قالب نصیب ہوا جس نے نہ صرف اردو زبان و شاعری کو متاثر کیا بلکہ مذہبی عقائد کو جلا بخشنے میں بھی اہم کردار اَدا کیا۔

یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ صنفِ مرثیہ کو لکھنؤ میں فروغ حاصل ہوا کیونکہ اس کی توسیع وترقی کے لیے وہاں کی معاشرتی فضا سازگار تھی۔میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ آسمانِ مرثیہ گوئی کے وہ شمس وقمر ہیں جنھوں نے فنِ مرثیہ کو بامِ عروج پر پہنچایا۔جس وقت لکھنؤ میں مرثیہ عروج کی منزل میں تھا اردو شاعری میں خارجیت پسندی پروز وردیا جارہا تھا یعنی محبوب کی زلف، لب ورخسار، خدوخال موضوع شاعری تھے۔دوسری جانب برصغیر میں سیاسی وسماجی بحران چھایا ہوا تھا۔تہذیبی قدریں مائل بہ زوال تھیں۔انیسویں صدی کے اس سیاسی وسماجی زوال نے مرثیہ کے ذریعہ اردو زبان وشاعری کو ایک نئی جہت عطا کی۔جس نے میر انیسؔ جیسے دور اندیش لوگوں کی تربیت فکر کی اور ایک نئے تمدن کی بنیاد پڑی۔یہ تمدن

عرب وعجم کے تہذیبی امتزاج کا آئینہ دار تھا۔اس تمدن کے ذریعہ مذہب وشاعری میں تعلق پیدا ہوا جس نے زندگی میں انفرادیت پیدا کی۔ مرثیہ جیسی صنف نے کردار کی تعمیر اور روحانیت پر زور دیا۔میر انیسؔ کی شخصیت اور ان کا شاعرانہ امتزاج اور ہندوستانی شعور اسی تہذیبی ردِّعمل کا نتیجہ ہے۔

مرثیہ کی بنیاد ایک عظیم تاریخی سانحۂ کربلا پر محیط ہے۔حق وباطل کا یہ معرکہ صرف کربلا تک محدود نہیں ہے بلکہ کائنات پر چھایا ہوا ہے۔اس پر دین کے قیام کا دارومدار ہے۔اس کے اغراض ومقاصد کی ہمہ گیری نے اسے وہ وسعت بخشی کہ اس کے دامن میں زندگی کے تمام تر پہلو اور فطرتِ انسانی کے سارے رنگ اپنے کیف وکم کے ساتھ سمٹ آئے ہیں۔

مرثیہ مجمعِ عام میں پڑھا جاتا ہے۔محفل میں ہر عمر ومختلف مزاج اور متعدد مکتبۂ فکر کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔میر انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے فکر وفن کے ذریعہ سامعین سے جذباتی وابستگی قائم رکھنے کے لیے اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں کہ واقعہ کی اصلیت بھی مجروح نہ ہونے پائے اور مقصدیت کی تکمیل بھی ہو سکے۔اس کے لئے ذہنی طور پر مجمع کو آمادہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مہلت جو اجل دے تو غنیمت اسے جانو　　ایذا بھی ہو مجلس میں تو راحت اسے جانو
آنسو نکل آئیں تو عبادت اسے جانو　　آمادہ ہو رونے پہ سعادت اسے جانو
فاقے کیے ہیں دھوپ میں لب تشنہ رہے ہیں
آقا نے تمھارے لیے کیا ظلم سہے ہیں

تکلیف کچھ ایسی نہیں سایہ ہے ہوا ہے　　پانی ہے خنک مروحہ کش بادِ صبا ہے
کچھ گرمیٔ عاشور کا بھی حال سنا ہے　　سر پٹنے کا وقت ہے فریاد کی جا ہے
گزری ہے بیاباں میں وہ گرمی شہِؑ دیں پر
بھن جاتا تھا دانہ بھی جو گرتا تھا زمیں پر

ناقدین ادب کا مرثیہ پر یہ اعتراض ہے کہ المیۂ کربلا کے عربی کردار ہندی معلوم ہوتے ہیں۔فرات کے کنارے ہونے والی جنگ ہندوستان کے میدان میں ہوتی نظر آتی ہے۔حسینیؑ فوج کا لباس، گفتگو، خواتین کی جذباتی باتیں، بچوں کی خانگی زندگی، مجلسی تہذیب، عشرت کی محفلیں، غم کی مجلسیں، جناب قاسمؑ وکبریٰؑ بنت الحسینؑ کی شادی وغیرہ مرثیہ نگار نے جس طرح پیش کیا ہے وہ سب اسلامیانِ ہند کی اس تہذیب کا خاصہ ہے جسے مشترکہ تہذیب کہتے ہیں۔

میر انیسؔ نے تمام مرثیے مجالس میں پڑھنے کے لیے لکھے ہیں۔ہر مقرّر اس بات سے آگاہ ہے کہ سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے مجمعے کی پسند اور اس کی توقع کے مطابق بیان میں سحر انگیزی پیدا کی جائے۔مجمع کے سامعین ہر چند ایک مذہبی جذباتی تعلق کے سبب مجلس میں آتے ہیں تاہم وہاں تمام تر انسانی سماج کے تہذیبی، اخلاقی اور حقیقی زندگی کے نشیب وفراز سے بھی آگاہی حاصل کرتے ہیں۔میر انیسؔ انھیں ایسا ماحول فراہم کرتے ہیں کہ سامعین مآلِ مجلس بھی حاصل کر سکیں اور مقصدِ زندگی بھی۔

''عربی آداب، عربی رہن سہن سے مسلمانوں کے دلوں میں زیادہ عقیدت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔لیکن محض عقیدت اتنی محبت و احترام پیدا نہیں کرسکتی جب تک وہ ہستیاں ایسے جیتے جاگتے کردار بنا کر پیش کئے جائیں کہ زمان ومکان کا بُعد گویا مٹ جائے۔میر انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ سنتے یا پڑھتے وقت ذرا دیر کو تیرہ سو سال کا فاصلہ جیسے غائب ہوجاتا ہے۔''

دنیا میں کوئی بھی چیز ہم عقیدت کے نام پر سُن تو سکتے ہیں لیکن انسانی مزاج سے ہم آہنگ تب ہی ہوگا جب زبان و بیان اور ماحول آپ کے اردگرد کا ہوگا۔میر انیسؔ کے مَراثی کی یہی خوبی ہے کہ سامع یا قاری خود کو اسی ماحول کا حصہ محسوس کرتا ہے۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مناظرِ قدرت:

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک　　شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریٔ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک　　ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے　　پتّے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

صبح کا منظر:

وہ نورِ صبح اور وہ صحرا وہ سبزہ زار　　تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار　　کُو کُو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغ بہشت نعیم کے　　ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

گرمی کی شدت:

دشت میں چلتی ہے لُو ، دھوپ کی شدت ہے کمال　　جیٹھ بیساکھ کے ایّام ہیں اور وقتِ زوال
سرخ ہے خوں قبا دھوپ سے رخسار ہیں لال　　نکلی آتی ہے زباں منھ سے یہ ہے پیاس کا حال
تن جلا جاتا ہے جب گرم ہوا آتی ہے　　ریت اُڑ اُڑ کے ہر اِک زخم میں بھر جاتی ہے

بھرتا تھا دم سرد پریشاں کوئی ہوکے　　دامن سے ہوا دیتا تھا منھ کو کوئی دھو کے
بچتا تھا کوئی لُو سے ، رِدا چہرے پہ روکے　　رکھ لیتا تھا سر پر کوئی رومال بھگو کے
پڑتی تھیں جو چھینٹیں تو مزا دیتا تھا پانی　　جھک کر کوئی چلّو ہی سے پی لیتا تھا پانی

مرثیے کا مقصد صرف رونا رلانا نہیں بلکہ اعلیٰ کرداروں کے اسوۂ حسنہ کو پیش کر کے ان سے محبت دلانا اور اسفل کرداروں سے بیزاری پیدا کرنا ہے۔میر انیسؔ نے اپنے مراثی میں کہیں فلسفۂ زندگی پیش کیا ہے کہیں فلسفۂ اخلاق، کہیں مرقع نویسی ہے تو کہیں کمال کی منظر کشی اور جذبات انسانی کی تصویر کشی کے ساتھ انسان کو جرأت وعزم، صبر ورضا، شجاعت وفداکاری، خدا پرستی اور حق آگہی جیسے اخلاقِ عالیہ عظمت و کردار کے وہ نمونے پیش کیے ہیں جن کے سامنے بیساختہ سر عقیدت سے جھکانے کو دل چاہتا ہے۔انہوں نے محض مردوں کے اخلاقی صفات

ابھارنے پر توجہ نہیں دی بلکہ خواتین کے لیے بھی خانوادۂ رسالتؐ کی محترم و محتشم کردار پیش کر کے نہ صرف تطہیرِ زندگی کی ہے بلکہ زندگی کی عکاسی بھی کی ہے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد کے سماجی عقائد، رہن سہن، طرزِ معاشرت اور تمدّن کو بھی پیش کیا ہے۔ میر انیسؔ صرف واقعۂ کربلا نظم کرنا ہی فرض نہیں سمجھ رہے تھے بلکہ ہندوستان میں حسینیؑ نظریۂ حیات اور مقصدِ حسینیؑ کی تبلیغ بھی کر رہے تھے۔ ایک ماں کی تڑپ اور بے قراری کا انداز دیکھئے۔

ماں ہوں میں کلیجہ نہیں سینے میں سنبھلتا　　صاحب مرے دل کو ہے کوئی ہاتھوں سے ملتا
میں تو اِسے لے چلتی پہ کچھ بس نہیں چلتا　　رہ جاتیں جو بہنیں بھی تو دَم اس کا بہلتا
دروازہ پہ تیار سواری تو کھڑی ہے　　پر اب تو مجھے جان کی صغرا کی پڑی ہے

ایک اور مقام پر ایک ماں حضرتِ زینبؑ کے جذبات کی آفاقیت ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

کم سن بچے روزِ عاشور لشکرِ حسینی کا علَم لینے کا حوصلہ کرتے ہیں۔ اس موقع پر ماں کی سرزنش کا انداز کا کتنا مہذب اور فطری ہے۔

سر کو، ہٹو، بڑھو، نہ کھڑے ہو علَم کے پاس　　ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہِؑ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہوئے تم میرے حواس　　بس! قابلِ قبول نہیں ہے یہ التماس
رونے لگو گے تم جو برا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

عمریں قبیل اور ہوسِ منصبِ جلیل　　اچھا، نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ ہے ہمت کی یہ دلیل　　ہاں اپنے ہم سِنوں میں تمھارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے، غور کرے، پیش و پس کرے　　جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے

مرثیے کے واقعات کا بنیادی تعلق عرب کی تاریخ سے ہے لیکن اس کی پیش کش کا انداز ہندوستانی معاشرت بالخصوص لکھنوی طرزِ بیان اور بیگمات کے تخاطب کی ترجمانی کرتا ہے۔ تاریخی حوالوں سے میر انیسؔ نے عرب کی تہذیبی روایات کو اختصاص بخشا ہے لیکن قاری کے مذاق کا خیال رکھتے ہوئے ہندوستانی مناظر، ماحول و جذبات کی عکاسی بھی کی ہے۔ زبان و بیان، محاورات، روزمرہ خالص ہندوستانی ہے۔ رام بابو سکسینہ تاریخِ ادب اردو میں تحریر فرماتے ہیں۔

''مشہور ہے کہ فیض آباد میں ان کے یہاں باقاعدہ ایک دفتر تھا جس میں ایسے محاورات مثلیں جو بہو بیگم صاحب کے گھر میں بولی جاتی تھیں، باقاعدہ درج ہوتی تھیں۔''

ذیل کا بند ملاحظہ کریں جس میں ہم شبیہ پیغمبرؐ حضرت علی اکبرؑ کی ماں کے دلی جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔

ہیں مسیں بھیگتی اٹھارہ برس کا ہے سِن　　منتیں مانی ہیں مادر نے مرادوں کے ہیں دن
رنج میں کاٹی ہیں دکھ درد کی راتیں گن گن　　پالنے والے کو چین آئے گا کیوں کر اس بن

ماں کو حسرت ہے دلھن بیاہ کے گھر لانے کی　　فکر یاں عین جوانی میں ہے مر جانے کی

چلّائی رو کے زینبؑ ناشاد نامراد　　ہَے ہَے خبر تو لو کہ یہ کس سے ہوا فساد
غربت زدوں سے کیا سببِ کینہ و عناد　　دیکھے کوئی کدھر ہیں شہنشاہؑ خوش نہاد
ہمشیر کو نثارِ امامؑ اُمم کرو
لوگوں دعائیں اکبرؑ مہرو پہ دم کرو

بانوؑ نے کہا دست پسر ماتھے پر رکھ کر　　لو آخری تسلیم بجا لاتے ہیں اصغرؑ

مدینے سے روانگی کے وقت حضرت فاطمہ صغریٰؑ کا کردار مرثیے میں بڑے درد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جو باتیں ان کی زبان سے بیان سے ادا کی گئی ہیں ان کا گہرا تعلق ہندوستانی سماجی رویوں سے ہے۔ ایک بہن کے جذبات، بھائی کی شادی کی تمنا، دہلیز روکنا، نیگ مانگنا، آنچل ڈالنا، یہ سب ہندوستانی شادیوں میں ہونے والی رسمیں ہیں۔

بقول اطہر فاروقی صاحب،

''فاطمہ صغریٰؑ کے کردار میں وہی روح پائی جاتی ہے جو ایک ہندوستانی لڑکی کے کردار میں ملتی ہے۔''

عرصہ ہو تو خط لکھ کے بُلا لیجیو بھائی　　اب بیاہ میں مجھ کو نہ بھُلا دیجیو بھائی
وہ دن ہو کہ بوٹا سی تمھاری دلھن آئے　　تم جیسے ہو ویسے ہی پیاری دلھن آئے

پروفیسر عقیل رضوی صاحب کے لفظوں میں۔

''ہندوستان کی ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کی تجسیم جس طرح مرثیہ میں ہوئی ہے اردو کی کسی دوسری صنف سخن میں اتنے رخ سے ایسے رنگ بدل کر نہیں آئی۔ حضرت مسلمؑ کی شہادت پر بین کا یہ انداز خالص ہندوستانی ہوتے ہوئے ہر غم زدہ دل کی آواز ہے۔''

تم رانڈ ہوئیں ناک سے اب نتھ کو بڑھاؤ　　اب روؤں گلے مل کے مَیں تم سے اِدھر آؤ
اب ماتمی صف پیٹنے رونے کی بچھاؤ　　بالوں کو پریشان کرو خاک اُڑاؤ

نامیؔ انصاری لکھتے ہیں؛

''امام حسینؑ کی حیاتِ مبارکہ تک عرب کی سرزمین پر شاہانہ آداب و رسومات کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ خلیفۂ وقت اور سماجی زندگی میں فرق نہیں تھا۔ یہ کردار بھی شاہی گھرانے کے ہیں۔ انہیں ہندوستانی تہذیب کے تناظر میں دیکھیں تو ایک آرٹ میں دو تہذیبوں کے مرثیہ کا اہم جُز رونا رلانا ہے۔ گریہ تب ہی ہوتا ہے جب جذبات میں شدت آئے۔ جذبات کی شدت اور والہانہ پن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان خود کو اس منظر میں ڈوبا ہوا محسوس کرتا ہے۔ میر انیسؔ کے فن کی معراج یہ ہے کہ وہ گریہ کے لیے بھی فطری ماحول فراہم کرتے ہیں۔ حضرت

عباسؑ کی شہادت کا منظر ملاحظہ کیجیے۔

کچھ بولو تو اے عاشقِ سلطانِ مدینہ　　چلاتی ہے ڈیوڑھی پہ تمھیں بالی سکینہؑ
بتلاؤ بھتیجی کی تسلی کا قرینہ　　اس صدمے سے دشوار ہے اس بچی کا سینہ
یہ مشک جو واں خون میں تر جائے گی بھائی　　بس ہائے چچا کہہ کے وہ مر جائے گی بھائی

یاں تھا ابھی یہ ذکر کہ برپا ہوا محشر　　روتے میں لگے دیکھنے شہؑ خیمے کو مڑ کر
دیکھا کہ حرم گھر سے نکل آئے ہیں باہر　　چلاتی ہے فضہؑ علی اکبرؑ علی اکبرؑ
اب دخترِ سلطانِ مدینہ نہیں تھمتی　　عباسؑ سے کہہ دو کہ سکینہؑ نہیں تھمتی

حضرت علی اکبرؑ میدانِ کارزار کے لیے رخصت طلب کر رہے ہیں۔اس وقت امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

بے کس پھوپی کو گھر میں تمھارا ہے انتظار　　دھڑکے سے ماں کے دل کو نہیں ایک دَم قرار
چھوٹی بہن پکارتی ہے تم کو بار بار　　دیکھ آؤ اپنے چاہنے والوں کو میں نثار
ہم کوئی دم میں آبِ دمِ تیغ پیتے ہیں　　یہ چند دم تمھارے بھروسے پہ جیتے ہیں

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

کہتی تھی پیٹ کے سَر زینبؑ مضطر ہَے ہَے　　نوجواں مرنے چلا بھائی کا دلبر ہَے ہَے
بانوؑ لوٹی گئی برباد ہوا گھر ہَے ہَے　　ہم سے پردیس میں چھوٹے علی اکبرؑ ہَے ہَے

پروفیسر آزردہ صاحب لکھتے ہیں-

''اردو مرثیہ میں پیش کیے جانے والے کسی بھی ہیرو کو سامنے رکھئے۔اگر اس مرثیہ کی مدد سے اُس شخصیت کی زندگی کا خاکہ آپ کھینچنا چاہیں تو اس میں آپ کو اس کے نام و مقام کے علاوہ ہر وصف اودھ کی کسی شخصیت کا نظر آئیگا۔''

اس ضمن میں احمد کفیل صاحب کا کہنا درست ہے کہ -

''ہندوستان میں عزاداری اور تہذیبی و معاشرتی رکھ رکھاؤ ایک ایسی تثلیث ہے جس میں سے کسی ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ممکن نہیں۔''

ہندوستان میں اردو مرثیہ کی تہذیبی فضائیں قارئین و سامعین کو اپنائیت کا احساس دلاتی ہیں کیونکہ اس کی تہذیبی جذئیات کی جڑیں یہاں کے ہر فرقہ اور قوم میں پیوست ہیں۔

❁❁❁❁

پروفیسر فضل امام: بحیثیت انیسؔ شناس

پروفیسر عباس رضا نیّرؔ

میر انیسؔ نے اردو شاعری کو جس سوز و گداز اور جن اعلیٰ انسانی قدروں سے ہم کنار کیا اس کی مثال کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ انیسؔ اردو کے بڑے شاعر تو ہیں ہی دنیا کی دوسری زبانوں کے بڑے شاعروں میں بھی بہت کم ایسے شعرا نظر آتے ہیں جنھیں انیسؔ کے مدمقابل رکھا جا سکے۔ انیسؔ کا زمانہ (۱۸۰۳ء تا ۱۸۷۴ء) اخلاقی زوال اور تہذیبی انحطاط کا زمانہ تھا جس میں حق گوئی، بے باکی، روشن خیالی، فکری آزادی، صلۂ رحمی، حقوق انسانی کی بازیابی اور جانثاری و فداکاری جیسے عناصر ہندوستانی معاشرے میں ہی نہیں عالمی انسانی سماج میں عنقا تھے۔ انگریزوں کی غلامی کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہندوستان اپنی ان اخلاقی روایات کو بھی کھو چکا تھا جو اس ملک کی بنیادی شناخت تھیں۔ ایسے میں انیسؔ نے عراق کی سرزمین پر ۶۱ ہجری میں رونما ہونے والے تاریخ انسانی کے اس عظیم واقعے کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا جس میں تمام تر ارفع و اعلیٰ انسانی قدروں کی روشن مثالیں موجود تھیں۔ انیسؔ اپنے مرثیوں کے ذریعہ ان تمام قدروں کو پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوئے اور اردو زبان و ادب کو عالمی ادب میں جگہ دلانے کے لئے خاطر خواہ تخلیقی ذخیرہ چھوڑا۔

انیس صدی تقریبات کے بعد انیسؔ و دبیرؔ پر اردو میں تحقیق و تنقید کے بہت کام ہوئے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرثیے کے ان دونوں اہم ترین شعرا پر تحقیق و تنقید کے بیشتر کام افراط و تفریط کا ہی شکار رہے۔ ہمارے بیشتر محققین و ناقدین شبلی نعمانی کی قائم کردہ موازنے کی روایت سے باہر نہیں نکل سکے۔ انیس شناسوں کا دوسرا طبقہ جس نے کلام انیس میں منظر نگاری، جذبات نگاری، جرئیات نگاری، حفظ مراتب، ڈرامائی عناصر، رزمیہ عناصر اور زبان و بیان کی خوبیوں پر خاصا زور قلم صرف کیا وہ بھی مسعود حسن رضوی کے رثائی معیار نقد کو بہت آگے نہیں لے جا سکے۔ ہمارے ناقدین کا ایک اور گروہ مشرقی قدروں سے بے نیاز ہو کر صرف مغربی تنقید کی میزان پر مرثیوں کو رکھ کر اپنی رائے قائم کرتا رہا۔ ایسے میں پروفیسر فضل امام لائق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے پہلی مرتبہ موازنے اور مناظرے کے بغیر صرف انیسؔ شناسی کو موضوع بنا کر دنیائے ادب کے سامنے ''انیسؔ شخصیت اور فن'' کے عنوان سے ایک گراں قدر تحقیقی و تنقیدی دستاویز پیش کی۔ جس پر گورکھپور یونیورسٹی نے پروفیسر فضل امام کو ڈی۔لٹ کی ڈگری تفویض کی۔ ۴۸۳ صفحات پر مشتمل یہ مقالہ ۱۹۸۴ء میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن اتر پردیش اردو اکادمی نے شائع کیا۔

پروفیسر فضل امام کی تصنیفات و تالیفات ''امیر اللہ تسلیم: حیات اور شاعری''، ''مثنوی خنجر عشق''، ''ترتیب و مقدمہ''، ''بھوجپوری ادب کا تعارف''، ''جدید ہندی شاعری: سمت و رفتار''، ''مثنوی نغمۂ مسلسل''، ''افکار و نظریات''، ''دیوان درد کا نقش اول''، ''راجستھانی زبان و ادب'' اور ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ کی ترتیب و تقدیم'' وغیرہ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پروفیسر فضل امام اپنے ادبی سفر میں کسی ایک

مکتبِ فکر، نظریے، تحریک، رجحان یا ازم سے بندھ کر نہیں رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی رائے کبھی بھی ترجیحات وتعصّبات کی بنیاد پر کسی طرح کی جانب داری کا شکار نہیں ہوتی۔ وہ اہل نظر کے سامنے کسی بھی سود وزیاں کی پرواہ کیئے بغیر نہایت بے باکی اور برجستگی کے ساتھ اپنا مطمح نظر پیش کرتے ہیں۔ یہی ان کی تحریروں کا مابہ الامتیاز ہے۔ ''انیسؔ شخصیت اور فن'' بھی انہیں اوصاف کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

''انیسؔ شخصیت اور فن'' کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے والے اس بات سے اتفاق کریں گے کہ پروفیسر فضل امام اپنی وسعتِ مطالعہ اور اخذ نتائج کی بھرپور صلاحیتوں کے باعث کتاب کے پہلے باب سے ہی قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔ نہایت شرح وبسط کے ساتھ تجزیے اور تشریح کے مرحلوں میں داخل ہوتے ہوئے کتاب کے ابتدائی اوراق کے مطالعے سے ہی یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ انیسیاتؔ کی تعبیر وتفہیم میں پروفیسر فضل امام نے کتنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ کتاب کے پہلے باب ''اردو مرثیہ قبل انیسؔ'' میں ہی مرثیے کے اولین نقوش کو تلاش کرتے ہوئے پروفیسر فضل امام بہت آگے تک نکل گئے ہیں اور مرثیے کی تاریخی کڑیوں کو انسانیت کی ابتدائی تاریخ سے جوڑ دیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے صرف زبانی دعوے نہیں کیئے ہیں بلکہ تاریخ آدم وعالم سے اپنے دعوے کی دلیلیں بھی فراہم کی ہیں۔ مرثیے کے آغاز وارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر فضل امام نے عربی شعروادب کا بھی مطالعہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ عربی شعروادب کے ارتقا میں مراثی نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔

عربی شاعری میں مرثیے کی صورت حال کا جائزہ لینے میں مصنف نے بہت کم لفظیں صرف کی ہیں لیکن عربی مرثیہ نگاری کی تاریخ کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔ مرثیے کی تاریخ جب عربی سے فارسی میں منتقل ہوتی ہے تو اس صنف کی ہیئت اور ماہیت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا احاطہ بھی پروفیسر فضل امام نے نہایت باریک بینی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی تحریر کا یہ اقتباس دیکھئے:

> ''جب جذبات کو ٹھیس لگتی ہے، جب دل کے تار چوٹ کھا کر جھنجھنا اٹھتے ہیں، قلب وذہن میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے تو مرثیہ پھوٹ کر نکلتا ہے۔ عربی مرثیہ نگاری کی یہی وہ خصوصیات ہیں جنہوں نے عجم کو بھی متاثر کیا۔ وہاں بھی مرثیے کی اصطلاح جاری ہوئی، لیکن عرب کے ریگزاروں اور کہیں کہیں نخلستانوں کی فضا سے نکل کر جب مرثیہ ایران کے چمنستانوں میں پہنچتا ہے تو اس کی ہیئت اور روپ میں تبدیلیاں ہونے لگتی ہیں۔ عرب وعجم کے مزاجوں اور جغرافیائی وتہذیبی ماحول کے فرق ظاہر ہونے لگتے ہیں جس سے فارسی کے مرثیوں میں آمد کی بجائے آورد، برجستگی اور بے ساختگی کی جگہ تصنع وآورد کا بول بالا ہو گیا۔'' (ص/۲۱)

عرب سے ایران، ایران سے ہندوستان، ہندوستان سے بیجاپور گولکنڈہ، دہلی اور اودھ میں مرثیہ کن نئی اور پرانی روایات کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ اردو مرثیہ عربی اور فارسی کے قائم کردہ کن خطوط پر گامزن ہوتا ہے اور کہاں کہاں اپنی راہیں الگ کرتا ہے۔ ہیئت اور ماہیت کی سطح پر کن تبدیلیوں سے دوچار ہوتا ہے، زبان واسلوب کے کیسے کیسے تغیرات رونما ہوتے ہیں ان تمام جہات ونکات کا احاطہ پروفیسر فضل امام نے کتاب کے پہلے باب میں بڑی دقتِ نظر کے ساتھ کیا۔ ماقبل انیسؔ نمائندہ اور منتخب شعرا کے مراثی سے چیدہ چیدہ مثالیں پیش کر کے فاضل

مصنف نے اپنے مطالعے کو مزید وقیع بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

کتاب کا دوسرا باب پروفیسر فضل امام نے انیسؔ کی شخصیت کے لیے مخصوص کیا ہے۔جس میں انیسؔ کے اسلاف واخلاف، وضع قطع، عادات وخصائل، تعلیم وتربیت، معاشرہ وماحول اور گردوپیش کے حالات وکوائف، منظر وپس منظر کا احاطہ کیا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے عناصر جو شخص کو شخصیت بنانے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں پروفیسر فضل امام نے ان سب کی تفصیلات بھی فراہم کی ہیں اور ان کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ فاضل مصنف کے قلم سے انیسؔ کے سراپا اور مزاج پر نظر تو ڈالیے:

''وضع قطع کے بہت پابند تھے۔ بدن چھریرا لیکن ورزشی، شہ سواری، شمشیر زنی اور بنوٹ میں مشاق تھے۔قد اوسط لیکن مائل بہ درازی، کسرتی بدن ہونے کے باعث چست اور گٹھا ہوا، سینہ کشادہ، گردن صراحی دار، چہرہ کتابی کھلا ہوا، آنکھیں بڑی بڑی، لال لال ڈورے، رنگ گندمی تھا۔ داڑھی مونچھوں کے مقابلے میں چھوٹی اور باریک، اتنی باریک کہ دور سے منڈی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔سر پر حباب کی شکل کی چوگوشیا ٹوپی، نیچا گھیر دار کرتا، ڈھیلی مہری کا سفید پائجامہ اور گٹھیلا جوتا استعمال کرتے تھے۔ ہاتھ میں ہلکی خوبصورت چھڑی اور رومال بھی لازمی طور پر رہتا تھا۔ان کے عہد کے اہل علم وفضل وکمال کا یہ لباس اور وضع تھی۔انیس اپنی وضع پر اتنی سختی سے پابند تھے کہ ایک بار حیدرآباد میں سرسالار جنگ مرحوم مدار مہام وزارت بھی جب ان کو سننے کے متمنی ہوئے لیکن یہ شرط لگادی کہ سر پر حیدرآبادی ٹوپی یا ننگے سر ہوں تب ہی میں انیسؔ کو سن سکتا ہوں۔لوگوں نے انیسؔ سے کہا کہ کیا مضائقہ ہے۔سر پر عمامہ رکھ لیں یا ننگے سر پڑھیں یہ مجلسِ غم ہے کوئی حرج نہیں ہے۔اس طرح صدرِ اعظم بھی سن لیں گے۔لیکن انیسؔ کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور بولے کہ میر انیسؔ تو یہی ٹوپی پہن کر مجلس پڑھتا آیا ہے۔سر پر عمامہ رکھ کر یا ننگے سر مجلس پڑھنا میرے لیے ممکن نہیں۔'' (ص ر ۶۳۔ ۶۴)

درج بالا اقتباس سے واضح ہوجاتا ہے کہ انیسؔ اپنی وضع، اپنی خو اپنے مزاج اور اپنی طبع کے کس قدر پابند تھے۔حیدرآباد ہی نہیں لکھنؤ اور الہٰ آباد کی مجلسوں کے بھی مرقعے پروفیسر فضل امام نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ کھینچے ہیں۔جن کی مدد سے انیسؔ کی ذہانت، فطانت، حافظے، حاضر جوابی اور برجستہ گوئی کو بہ آسانی وبہ خوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

انیسؔ کے عہد میں لکھنؤ کے مختلف محلوں میں اردو زبان کے مختلف لہجے تھے۔ایسے میں میر انیسؔ کو اپنے گھرانے کی زبان پر نہ صرف یہ کہ فخر تھا بلکہ وہ اپنے گھر کے لہجے میں کسی دوسرے لہجے کی آمیزش بھی پسند نہیں کرتے تھے اور نہ یہ پسند کرتے تھے کہ کسی کم لہجہ گھرانے کے لوگ ان کے گھر کی زبان کو اپنے لہجے سے آلودہ کریں۔لوگ خاندان انیسؔ کے شعراء کے کلام کی نقلیں لینے خاص طور سے میر مونسؔ کے پاس آیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار میر مونسؔ کی ایک غزل ایک نواب صاحب کے ذریعہ کسی طائفہ دار تک پہنچ گئی اور چوک میں تحسین علی خاں کی مسجد میں جاتے ہوئے میر انیسؔ نے وہ غزل سن لی تو گھر پہنچتے ہی میر مونسؔ پر اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ''غضب ہے کہ میر خلیقؔ کے

گھرانے کی زبان طائفہ داروں کے گھر پہنچے'' اس پر جب میر مونسؔ نے اپنی لاعلمی کا عذر کیا تو میر انیسؔ چیں بہ جبیں ہوکر بولے: ''کیا میں اب اپنے گھر کی زبان بھی بھول گیا ہوں۔'' یہ واقعہ بھی زبان کے تئیں میر انیسؔ کی احتیاطوں کو سمجھنے کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

خاندانی روایات، خرد و بزرگ کا پاس، رشتوں کا رکھ رکھاؤ اور آداب مجلس کے جملہ پہلوؤں کو پروفیسر فضل امام نے پیش نظر رکھا ہے اور قطرے سے گہر ہونے تک انیسؔ کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ان کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے۔ انیسؔ کی شاعرانہ تعلیوں کے پیش نظر ہمارے اکثر نقادوں نے انھیں مرزا دبیرؔ کا حریف ٹھہرایا ہے اور یہ تصور کیا ہے کہ میر انیسؔ نے اپنی تعلّی کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ مرزا دبیرؔ کو حریف سمجھ کر کہا ہے جب کہ ایسا قطعی نہیں ہے۔ انیسؔ کو تو اپنے فن کا بھرپور عرفان تھا۔ انہوں نے جو کہا ہے وہ ان کے عرفان ذات کا مظہر ہے۔ میر انیسؔ میرزا دبیرؔ کے حریف نہیں بلکہ خیر خواہ تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح ہمارے بعض ناقدین انیسؔ کی تعلیوں کو صرف اور صرف ان کے غرور اور انا سے تعبیر کرتے ہیں جب کہ انیسؔ کی شاعرانہ تعلیوں میں ہی انیسؔ کے مزاج کا انکسار بھی موجود ہے۔ جس کا مکمل ثبوت ان کی یہ بیت ہے:

ہم خوش ہوئے کہ مدح کے دریا بہادیئے　　کیا ہوگیا جو بحر میں قطرے ملادیئے

علمی میدانوں میں مطالعے اور مشاہدے کے ساتھ ہی قوتِ استدلال کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ پروفیسر فضل امام کی تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کے یہاں استدراک اور استدلال کی بھرپور صلاحیتیں موجود ہیں۔

کتاب کا تیسرا باب انیسؔ کی مرثیہ نگاری کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ یہ کتاب کے ۱۶۶ صفحات پر مشتمل ہے کتاب کے اس بنیادی باب میں انیسؔ کے شعری محاسن کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ابتدا میں مرثیہ نگاری کی صفات، خصوصیات، اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر مرثیے پر کئے گئے اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔ خاص طور سے کلیم الدین احمد، احسن فاروقی اور اظہر علی فاروقی کے اعتراضات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور پھر انیسؔ کی زبان، بیان، لفظیات، لسانیات، اخلاقیات، جذبات نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، رزمیہ عناصر اور ہندوستانی عناصر کی بحثیں قائم کی گئی ہیں۔ یہ سارے مباحث قاری سے پروفیسر فضل امام کے تنقیدی محاکے کی بھرپور صلاحیتوں کا اعتراف کراتے ہیں۔

کردار نگاری کی بحث کرتے ہوئے پروفیسر فضل امام نے زوجۂ یزید ہند کے کردار کا مراثی انیسؔ کی روشنی میں تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ منظر نگاری کے حوالے سے پروفیسر فضل امام کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:-

> ''عام طور سے منظر نگاری کے سلسلے میں صرف یہ تصور ہے کہ الفاظ کے ذریعے کسی مناظر قدرت کی تصویر کھینچ دی جائے لیکن ایسا نہیں ہے۔ منظر نگاری کو صرف مناظر قدرت کی تصویر کشی تک محدود کر دینا تصور کی بے کراں وسعتوں اور مشاہدوں کے لامحدود امکانات کے ساتھ ناانصافی ہے کیوں کہ مناظر قدرت خارجی مظاہر ہیں اور اخلاقی شاعر کے تصور کی گہرائی اور گیرائی صرف ان خارجی مظاہر کی تصویر کشی سے مطمئن نہیں ہوسکتی۔ میر انیسؔ کی منظر نگاری اس تنوع پسندی کا

ناقابل تردید ثبوت ہے۔'' (ص/ ۱۹۳)

کتاب کا چوتھا باب انیسؔ کی رباعیات پر مشتمل ہے۔ رباعی کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے پروفیسر فضل امام نے رباعی کی بحر، ہیئت اور موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ مرثیہ گویوں نے یہ اصول وضع کرلیا تھا کہ وہ مرثیے سے پہلے سلام اور سلام سے پہلے رباعیاں پڑھ کر مجلس کی فضا بندی کرتے تھے لہٰذا اردو میں رباعیوں کا اتنا بڑا قابل قدر ذخیرہ مرثیہ گو شعرا کے سبب سے ہی جمع ہوسکا ہے۔ اور پھر انیسؔ کی متعدد رباعیوں کے جائزے سے ثابت کیا ہے کہ انیسؔ کو اگر مرثیے میں تفصیل کے ساتھ اپنے مضمون کو پھیلانے میں ملکہ حاصل تھا تو وہ رباعیوں میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ نہایت گہرے اور فلسفیانہ مسائل کو پیش کرنے کی قدرت بھی رکھتے تھے۔ پروفیسر فضل امام کے بقول:

> ''انیسؔ نے رباعی کو صرف سنجیدہ اور مہذب شاعری کا نمونہ ہی بنا کر نہیں پیش کیا بلکہ کائنات اور اس کے متعلقہ مسائل پر عالمانہ طور پر اظہار رائے کے قابل بنا دیا۔ اگر ان کی رباعیات ایک طرف شاعری کا بہترین نمونہ ہیں تو دوسری طرف فلسفیانہ خیالات کا قابل قدر ذخیرہ ہیں۔'' (ص/ ۲۸۵)

کتاب کا پانچواں باب انیسؔ کی سلام نگاری اور قطعات نگاری پر مشتمل ہے۔ انیسؔ کے سلام بھی اپنی انفرادی شان رکھتے ہیں۔ پروفیسر فضل امام نے انیسؔ کے سلاموں کے حوالے سے بہت سے تحقیقی مسائل اٹھائے ہیں۔ آج بھی انیسؔ کے بہت سے کلام بکھرے ہوئے ہیں ان پر سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انیسؔ نے الگ سے قطعات نہیں کہے ہیں لیکن ان کے سلاموں میں ہی بہت سے قطعہ بند اشعار موجود ہیں۔ پروفیسر فضل امام نے انیسؔ کے سلاموں سے ایسے قطعات کا ایک انتخاب پیش کردیا ہے، جو انیسؔ کی قطعہ نگاری کو سمجھنے میں بہرحال معاون ہوں گے۔

کتاب کے آخر میں خلاصۂ کلام اور کتابیات کی فہرست شامل ہے۔

مجموعی طور سے پروفیسر فضل امام کے ادبی کاموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرثیے اور انیسؔ سے انھیں روحانی وابستگی ہے۔ حالانکہ مرثیے اور انیسؔ پر پروفیسر فضل امام سے پہلے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن وہ اس میدان میں کسی سے مرعوب و متاثر ہوئے بغیر پوری ادبی دیانت کے ساتھ اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ انیسؔ کے مرثیوں کے تنقیدی تجزیوں سے پروفیسر فضل امام کے وسعت مطالعہ، دقت نظر، عمیق نگاہی اور عرق ریزی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اردو میں ڈی۔لٹ کے لیے تحقیقی و تنقیدی مقالے تو بہت سے لکھے گئے ہیں لیکن پروفیسر فضل امام کے مقالے ''انیسؔ شخصیت اور فن'' نے جس طرح اپنے زمانے کے نامور ادیبوں اور دانشوروں سے داد و تحسین حاصل کی اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اس مقالے کے حوالے سے پروفیسر محمد حسن اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''اردو تنقید نے ہنوز انیسؔ کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام نے اپنی تصنیف میں انیسؔ کے فن کا نئے زاویے سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر متوازن ہے۔ تعصّبات اور تاثرات کو صرف رائے زنی کے طور پر رنگین

جملوں اور چٹ پٹے فقروں میں بیان کرنے کے بجائے وہ سنجیدہ مطالعے کے عادی ہیں اور اپنے خیالات کو دلیل اور ثبوت سے آراستہ کر کے پیش کرتے ہیں۔ وہ انیسؔ کے وکیل نہیں بلکہ ایک باذوق قاری اور ایک ذمہ دار نقاد کی طرح انیسؔ کا مطالعہ کرتے ہیں اور مطالعے سے ''انیسؔ شخصیت اور فن'' کی اہمیت و معنویت کا اعتراف معروف کے سامنے پیش کرتے ہیں۔'' (فلیپ: انیسؔ شخصیت اور فن)

''انیس شخصیت اور فن'' کی اہمیت و معنویت کا اعتراف معروف نفسیاتی نقاد پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی ان جملوں کے ساتھ کرتے ہیں:

''زیرِ نظر مطالعہ ڈاکٹر فضل امام کے خوشگوار تنقیدی شعور و اسلوب کا حاصل ہے۔ انہوں نے میر انیسؔ کی فنکاری کا جائزہ نہایت جامع سیاق و سباق میں لیا ہے اور نہ صرف ان کے معنوی نہاں خانے تک پہنچنے کی کوشش کی ہے بلکہ لفظیات کے بیرونی نگار خانے پر بھی باخبری کی نگاہ ڈالی ہے۔ پردۂ ساز کا کہرام، شمشیر کی جھنکار، دامن صحرا پر موتیوں کی لرزش، پرطاؤس کی قلم کاری، خون شہدا کی شفق، مرثیت کا آب زلال اور پھر تاریخ روایت کا انتہائی پیچیدہ سلسلۂ خیر و شر، میر انیس کی فنکاری کے بنیادی اور علامتی اجزا سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل امام نے ان سبھی نکات پر بصیرت خیز نظر ڈالی ہے اور انیسیاتؔ کے سرمائے میں ایسی توسیع کی ہے جو قابل دید و داد ہے۔'' (فلیپ: انیسؔ شخصیت اور فن)

بلاشبہ ''انیس شخصیت اور فن'' انیسؔ شناسی کے میدان میں پروفیسر فضل امام کا ایک یادگار تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ہے۔ ادبی دنیا ان کی تحقیقی ژرف نگاہی اور تنقیدی بصیرتوں کی قائل ہے۔ انہوں نے اس وقیع مقالے کے علاوہ انیسیاتؔ کے حوالے سے جو کام کئے ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ اردو کے تنقید نگاروں نے میرؔ، غالبؔ، اور اقبالؔ کے شعری امتیازات کو جس طرح نمایاں کیا ہے، انیسؔ کے اوپر اس طرح کا شایان شان کام ہونا ابھی باقی ہے۔ بلاشبہ پوری دنیا میں انیسؔ سب سے زیادہ پڑھے جانے والے شاعر ہیں لیکن تنقید کی میزان پر ان کے کلام کو ابھی اس طرح نہیں لایا گیا ہے جس کے وہ حق دار ہیں۔ اردو تنقید انیسؔ شناسی کے حوالے سے بہر حال قرض دار ہے۔ پروفیسر فضل امام نے ''انیس شخصیت اور فن'' جیسا جامع مقالہ تصنیف کر کے اس فرض کو ادا کرنے کی قابل ستائش سعی کی ہے۔ امید ہے کہ پروفیسر فضل امام کے بعد آنے والے نقادوں کی نئی نسل انیسیات پر مزید کام کرے گی اور انیسؔ کے فکر و فن کے مختلف ابعاد و امکانات کو مزید روشن کرے گی۔ ابھی انیسؔ پر بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے لیکن آئندہ بھی جو کچھ لکھا جائے گا ان میں پروفیسر فضل امام رضوی کی کتاب ''انیسؔ شخصیت اور فن'' کو بنیادی حیثیت حاصل رہے گی۔

❁❁❁❁

نبّاضِ زبان وادب میر ببر علی انیسؔ

پروفیسر ایس ایم ارشد رضوی

انیسؔ اردو شاعری کی اس شخصیت کا نام ہے جو محتاج تعارف نہیں، جس طرح سے غزل کا ذکر ہوتا ہے تو میرؔ و غالبؔ کا نام خود بخود زبان پر آجاتا ہے، اسی طرح جب بھی مرثیہ کا ذکر ہوتا ہے تو میر انیسؔ کا ذکر ناگزیر ہوتا ہے۔ میر انیسؔ کے کلام کی شہرت و مقبولیت اور عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب تک صدہا مضامین و مقالات کے ذریعہ انیسؔ کے کلام کا موازنہ دنیا کی عظیم ادبی شخصیتوں ہومرؔ، ورجلؔ، ملٹنؔ، شیکسپیئرؔ اور فردوسیؔ کے فن پاروں سے کیا جا چکا ہے۔ کسی نے انیسؔ کے مرثیوں میں رزمیہ عناصر تلاش کر کے عظیم رزمی شاعر قرار دیا ہے، کسی نے المیہ نظم کا ماہر بتایا۔ انیسؔ کی قادر الکلامی دیکھ کر دنیائے ادب انگشت بدنداں رہ گئی اور انیسؔ کو خدائے سخن کا لقب دینے پر مجبور ہو گئی۔

انیسؔ نے اردو ادب کے دامن کو الفاظ کے ذخیرہ سے بھر دیا۔ انیسؔ کا کمال یہ نہیں ہے کہ انھوں نے اردو کے ہر شاعر سے زیادہ الفاظ استعمال کئے بلکہ کمال یہ ہے کہ انھوں نے جس لفظ کو جس جگہ استعمال کیا ایسا لگتا ہے کہ اس لفظ کی تخلیق ہی اسی جگہ کے لیے ہوئی تھی۔ لیکن مرثیہ کے موضوع پر کچھ لکھنے کے لیے میر انیسؔ کے کلام کا مطالعہ اور اس کا تذکرہ کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ میر انیسؔ کے بعد مرثیہ گویوں نے چاہے جس جہت و زاویہ سے مرثیہ کہنے کی کوشش کی ہو میر انیسؔ کا اثر ہر جگہ نمایاں ہے۔ کیونکہ میر انیسؔ نے مرثیہ کے موضوع کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا کہ جہاں اپنے اشہبِ تخیل کو کاوے نہ دیے ہوں۔ میر انیسؔ کے بعد کی مرثیہ گوئی کا منصفانہ طور پر جائزہ لینے کے لیے میر انیسؔ کے کلام کا بہ نظر غائر مطالعہ ضروری ہے۔

انیسؔ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے پہلے انیسؔ کی شخصیت ان کے گرد و پیش کا ماحول، تعلیمی استعداد اور شعر و سخن کے ذوق کو جاننا بے حد ضروری ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کا تفصیلی جائزہ لینے کی گنجائش نہ ہونے کے سبب مختصر طور پر ان کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

انیسؔ کو شعر و سخن کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ انیسؔ کے پردادا میر غلام حسین ضاحکؔ اردو کے صاحب دیوان اور ماہر فن شاعر تھے۔ غزلوں کے علاوہ مرثیہ بھی کہتے تھے۔ فارسی اور اردو میں ان کا کلام موجود ہے۔ ذیل میں ان کے دو شعر نقل کیے جاتے ہیں جو ان کے قادر الکلام ہونے کی دلیل ہیں۔

در پیش اگر روزِ اجل آہ نہ ہوتا　　قصہ تھا محبت کا یہ کوتاہ نہ ہوتا
کیا دیجیے اصلاح خدائی کو وگرنہ　　کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

میر انیسؔ کے دادا میر حسنؔ کا نام بھی محتاج تعارف نہیں۔ مثنوی "سحر البیان" ان کا ایسا کارنامہ ہے جس پر اردو ادب کو ہمیشہ ناز رہے

گا۔انھوں نے بھی مرثیے کہے ہیں۔دہلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ساتھ میر حسنؔ بھی فیض آباد چلے آئے تھے۔میر انیسؔ کے والد میر مستحسن خلیقؔ کی قادرالکلامی اظہر من الشّمس ہے۔ان کے علاوہ میر انیسؔ کے دو چچا میر خلقؔ اور مخلوقؔ بھی قادرالکام شاعر تھے۔اس لئے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ میر انیس ادب کے گھر میں پیدا ہوئے اور شعر وسخن کی آغوش میں پرورش پائی۔

میر انیسؔ کی تعلیمی استعداد اور بچپن کے حالات کا تفصیلی ذکر کہیں نہیں ملتا۔ماہرِ انیسیاتؔ سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے ان کے دو استادوں میر نجف علی فیض آبادی اور مولوی حیدر علی لکھنوی کا ذکر کیا ہے۔غالباً ابتدائی تعلیم میر انیسؔ نے انہیں استادوں سے حاصل کی ہوگی ان کے علاوہ میر انیسؔ نے عربی فارسی کی تعلیم گھر میں بھی حاصل کی ہوگی کیونکہ انیسؔ کی والدہ بھی فارسی زبان اور علوم دینیہ سے کافی واقفیت رکھتی تھیں۔شاعری میں انیسؔ کے کسی استاد کا ذکر نہیں ملتا ہے لیکن ابتدا میں میر انیسؔ کے کلام پر ان کے والد میر خلیقؔ اور چچا مخلوقؔ نے اصلاح دی ہوگی۔ا

انیسؔ کا گھریلو ماحول مذہبی تھا جس کی جھلک ان کے کردار میں نظر آتی ہے۔

مسعود حسن رضوی ادیبؔ تحریر کرتے ہیں کہ۔

"انسان کی سیرت جن چیزوں سے بنتی ہے ان میں اس کی تعلیم وتربیت اور اس کے مذہبی خیالات کا اثر سب سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔انیسؔ نے جس فضا میں تربیت پائی تھی اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ وہ ایک متین، خوددار اور مذہبی آدمی ہوں"۲؎

ہر شاعر کی طرح انیسؔ نے بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن جلد ہی غزل گوئی سے دامن چھڑا لیا۔اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔کیونکہ میر انیسؔ کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی وہ اس دور کے لکھنؤ یا فیض آباد کی غزل گوئی کو قبول بھی نہ کر پاتا کیونکہ اس دور میں غزل میں سنجیدہ مضامین سے ہٹ کر عامیانہ پن، عیش کوشی وعیش پسندی کے مضامین پر مبنی ہوگئی تھی بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کے بے حیائی کی حدود میں داخل ہوگئی تھی۔ریختی بے حیائی کا جامہ پہن کر تکلف وتصنع کے سہارے ادبی صف میں کھڑے ہونے کی کوشش کر رہی تھی، رعایت لفظی، صنایع وبدایع فنی معیار قرار دئے جا چکے تھے۔غزل بھی معنویت سے دور ظاہری حسن، زلف ورخ، اشارہ ابرو، کج ادائی، پیار کی باتوں کا تذکرہ گلے شکوے اور کنگھی چوٹی کے مضامین میں گرفتار ہو چکی تھی۔تصوف کا موضوع بھی اپنے روکھے پن کی وجہ سے قبولیت کا شرف نہ حاصل کر سکا تھا۔اس لیے انیسؔ کی نگہ مرثیے پر پڑی۔مرثیہ جو اس وقت ضمیرؔ، فصیحؔ، خلیقؔ اور دلگیرؔ کے ہاتھوں اپنا ادبی مقام متعین کر چکا تھا۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد عقیل رضوی تحریر کرتے ہیں۔

"انیسؔ نے شاعری کے لیے اپنے موضوع کا انتخاب ایسا کیا تھا جس میں وہ رنگ رلیاں نہیں آ سکتی تھیں جو لکھنؤ کے ایک خاص طبقے کا اوڑھنا بچھونہ بنی ہوئی تھیں۔اس میں مجبوری کو دخل نہیں تھا بلکہ بالقصد ایسا کیا گیا تھا۔"۳؎

انیسؔ کا موضوع نیا نہیں تھا بلکہ یہ کہا جائے کہ انیسؔ نے شاعری کے لئے وہ موضوع اختیار کیا تھا۔کہ جس موضوع پر سب سے زیادہ طبع آزمائی کی جا چکی تھی۔مختلف ارتقائی منزلوں سے گزر کر مرثیہ میر ضمیرؔ اور ان کے ہم عصروں کے ہاتھوں مستقل شکل اختیار کر چکا تھا۔انیسؔ نے مرثیے میں اپنا ایک منفرد اور ممتاز مقام بنایا اور مرثیے کو عروج کی ان منزلوں پر پہنچا دیا کہ جہاں سے دوسری اصناف سخن کمتر نظر آنے لگیں۔

مرثیہ جن اسباب کی بنا پر منزلِ کمال پر پہنچا ان میں رزمیہ، المیہ، واقعہ نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری اور مکالمہ نگاری کے ساتھ ساتھ انیسؔ کی زبان اور صنایع و بدایع کے استعمال نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سلسلے میں سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ لکھتے ہیں۔

"انیسؔ کی زبان جن محاسن کا گنجینہ ہے اس کو ہر سخن شناس محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی ایک خوبی ایسی ہے جو دوسری اہم تر خوبیوں میں دب کر رہ جاتی ہے۔ اور وہ ہے صنایع لفظی و معنوی کا حسنِ استعمال انھوں نے جتنی صنعتیں جس کثرت اور جس سلیقے سے استعمال کی ہیں اس کی نظیر دوسرے شاعر کے یہاں نہیں مل سکتی۔" ۴؎

علامہ شبلیؔ رقم طراز ہیں کہ۔

"نظم میں الفاظ کی ترتیب نثر کی سی ہو، یہ صفت میر انیسؔ صاحب سے زیادہ کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی، میر صاحب کے کلام میں بلاغت الفاظ اگرچہ انتہا درجہ کی ہے۔ لیکن ان کے کمال کا اصلی جوہر معنی کی بلاغت میں کھلتا ہے۔" ۵؎

اردو میں واقعہ نگاری کا حقیقی پرتو مرثیوں کے بجز کسی دوسری صنف سخن میں نہیں ملتا اگر ملتا بھی ہے تو مثنوی میں لیکن مثنویاں زیادہ تر عشقیہ ہوتی تھیں اس لئے واقعات بھی تخیل پر مبنی ہوتے تھے۔ جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا تھا۔ اردو کو حقیقی واقعہ نگاری سے مرثیوں نے ہی روشناس کرایا اور انیسؔ کے یہاں تو واقعہ نگاری منزل کمال پر پہنچ کر مرقع کشی میں تبدیل ہوگئی ہے۔ یعنی انیسؔ جب کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے حرکت کرنے لگتی ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی تحریر کرتے ہیں کہ۔

"میر انیسؔ نے واقعہ نگاری کو جس کمال کے درجے تک پہنچایا ہے اردو کیا فارسی میں بھی اس کی نظیریں مشکل سے مل سکتی ہیں۔" ۶؎

انیسؔ جب کوئی واقعہ نظم کرتے ہیں تو واقعہ سے متعلق تمام جزئیات پر نظر رکھتے ہیں اور اس کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ بند ملاحظہ ہو۔

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند　　دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند　　چمکارتے تھے حضرتِ عباسؑ ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا　　گردن پھرا کے دیکھتا تھا منھ سوار کا

تاریخ میں واقعہ یہ ہے کہ حضرت عباس نے گھوڑے کو دریا میں ڈال کر سوکھی مشک بھری، خود بھی پانی نہیں پیا اور گھوڑا بھی پانی پیئے بغیر دریا سے نکل آیا۔ لیکن انیسؔ نے دو دن کے پیاسے گھوڑے کی پانی دیکھ کر جو کیفیت ہوگی اور جس کشمکش میں مبتلا ہوگا اس کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ واقعہ میں جاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔ اور نفس واقعہ اپنی جگہ بغیر کسی ترمیم کے مسلم ہے۔ یہ بات اسی وقت ممکن ہے کہ جب شاعر کا مشاہدہ بہت گہرا اور وسیع ہو اور ہر چھوٹی بڑی بات پر اس کی نظر ہو۔ میر انیسؔ فطرت کے بہت بڑے نبّاض ہیں۔ فقط انسانی خصائل ہی نہیں جانوروں تک کی عادت و اطوار پر ان کی نظر ہے۔ حالیؔ انیسؔ کی واقعہ نگاری کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں کہ۔

"میر انیسؔ جہاں کہیں واقعات کا نقشہ اتارتے ہیں یا نیچرل کیفیات کی تصویر کھینچتے ہیں یا بیان میں تاثر کا رنگ بھرتے ہیں، وہاں اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ مقتضائے وقت کے موافق جہاں تک امکان تھا۔ میر انیسؔ نے اردو شاعری کو اعلیٰ درجے پر پہنچا دیا۔" ۷؎

واقعہ نگاری کی بے مثل نظیروں سے انیسؔ کا کلام بھرا پڑا ہے۔طوالت کے سبب مثالیں دینا ممکن نہیں ہے۔انیسؔ کی واقعہ نگاری کے سلسلے میں کلیم الدین احمد کی رائے بھی ملاحظہ ہو کہ جن کی نظروں میں پوری اردو شاعری بے وقعت ہے۔

"انیسؔ واقعہ نگاری میں کمال رکھتے ہیں۔ان کا دعویٰ بے جا نہیں ہے کہ ان کی نقاشی سے مانیؔ و بہزادؔ دنگ ہیں۔یہ محض شاعرانہ تعلّی نہیں کہ "خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ۔"۸؎

انیسؔ کے مرثیوں میں جذبات نگاری کی جو اعلیٰ مثالیں موجود ہیں۔وہ کسی دوسرے مرثیہ نگار کو نصیب نہیں۔انیسؔ نے فطرت انسانی اور مختلف موقعوں پر اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔اس لیے غم، خوشی، حیرت، نفرت، غصہ کی حالتوں کو بیان کر لینا کوئی بہت بڑا کمال نہیں ہوتا لیکن جب ان میں سے بہت سی کیفیات یکجا ہو جائیں اور اس کا ہو بہو نقشہ کھینچ دیا جائے تو یقیناً کمال کی بات ہے۔انیسؔ نے خاص طور پر ایسے مقامات پر جذبات کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ مختلف کیفیت آپس میں ٹکراؤ کے باوجود اپنے علیحدہ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔اس طرح کی مثالیں انیسؔ کی شاعری میں خاص طور سے ان جگہوں پر موجود ہیں کہ جہاں حضرت عباسؑ کا غصہ، شجاعت، حسرت یہ تمام چیزیں یکجا ہوگئی ہیں اور حضرتِ عباسؑ کی جو تصویر انیسؔ نے کھینچی ہے وہ یقیناً لاجواب ہے۔مثال۔

جب لاشۂ قاسمؑ کو علمدار نے دیکھا　　قبضے کی طرف غیض سے جرّار نے دیکھا
منھ بھائی کا رو کر شہؑ ابرار نے دیکھا　　کی عرض برا داغ نمک خوار نے دیکھا
تیغوں سے عجب سروِ رواں کٹ گیا آقا　　واللہ کی دل زیست سے اب ہٹ گیا آقا

یاد آتی ہے بھائی کی وصیت مجھے ہر بار　　قدموں سے دمِ مرگ جو لپٹا تھا یہ غمخوار
فرمایا تھا خادم سے برادر نے بہ تکرار　　عباسؑ دلاور مرے قاسمؑ سے خبردار
جو اس پہ بلا آئے وہ رد کیجیو بھائی　　ہر دکھ میں بھتیجے کی مدد کیجیو بھائی

تلوار چلی دل پہ بھتیجے کے الم سے　　ٹپکا کیا چہرے پہ لہو دیدۂ غم سے
کچھ بس نہ چلا حکمِ شہنشاہِ امم سے　　دیکھا کیے کیا خوب حفاظت ہوئی ہم سے
قاسمؑ کے عوض تیغ و سنا کھانہ سکے ہم　　پامال بھتیجا ہوا اور جا نہ سکے ہم

ان تین بند میں حضرت عباسؑ کی حالت جذبات کی مختلف کیفیات کا جو سماں پیش کر رہی ہے لاجواب ہے۔انیسؔ کی جذبات نگاری کے سلسلے میں علامہ شبلیؔ رقم راز ہیں کہ۔

"رنج و غم، جوش، محبت، غیض، بے قراری، بے تابی، حسرت، خوشی محسوس اور مادی چیزیں نہیں۔۔۔۔۔۔اس لیے ان کی ہو بہو اور اصلی تصویر اتارنا مشکل ہے۔میر انیسؔ کا اصل جوہر یہیں آ کر کھلتا ہے اور یہیں ان کی شاعری کی حد ان کے ہم عصروں سے الگ ہو جاتی ہے۔"۹؎

انیسؔ فطرت کے زبردست نکتہ داں ہیں کبھی کبھی انسان کے اندر کئی طرح کے جذبے وقفے وقفے سے پیدا ہوتے رہتے ہیں نہ جانے کتنی

کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔انیسؔ ایک ماہر بتّاض کی طرح اس کو محسوس کرتے ہیں اور بہت ہی مؤثر انداز میں بیان کرتے ہیں۔

مرثیے کا موضوع کردار نگاری کے زاویہ سے اگر دیکھا جائے تو بالکل الگ ہے۔اس لیے کہ مرثیہ کے کرداروں کا عمل متعین ہے۔مرثیہ نگار اس میں کسی طرح کی تبدیلی یا ترمیم نہیں کرسکتا۔اس لیے ناول یا ڈرامہ کی کردار نگاری کے اصولوں پر مرثیہ میں کردار نگاری تلاش کرنا بے سود ہے۔کردار نگاری کے بہترین نمونے اسی وقت سامنے آسکتے ہیں کہ جب کرداروں کے لیے عمل کا میدان متعین نہ ہو اور وہ اچھے برے دونوں طرح کے راستے اپنانے کے لیے آزاد ہوں۔مرثیہ میں جو بھی ہیں وہ یا تو نیکی، شرافت، عزت نفس، شجاعت، دلیری، قناعت اور صبر کے مجسمے ہیں یا بدی لالچ، نفس پرستی، کینہ توزی، ظلم و ذلالت اور زبردستی کے مجسمے ہیں۔مرثیہ نگار ان سے انحراف نہیں کرسکتا۔لیکن جب ہم انیسؔ کے مرثیوں میں کردار نگاری کے پہلو کو تلاش کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ انیسؔ نے اپنی قوتِ مشاہدہ سے ان پابندیوں کے باوجود آزادی کی ایک الگ راہ نکالی ہے۔اور ایک سی صفت کے حامل ہونے کے باوجود ہر کردار کی تصویر الگ قائم کی ہے۔

ڈرامے یا ناول کی کردار نگاری کو ذہن میں رکھ کر ہی لوگوں نے انیسؔ کی کردار نگاری پر اعتراض کیا اور یہ رائے قائم کردی کہ انیسؔ کے مرثیوں میں کردار نگاری مفقود ہے۔جیسے کہ کلیم الدین احمد نے رائے زنی کی ہے۔

"سیرت نگاری تو اردو شعرا میں مفقود ہے۔انیس کے مراثی میں بھی اس کا وجود نہیں.....وہ فرد کی شخصیت کو الگ الگ واضح نہیں کرتے سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں ہر فرد میں وہی خوبیاں ہیں جو دوسرے میں پائی جاتی ہیں۔"۱۰؎

ڈرامے یا ناول کے اصولوں پر انیسؔ کے مرثیوں میں کردار نگاری تلاش کرنا انیسؔ کے ساتھ ناانصافی ہے۔مشترکہ صفات کے حامل ہونے کے باوجود حضرت امام حسینؑ، حضرت عباسؑ، حضرت علی اکبرؑ، حبیب ابنِ مظاہرؓ کے کرداروں میں مکالمے اور جذبات کی مدد سے انیسؔ نے ہر ایک کی الگ پہچان قائم کی ہے۔حُر کے کردار میں احساسات و جذبات کی کشمکش دکھا کر انیسؔ نے یہ ثابت کردیا کہ اگر ان کا موضوع ایسا ہوتا جس میں وہ کردار کا عمل طے کرنے کے لیے آزاد ہوتے تو کردار نگاری کے اعلیٰ نمونے پیش کیے جاسکتے تھے۔نواب امداد امام اثر انیسؔ کی کردار نگاری کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں کہ۔

"میر صاحب کی کردار نگاری ہومر کی کیریکٹر نگاری سے بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے"۱۱؎

یہ حقیقت ہے کہ تاریخ کے مطابق کرداروں کی الوہی شان، طے شدہ حرکت و عمل کی زبردستی پابندیوں کے درمیان انیسؔ نے مرثیوں میں ہر کردار کو امتیازی حیثیت سے حرکت و عمل کرتے دکھایا ہے۔جو میر انیسؔ کا کمال ہے۔جہاں تک کسی دوسرے کی رسائی ممکن نہیں۔مرثیوں میں کردار نگاری بس انیسؔ پر ہی ختم ہوگئی۔

اردو شاعری میں منظر نگاری تقریباً ہر مثنوی نگار، قصیدہ نگار اور نظم نگار شاعر نے کی ہے اور مرثیوں میں بھی منظر نگاری کی گئی ہے۔لیکن انیسؔ کے مرثیوں میں جو منظر نگاری ملتی ہے وہ لاجواب ہے۔صبح کا منظر ہو، رات کی تاریکی ہو، دشت کا پرحول سناٹا ہو یا لڑائی کا میدان ہو یا خیمہ کی منظر کشی ہو۔انیسؔ ہر جگہ فطرت کے ہر گوشے میں سما جاتے ہیں اور ایسے دلکش مناظر پیش کرتے ہیں کہ دل جھوم اٹھتا ہے۔انیسؔ کی منظر نگاری کے لیے ان کا صرف ایک مرثیہ ہی کافی ہے۔

"جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے"

اس مرثیہ میں انیسؔ نے فطرت کے ایسے دلفریب مناظر کا نقشہ کھینچا ہے کہ جس کا صحیح لطف اس مرثیہ کو پڑھ کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ایک بند پیش ہے۔

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور　　دیکھے تو غش کرے ارنی گوے اوج طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور　　وہ جابجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھا وادیٔ مینو اساس سے　　جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

اس پورے مرثیے میں انیسؔ کی تخیّل اپنے پورے شباب پر ہے۔مناظر فطرت کے ایسے نادر نمونے کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتے۔انیسؔ نے مناظرِ فطرت کو پیش کرنے میں تشبیہ واستعارے سے اپنے کلام کو اتنا باوصف بنا دیا ہے کہ ایک بند پڑھ کر خود بخود دوسرا بند پڑھنے اور پھر پورا مرثیہ پڑھنے کے لیے دل بے قرار ہو جاتا ہے۔اکثر لوگوں نے انیسؔ کی منظر نگاری پر اعتراض بھی وارد کیا ہے کہ انیسؔ نے کربلا کے بے آب گیاہ صحرا میں چمنستان کا سماں پیش کیا ہے، جو حقیقت کے منافی ہے۔لیکن انیسؔ کی شاعرانہ فنکاری پر اس سے کسی طرح کا کوئی اثر نہیں پڑتا اس لیے کہ جہاں کہیں انیسؔ نے اس طرح کے مناظر پیش کئے ہیں تو آگے بڑھ کر انیسؔ نے اس کا سبب بھی تحریر کر دیا ہے۔متذکرہ بالا مرثیے میں باغ، پھول، درختوں کا جھومنا اس طرح کے مضامین نظم کرنے کے بعد یہ بند بھی نظم کرتے ہیں، جس سے مرثیہ اور ان مضامین میں ایک طرح کا ربط پیدا ہو جاتا ہے۔

اللہ رے خزاں کے دن اس باغ کی بہار　　پھولے سماتے تھے نہ محمد کے گلعذار
دولھا بنے ہوئے تھے اجل تھی گلوں کا ہار　　جاگے وہ ساری رات کے وہ نیند کا خمار
راہیں تمام جسم کی خوشبو سے بس گئیں　　جب مسکرائے پھولوں کی کلیاں بکس گئیں

اس بند میں خزاں کے دن کہہ کے انیسؔ نے پھول، خوشبو، باغ ان تمام چیزوں کا رشتہ امام حسین ان کے اعزّا و انصار اور چھوٹے چھوٹے بچوں سے جوڑ دیا ہے۔ڈاکٹر سلام سندیلوی انیسؔ کی منظر نگاری کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں کہ

"انیسؔ کی پس منظر کی شاعری کبھی مرثیے کی ابتدا میں ہوتی ہے اور کبھی مرثیہ کے درمیان میں مگر جہاں بھی انھوں نے منظر نگاری کی ہے اس کا مقصد اصل واقعات کے اثر کو اور زیادہ نمایاں کرنا ہے۔"۱۲؎

منظر نگاری کی اعلیٰ مثالوں سے انیس کا کلام بھرا ہوا ہے۔انیس کا یہ بند فقط شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ صادق الکلامی پر مبنی ہے۔

قلم فکر سے باندھوں جو کسی بزم کا رنگ　　شمعِ تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانیؔ ہو تو بہزاد ہو دنگ　　خون برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی　　بجلیاں تینوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

انیسؔ نے اپنے مراثی میں اتنے جاندار مکالمے نظم کیے ہیں کہ جنھوں نے انیسؔ کی کردار نگاری کو پابندی اور مجبوری کے باوجود نکھار

دیا۔انیسؔ نے جس کردار کی زبان سے جو مکالمے کہلائے ہیں وہ انھیں حالات و کیفیات کا حصہ لگتے ہیں۔مکالمہ نگاری میں انیسؔ نے حفظِ مراتب کا بہت خیال رکھا ہے۔اگر بچے بات کر رہے ہیں تو انھیں کی زبان، بچوں کی سی فکر اور انداز ہے۔کوئی جری اور دلیر جوان کچھ کہہ رہا ہے تو اس کے مکالمے اتنے ہی جوشیلے ہیں۔موقع و محل کے اعتبار سے ہر جملہ اپنی جگہ جامع ہے۔جناب حُر اور عمر سعد کے درمیان جو مکالمے ہوئے ہیں بے حد جاندار ہیں۔انیسؔ نے الفاظ و تراکیب کا استعمال، جملوں کی ساخت ایسے بے ساختہ انداز میں نظم کی ہے کہ ایسا لگتا ہے دو آدمی کسی مسئلہ پر بات کر رہے ہیں۔یہ گفتگو اگر تیز لہجے میں ہو رہی ہے تو الفاظ بھی ایسے استعمال ہوتے ہیں کہ جن میں اس لہجے کو سمو لینے کی پوری صلاحیت ہوتی ہے۔مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں کہ۔

"انیس نے نظم میں بعض مکالمے اور گفتگوئیں ایسی لکھ دی ہیں کہ ان کو پڑھتے وقت یہ بات خود بخود نظر انداز ہو جاتی ہے کہ وہ نظم میں ہیں۔"۱۳؎

عورتوں کی زبان سے بھی جو مکالمے انیسؔ نے نظم کیے ہیں ان میں بھی طرز کلام، لب ولہجہ، کیفیت اور موقع و محل کا پورا لحاظ برتا ہے۔مکالمہ نگاری میں اردو کا کوئی شاعر انیسؔ کا ہم سر نہیں ہے۔

میر انیسؔ کا کلام اتنے صفات کا حامل ہے جو کسی مختصر تبصرے میں واضح شکل میں نہیں بیان کیا جا سکتا حقیقت یہ ہے کہ انیسؔ کا کلام سننے اور پڑھنے کی چیز ہے، اس پر تبصرہ میں وہ مزہ نہیں جو خود کلام کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے۔اس لیے کہ کسی مختصر تبصرہ میں ساری مثالیں پیش نہیں کی جا سکتیں۔

انیسؔ کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے انیسؔ کو سمجھنے کے لیے واقعۂ کربلا سے مکمل واقفیت ضروری ہے۔اس کے سارے کرداروں کے حرکات و سکنات، عادات و اطوار اور القاب و خطابات سے باقاعدہ آشنائی ضروری ہے۔جو لوگ واقعہ کربلا اور اس کے کرداروں سے ناواقف رہے ان میں کسی نے انیسؔ کے مرثیوں کو ڈرامے سے تعبیر کیا۔کسی نے صرف رزمیہ کہا۔کسی نے مبالغے کا الزام لگایا کسی نے اس کے کرداروں کو ہندوستانی تہذیب کا نمونہ قرار دیا۔محمد حسن فاروقی نے سارا زور مدح سرائی پر صرف کیئے جانے کا الزام لگایا۔۱۴؎

حقیقتاً مرثیہ نہ فقط ڈرامہ ہے نہ صرف رزمیہ۔مرثیے میں ڈرامے اور رزمیہ کے عناصر کی شمولیت سے اسے صرف ڈرامہ یا صرف رزمیہ کا نام نہیں دیا جا سکتا۔بلکہ انیسؔ کے مرثیے بنیادی طور پر مرثیے ہی ہیں۔اس کے ثبوت میں ان کا یہ بند کافی ہے۔

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا　　یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامے عنوان ہے جدا　　مختصر کہہ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں تو صیف بھی ہو　　دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

جہاں تک مبالغہ آرائی اور مدح سرائی کی بات ہے تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شاعری تاریخ نہیں ہوتی۔شاعری ایک آرٹ ہے اس آرٹ میں تاریخی سچائیاں ڈھونڈھنے والوں کو شاعرانہ صداقتیں تلاش کرنی چاہئیں۔اور اگر مبالغہ آرائی اور مدح سرائی کا یہ الزام مرثیہ پر لگایا جا سکتا ہے تو دنیا کا کوئی بھی رزمی شاعر اس الزام سے بچ نہیں سکتا کیونکہ رزمیہ کا جوہر مبالغہ آمیز بیان کے بغیر کھل کر سامنے بھی نہیں آتا۔اور پھر انیسؔ

نے تو اپنے مرثیوں میں امام حسینؑ کی رفعت و بلندی، حضرت عباسؑ کا جوش وجلال، علی اکبرؑ کا حسن و جمال، ذوالفقار یا کسی اور شہید کی تلوار کی برش ذوالجناح یا کسی دوسرے اسپ باوفا کی پھرتی، عرب کی گرمی یا جنگل کی حولناکی کے بیان میں جو کچھ نظم کیا ہے وہ صرف مبالغہ ہی نہیں بلکہ حقائق سے بہت قریب ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ میر انیسؔ کے مبالغے ترسیل کا وہ وسیلہ ہیں جو عرب کے کرداروں کو ہندوستان کی زمین پر اتار دیتے ہیں اور عرب کے ماحول میں واقعہ کی طرف آسانی سے منتقل ہو جائیں۔

اس طرح رزم ہو یا بزم، صحرا ہو یا گلستاں ہر جگہ انیسؔ نے دنیائے ادب سے اپنا لوہا منوالیا۔ انیسؔ کے کلام کے دو حصے کیے جا سکتے ہیں ایک خارجی دوسرا معنوی، معنویت سے قطع نظر خارجی عناصر ہی میر انیسؔ کے کلام میں ایسے ہیں کہ کوئی دوسرا شاعر اس بلندی تک نہیں پہنچ سکا۔ صنایع و بدایع، رعایت لفظی، خوبصورت استعارات و نادر تشبیہات انیسؔ کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں۔ رعایتِ لفظی، صنایع و بدایع کا استعمال اس دور کی شاعری کا طرہ امتیاز تھا۔ بہت سے شعراء نے اسی کو مآلِ شاعری سمجھ لیا تھا اور زیادہ تر انہیں سب چیزوں کی بنیاد پر شاعری کر رہے تھے۔ انیسؔ کے یہاں بھی یہ سب چیزیں موجود ہیں لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیبؔ تحریر کرتے ہیں۔

"انیسؔ کی زبان جن محاسن کا گنجینہ ہے ان کو ہر سخن شناس محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی ایک خوبی ایسی ہے جو دوسری خوبیوں میں دب جاتی ہے۔ اور وہ ہے صنایع لفظی و معنوی کا استعمال۔ انھوں نے جتنی صنعتیں جس کثرت اور جس سلیقے سے استعمال کی ہیں اس کی نظیر کسی دوسرے شاعر کے یہاں ہیں ملتی۔"۱۵؎

انیسؔ نے جن صنعتوں کا استعمال کیا ہے اس سے کلام میں ایک طرح کا حسن پیدا ہو گیا ہے۔ جس کا سبب شگفتہ بیان، سلاست و روانی ہے۔ انیسؔ اس سبک روی سے صنعتوں کا استعمال کرتے ہیں کہ اگر اس پر غور نہ کیا جائے تو پتہ بھی نہ چلے۔ یہ انیسؔ کی قادرالکلامی ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں۔ انھیں اوصاف کے تحت انیسؔ خدائے سخن قرار دئے گئے۔

اردو کے صف اوّل کے شعراء میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ کے ساتھ میر انیسؔ سرفہرست ہیں اور بعض صفات انیسؔ کو ان سب میں ممتاز کرتی ہیں۔ اردو کے تقریباً سبھی شاعروں نے تعلیات سے کام لیا ہے اور اپنی سخندانی پر ناز کیا ہے لیکن وہ مبالغہ تک محدود ہیں۔ صف اوّل کے شعراء میں میرؔ نے کہا کہ۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا　　مستند ہے میرا فرمایا ہوا

لیکن اگر حقیقت میں دیکھا جائے کہ کیا میر کا فرمایا ہوا مستند ہے تو جواب ملے گا نہیں! اسی طرح غالب نے کہا کہ۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے　　مدعا عنقہ ہے اپنے عالم تقریر کا

تو کیا غالبؔ کے عالم تقریر کا مدعا عنقہ رہ گیا۔ سو سے زیادہ غالبؔ کے شارحین نے غالب کو ہر زاویہ سے سمجھا بھی اور سمجھایا بھی۔ اسی طرح اقبالؔ نے تعلّی میں کہا کہ

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے　　بحر ظلمات میں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

تو کیا اقبالؔ نے ادب وفکر کے تمام ظلمات میں فکر کے گھوڑے دوڑا لیے تو جواب ملے گا کہ نہیں! لیکن جب انیسؔ تعلیات کا استعمال اس

طرح کرتے ہیں کہ 'نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری' یا 'قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کردوں' یا 'قلم فکر سے باندھوں جو کسی بزم کا رنگ' یا 'رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی' یا 'بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی' یا 'صاف حیرت زدہ معنی ہو تو بہزاد ہو دنگ' یا 'خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ'۔

انیسؔ کا کلام ان تمام تعلیات کے دعوؤں کی دلیل بن جاتا ہے اور ان کا قاری اسکی حقیقت سے آشنا ہو کر قائل ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انیسؔ کا کلام پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔الفاظ کا انتخاب اور ان کی نشست و برخاست حیرت زدہ کر دیتی ہے اور انیسؔ کی شاعری الہامی شاعری محسوس ہوتی ہے۔میر انیسؔ کا کمال ہے کہ آج بھی انیسؔ ادب میں موضوع بحث بنے ہوئے ہیں اور افہام و تفہیم کا دور جاری ہے۔ابھی حال ہی میں علامہ عقیل الغروی صاحب کے انیسؔ پر دیے گئے ایک بیان پر بہت واویلا مچا ہے جس میں انھوں نے انیسؔ کے انتخاب الفاظ پر سوال اٹھا کر فصاحت پر سوالیہ نشان لگایا تھا۔جس میں لفظ رانڈ پر انھوں نے خصوصی زور دیا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ انیسؔ نے پہلے ہی اس کا سدّباب کر دیا تھا یہ کہہ کر۔

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے　　　　تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
سرما زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے　　　　زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گل رو کے لیے
داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد　　　　ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

لفظ رانڈ اچھا نہیں ہے اس کے بجائے بیوہ لفظ بہتر ہے لیکن انیسؔ نے جہاں لفظ رانڈ استعمال کیا ہے وہ وہاں بیوہ میں وہ لسانی حسن نہیں ہے۔اور اس دور میں بیوہ کے لیے لفظ رانڈ کا استعمال بخوبی کیا جاتا تھا۔بہرحال آج تک انیسؔ اور انیسؔ کی شاعری پر گفتگو اور مقالاتِ تحقیق و تنقید کے باب وا رہنا انیسؔ کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

حواشی:

ا۔: میر انیس کے حالات زندگی" مضمون مشمولہ" سرفراز" انیس نمبر فروری ۱۹۷۲ء لکھنؤ۔ ۲۔: انیس کی علمی استعداد" مضمون مشمولہ" سرفراز" انیس نمبر فروری ۱۹۷۲ء لکھنؤ۔ ۳۔: انیس کے مرثیوں کا سماجی تجزیہ" مضمون مشمولہ" سرفراز" انیس نمبر ۱۹۷۲ء لکھنؤ۔ ۴۔: انیس ایک مختصر تعارف" مضمون مشمولہ" آج کل" انیس نمبر جون ۱۹۷۵ء دہلی۔ ۵۔: موازنہ انیس و دبیر" شبلی نعمانی۔ ۶۔: میر انیس اور واقعہ نگاری" مضمون مشمولہ" سرفراز" انیس نمبر فروری ۱۹۷۲ء لکھنؤ۔ ۷۔: مقدمہ دیوان" خواجہ الطاف حسین حالی۔ ۸۔:" اردو شاعری پر ایک نظر" کلام الدین احمد۔ حصہ اول۔ ص ۱۴۳، اردو مرکز پٹنہ ۱۹۵۲ء۔ ۹۔: موازنہ انیس و دبیر۔ شبلی نعمانی۔ ۱۰۔: اردو شاعری پر ایک نظر از کلیم الدین احمد۔ ۱۱۔: میر انیس کے شاعری" مضمون مشولہ" سرفراز" لکھنؤ انیسؔ نمبر فروری ۱۹۷۲ء۔ ۱۲۔: مرثیوں کی منظر نگاری" مضمون مشمولہ" سرفراز" لکھنؤ انیس نمبر فروری ۱۹۷۲ء۔ ۱۳۔: انیس کے کلام صنعتوں کا استعمال" مضمون مشمولہ" آج کل" دہلی انیس نمبر جون ۱۹۷۵ء ص ۵۰۔ ۱۴۔: مرثیہ نگاری اور میر انیس" ڈاکٹر محمد حسین فاروقی۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۵ء۔ ۱۵۔: میر انیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال" مضمون مشمولہ" آج کل" دہلی۔ انیس نمبر جون ۱۹۷۵ء ص ۵۰۔

ہندوستانی تہذیب وثقافت اور مراثیٔ انیسؔ کے خواتین کردار

پروفیسر شبیب نجمی

میر انیسؔ کا شمار اردو زبان وادب کے عظیم شعراء میں ہوتا ہے۔ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے صنف مرثیہ کو وہ بلندی عطا کی کہ انیسؔ اور مرثیہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم بن گئے۔جس طرح سوداؔ قصیدہ گوئی میں، میرؔ غزل گوئی میں اور میر حسنؔ مثنوی نگاری میں بے مثل ہیں اسی طرح میر انیسؔ مرثیہ نگاری کے بادشاہ ہیں۔میر انیسؔ کا کمالِ فن یہ ہے کہ انہوں نے مرثیہ میں بہت سے نئے مضامین برت کر مرثیہ کے دامن کو وسعت عطا کی۔انیسؔ کے مرثیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی تہذیب وثقافت کو نمایاں کیا، جس کا اعتراف بیشتر نقادوں نے کیا ہے۔حالانکہ اردو مرثیہ کے تمام واقعات وکردار، عرب کی اسلامی تاریخ سے ماخوذ ہیں، ان میں ہندوستان کا کوئی پس منظر نہیں ہے۔انیسؔ نے ذکر تو واقعۂ کربلا کا کیا ہے لیکن پس منظر کے طور پر ہندوستانی تہذیب وثقافت کو پیش کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مرثیے کو جو مقبولیت ہندوستان میں حاصل ہوئی وہ کسی دیگر ملک میں حاصل نہ ہوسکی۔میر انیسؔ نے عرب کے کرداروں میں ہندوستانی رنگ کی آمیزش کر کے ہندوستان کے عام قاری کو اس واقعہ سے وابستہ کیا ہے۔صالحہ عابد حسین میر انیسؔ کے اس کمال کی طرف اس طرح اشارہ کرتی ہیں:

> ''انیسؔ نے خالص عرب کردار، خالص عربی آداب اور تہذیب اور رسم ورواج اور حفظ مراتب، عربی خاندانی زندگی کی تصویر کشی نہ کر کے حسینؑ اور خاندان حسینؑ کے افراد میں جو ہندوستانیت پیدا کی وہ ایک ارادی کوشش تھی۔اگرچہ مسلمانوں کے دل میں عرب حسینؑ وزینبؑ کے لیے اور زیادہ عقیدت واحترام پیدا ہوتا مگر ہندوستانیت یعنی اپنائیت پیدا کر کے ان کے دل میں جو گہری محبت اور لگاؤ ان عظیم ہستیوں سے پیدا کیا گیا وہ شاید نہ ہوسکتا۔'' (میر انیسؔ سے تعارف از صالحہ عابد حسین، ص۔ ۳۳)

اردو مرثیے میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کی عکاسی انیسؔ سے قبل بھی کی جاتی رہی ہے لیکن انیسؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اردو مرثیے کو خاص طور سے ہندوستان کے ثقافتی رنگ میں رنگ کر واقعات کربلا کی فطری اجنبیت کو اس طرح اپنائیت میں تبدیل کر دیا ہے کہ یہ واقعات سرزمین عرب سے متعلق ہوتے ہوئے بھی خالص ہندوستانی سرزمین کے معلوم ہونے لگے ہیں اور ان کربلائی مرثیوں میں ہندوستانی عوام کو اپنے ہی رنج وغم کا احساس ہوتا ہے۔انیس نے اپنے عہد کے ہندوستانی سماج کی عکاسی ایسے مؤثر اور فطری انداز میں کی ہے جس کے ذریعہ ہندوستانی آداب واخلاق، رسوم وروایات، عام ثقافتی اقدار اور عصری ماحول کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں سامنے آجاتی

ہیں، جس وجہ سے عام انسان کو واقعات کربلا سے ایک فطری لگاؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ مراثیِ انیسؔ کا بغور مطالعہ کرنے پر ایک اور بات سامنے آتی ہے کہ ہندوستانی رنگ مرد کرداروں کے مقابلے خواتین کرداروں پر زیادہ گہرا اور اثر دار محسوس ہوتا ہے۔ انیسؔ نے عورتوں کے کردار اس طرح تخلیق کیے ہیں کہ ان میں ہندوستانی تہذیب رچ بس گئی ہے، خواتین کرداروں کے لب ولہجہ، رسم ورواج، گلے شکوے، جذبات نگاری شرم ولحاظ، اپنائیت کا اظہار ہر احساس میں ہندوستانی تہذیب صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر زوجۂ حضرت عباسؑ، جناب کبریٰؑ، بی بی شہر بانوؑ، بی بی ربابؑ اور جناب زینبؑ، فاطمہ صغریٰؑ کے جذبات کی عکاسی خالص ہندوستانی انداز میں کرتے ہیں۔ زوجۂ عباسؑ میں جو ہندوستانی تہذیب کی جھلک ہے وہ بڑی فطری ہے۔ دیکھیں یہ بند:

یہ سن کے آئی زوجۂ عباسِؑ نامور　　شوہر کی سمت پہلے کنکھیوں سے کی نظر
لیں سبطِؑ مصطفیٰؐ کی بلائیں بچشم تر　　زینبؑ کے گرد پھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر
فیض آپ کا ہے اور تصدق امامؑ کا　　عزّت بڑھی کنیز کی اور رتبہ غلام کا

باتیں یہ سن کے روتی ہیں زینبؑ جھکائے سر　　تھرا رہی ہے زوجۂ عباسِؑ نام ور
چہرہ تو فق ہے، گود میں ہے چاند سا پسر　　مانع ہے، شرم روتی ہے منھ پھیر پھیر کر
موقع نہ روکنے کا ہے، نہ بول سکتی ہے　　حضرت کے منھ کو نرگسی آنکھوں سے تکتی ہے

اپنے بزرگوں کی موجودگی میں شوہر کو کنکھیوں سے دیکھنا، دور سے ہی نم آنکھوں سے بلائیں لینا، شوہر یعنی حضرت عباسؑ کو امامؑ کا غلام اور خود کو کنیز کہنا، بزرگوں کی پاسداری میں اپنے جذبات کو دبائے رہنا، شرم وحیا یہ سب ایک مخصوص سماجی نظام کی عکاسی کرتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی فنکاری برتنے میں میر انیسؔ کو اپنے تخیل کی پرواز کو بہت بلند کرنا پڑا ہوگا جب ہی تو اس میں وہ رنگ آیا کہ اسے ہم اپنی سرزمین سے جوڑ کر دیکھنے لگے، اس پر گریہ کرنے لگے اور ہم نے اسے حق وباطل کے طور پر تسلیم کیا۔

امام حسینؑ کے فرزند حضرت علی اکبرؑ تاریخ کربلا کا ایسا کردار ہیں جن سے ہر ایک کو بہت زیادہ قربت تھی اور روایت میں ملتا ہے کہ ایک تو وہ بہت ہی خوبصورت تھے اور اس کے علاوہ ان کی شکل امام حسینؑ کے نانا رسول اللہؐ سے ملتی تھی اور اسی لیے ان کو ہم شکلِ پیمبر بھی کہا جاتا تھا لیکن کربلا کے دیگر کرداروں کی طرح ان کا دل بھی شوق شہادت سے معمور تھا اور ان کے دل میں امنگ تھی کہ وہ سب سے پہلے جامِ شہادت نوش فرمائیں۔ میر انیسؔ حضرت علی اکبرؑ کے شوق شہادت کے جذبہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

انصاف اب کیجئے یا سرورِ عرب　　بیٹا تو گھر میں بیٹھے، لڑے باپ تشنہ لب!
مارا گیا نہ آج، توکل یہ کہیں گے سب　　کیسا لہو سفید ہے دنیا، ہے غضب
سر کو کٹا کے باپ جہاں سے گزر گیا　　بیٹا جوان باپ کے آگے نہ مر گیا

بہرِ رسولؐ رن کی رضا دیجیے مجھے　　صدقہ علیؑ کا اذنِ وغا دیجیے مجھے

مرتا ہوں یا امامؑ ، جِلا دیجیے مجھے　　یادِ خدا میں دل سے بھلا دیجیے مجھے
کھولیں کمر حضور تو دل کو قرار ہو　　کہہ دیجئے کہ جا علی اکبرؑ نثار ہو

مذکورہ بالا بندوں میں جہاں میر انیسؔ نے حضرت علی اکبرؑ کے شوقِ شہادت اور جذبۂ قربانی کو فنی حسن کے ساتھ پیش کیا ہے، وہیں خون سفید ہونا جیسے محاورے کے استعمال سے خالص ہندوستانی فضا پیدا کی ہے اور سامعین کے لیے مانوس ماحول بنایا ہے۔ حضرت علی اکبرؑ کی ماں تو ام لیلیٰؑ تھیں لیکن ان کی پرورش ان کی پھوپھی جناب زینبؑ نے کی تھی کیونکہ حضرت علی اکبرؑ امام حسینؑ کے نانا کی شبیہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی اکبرؑ امام حسینؑ سے میدان میں جانے کی اجازت مانگتے ہیں تو امامؑ کہتے ہیں کہ تم اپنی پھوپھی سے اجازت طلب کرو۔ میر انیسؔ پورے واقعہ کو مانوس فضا میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

زندوں میں ہوتی گر تو یہ کہتی کہ مرنے جائیں　　اس پیاس میں شہید ہوں فاقوں میں زخم کھائیں
اٹھارہواں برس ہے ، دلھن تو مجھے دکھائیں　　پالا ہے منتوں سے مرادیں مری بر آئیں
مرتی ہوں اشتیاق میں ، سہرا تو دیکھ لوں　　سہرے کے نیچے چاند سا چہرا تو دیکھ لوں

سچ ہے کہ اس کی چاہ سے نسبت مجھے کہاں　　ہوں لاکھ ان کی چاہنے والی ، وہ پھر ہے ماں
آنکھوں کا نور قلب کی طاقت ، بدن کی جاں　　آنچ اُتما کی ہے وہ قیامت کہ الاماں
کیا سوچتے ہو صاحبو ، کچھ تم کو خیر ہے　　ماں ہے تو ماں ہے خلق میں ، پھر غیر غیر ہے

ایک عرب کی خاتون سے اس طرح کے جملہ ادا کرانا انیسؔ کا ہی خاصہ ہے، یہ بند ہندوستانی سماج کی فضا بندی کے آئینہ دار ہیں۔ ''آنچ آتما کی ہے'' اس طرح کے جملے ایک ہندوستانی خاتون کے منھ سے ہی نکل سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور بند ملاحظہ ہو، جس میں میر انیسؔ گل پہ بلبل کے فدا ہونے کی بات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں:

ماں کی نہ کم توجہی اور یہ کسی کا پیار　　غصہ ہو یا کہ سخت کہے ،دل میں ہے نثار
بلبل فدا ہے گل پہ ، شکایت کرے ہزار　　دنیا میں عاشقوں کے دلوں کو کہاں قرار
دیں ماں کا ساتھ ، نام خدا اب جوان ہیں　　میرا ہے جب یہ حال ، پھر اس کی تو جان ہیں

میر انیسؔ نے جنابِ زینبؑ کی زبان سے جو یہ مکالمات ادا کرائے ہیں یہ بھی ایک ہندوستانی عورت کے جذبات ہیں۔ جو ہندوستان کے سامعین کے لیے مؤثر ثابت ہوتے ہیں اور غم کی فضا اور بہتر طریقہ سے تیار ہوتی ہے کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی مانوس فضا کا اثر زیادہ لیتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ جب کوئی بڑا غم پڑتا ہے تو خواتین کو دیکھا گیا ہے کہ وہ فرطِ غم میں اپنے سر کے بال کھول لیتی ہیں۔ میر انیسؔ نے کربلا کی خواتین کے غم کا ذکر کرتے ہوئے اکثر کھلے ہوئے سر کے بالوں کا ذکر کیا ہے جو خالص ہندوستانی سرزمین کی جھلک ہے، اس سلسلے میں مثال کے طور پر چند بند رقم کیے جا رہے ہیں:

زینبؑ بلک رہی تھی ، پریشاں تھے سر کے بال　　نعلین کا نہ ہوش ، نہ چادر کا تھا خیال
سینہ کبود ، چاک گریباں ، شکستہ حال　　کہتی تھی مجھ پر رحم کر ، اے فاطمہؑ کے لال
پوچھے گا کون ، ساتھ چھٹے گا جو آپ کا　　نے ماں کا آسرا ہے مجھے ، اب نہ باپ کا

نکلا یہ سب کے منھ سے کہ ہے ہے حسنؑ کے لال　　زینبؑ نے اُٹھ کے کھول دیئے اپنے سر کے بال
سینے میں ہل گیا دلِ بانوئے خوش خصال　　چلائی ماں ، گزر گیا کیا میرا نونہال
عابدؑ کا تپ میں گرم بدن سرد ہوگیا　　قاسمؑ کے چھوٹے بھائی کا بدن سرد ہوگیا

اسی طرح کئی مرثیوں میں میرانیسؔ نے بال کھول کر کربلا کی خواتین کے گریہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔حالانکہ کربلا کی خواتین کے بارے میں بال کھول کر گریہ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔انیسؔ نے مرثیے کو مؤثر بنانے اور ہندوستان کی سرزمین پر مرثیہ کو پیش کرنے کے لیے ہی ایسا کیا ہے۔

میدانِ کربلا میں حق و باطل کی جنگ آخری مرحلے میں ہے۔امام حسینؑ کے اعزّا و اقارب سب جام شہادت نوش فرما چکے ہیں اب امام حسینؑ رخصت آخر کو بیبیوں کے خیمے میں تشریف لائے ہیں،بہن زینبؑ دیکھتی ہیں اب بھائی کے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں۔انیسؔ جنابِ زینبؑ کے جذبات کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

خیمے میں جا کے شہؑ نے یہ دیکھا حرم کا حال　　چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینبؑ کی یہ دعا ہے کہ اے ربِّ ذوالجلال　　بچ جائے اس فساد سے خیرالنساءؑ کا لال
بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے　　صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

اس بند میں واضح طور پر ہندوستانی خواتین کے احساسات وجذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔صندل سے مانگ بھرنا ہندوستانی خواتین کا طریقہ ہے۔زرعی ملک ہندوستان میں کھیتی ہری رہنے کی جو دعا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔میرانیسؔ ہندوستان کی سرزمین کے پروردہ تھے اور ہندوستان کے خاص طور پر اودھ کے طور طریقوں سے اچھی طرح واقف تھے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی تہذیب وثقافت کو مرثیہ میں پیش کیا۔ہندوستانی طرز فکر کے بجائے عرب خواتین کے طور طریقوں کو یہاں بیان کیا جاتا تو مرثیہ کی فضا ہندوستانی قاری کے جذبات کو اس طرح متاثر نہیں کرتی۔امام حسینؑ کے جوان بیٹے حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے یہ بند ملاحظہ ہوں۔

ڈیوڑھی پہ لائے لاش پسر کی جو شاہِ دیں　　باہر نکل کے بیبیاں سر پیٹنے لگیں
زینبؑ کو یوں پکارا وہ زہراؑ کا نازنیں　　دوڑو بہن کہ قتل ہوا اکبرؑ حزیں
دولھا بنے ہیں خون کی مہندی لگائے ہیں　　سہرا تمہیں دکھانے کو مقتل سے آئے ہیں

ہے ہے نہ تیرا بیاہ رچانا ہوا نصیب　　ہے ہے دلھن نہ بیاہ کے لانا ہوا نصیب

پوتے کو گود میں نہ کھلانا ہوا نصیب　　شادی کے بدلے خاک اڑانا ہوا نصیب
ندی لہو کی چاند سی چھاتی سے بہہ گئی　　بہنوں کو نیگ لینے کی حسرت ہی رہ گئی

نیگ لینے کی رسم بھی خالص ہندوستانی تہذیب کا حصہ ہے،اور جس طرح ایک جوان کی لاش پر خواتین کے بین رقم کیے ہیں یہ بھی ہندوستانی لب ولہجہ ہے۔انیسؔ نے مرثیہ کو پراثر بنانے،تصویر کو واضح کرنے اور جذبات کی دنیا میں بے چینی پیدا کرنے کے لیے ان رسومات اور لب ولہجہ کو سمویا ہے۔وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ انسان اپنی مانوس فضا کو پسند کرتا ہے اسی لیے انھوں نے ہندوستانی پس منظر میں واقعہ کربلا کو نظم کیا۔ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں پیدائش سے لے کر موت تک بہت سی رسمیں رائج ہیں اور یہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا اٹوٹ حصہ بھی ہیں۔حضرت قاسمؑ کی شادی کے موقع پر رسومات کا ذکر مرثیوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔نیگ،لگن،کنگنا،سہرا، منڈپ،مہندی،گھونگھٹ،رنڈ سالہ اور سفید چادر وغیرہ۔یہ اشعار دیکھیے:

بہنیں کدھر ہیں ڈالنے آنچل بنے پہ آئیں　　اب دیر کیا ہے حجرے سے باہر دلھن کو لائیں
رخصت ہوں جلد تاکہ براتی بھی چین پائیں　　جاگے ہیں ساری رات کے اپنے گھروں کو جائیں
دل پر سہے فراق کی شمشیر تیز کو　　ماں سے کہو دلھن کی نکالے جہیز کو

بھائی کے سر پر بہنوں کا آنچل ڈالنا،نیگ لینا،دہلی گھیرنا اور رنڈاپے کا جوڑا یہ سب ہندوستانی رسمیں ہیں جس کو انیسؔ نے مرثیہ کے قالب میں ڈھال کر مرثیہ کو پرسوز بنا دیا ہے۔میر انیسؔ کے مرثیوں کا مطالعہ کرنے پر واضح ہوتا ہے کہ میر انیسؔ ہندوستانی عورت کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہیں اور اس بات کا بھی اچھی طرح اندازہ ہے کہ خوشی اور غم کے موقع پر جو رسومات ہمارے سماج میں رائج ہیں،وہ سب خواتین کی ہی دین ہیں،مردوں کو تو اس کا دور دور تک علم نہیں ہوتا۔کچھ خواتین تو رسومات کو اس طرح رائج کر دیتی ہیں کہ یہ رسمیں تقریبات کے وقت نسل در نسل چلتی رہتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں پر بھی رسومات کا ذکر آیا ہے،میر انیس نے عورتوں کے برتاؤ کے ذریعہ ہی ہندوستانی رسومات کو پیش کیا ہے۔میر انیسؔ کے مرثیوں میں امام حسنؑ کے فرزند حضرت قاسمؑ کی شہادت کا تذکرہ دردناک انداز میں ملتا ہے اور اکثر و بیشتر مراثی کو مؤثر بنانے کے لئے حضرت قاسمؑ کی شادی کا ذکر کیا جاتا ہے،شادی کا ذکر کرتے ہوئے ان ہی رسومات کا ذکر کیا جاتا ہے جو ہندوستان میں رائج ہیں۔جو چیزیں ہندوستانی دلھن کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں،انیسؔ نے ان چیزوں کا ذکر ہی کیا ہے اور جب کسی خاتون کا سہاگ اجڑتا ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے اس کو میر انیسؔ نے مؤثر طریقہ سے بیان کیا ہے۔حضرت قاسمؑ کی لاش جب خیمے میں آتی ہے تو ان کی دلھن جنابِ کبریٰؑ کی کیا حالت ہوتی اس منظر کو انیسؔ نے اس طرح بیان کیا ہے:

ناگاہ لاش صحن تک آئی لہو میں تر　　پیٹے جو سب ، عروس کو بھی ہو گئی خبر
تھا سامنا کہ لاش پہ بھی جا پڑی نظر　　گھبرا کے تب سکینہؑ سے بولی وہ نوحہ گر
دولھا کی لاش آتی ہے سہرے کو توڑ دو　　مسند الٹ دو حجرے کے پردے کو چھوڑ دو

یہ کہہ کے نوچنے لگی سہرا وہ سوگوار　　افشاں چھڑا کے خاک ملی منھ پہ چند بار
کہنے لگی لپٹ کے سکینہؑ جگر فگار　　ہے ہے بہن بڑھاؤ نہ سہرے کو میں نثار
وہ کہتی تھی کہ جاگ کے تقدیر سو گئی　　بی بی ! نہ پکڑو ہاتھ کہ میں رانڈ ہوگئی

اس بند میں، جو ایک شب کے دولھا کی دردناک موت کا واقعہ اور دلھن کی غم کی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ سامعین کے دلوں پر سیدھا اثر کرتی ہے کیونکہ یہاں پر ہندوستانی طرز کو اپنایا ہے اور افشاں چھڑا کر منھ پر خاک کا منظر پیش کیا ہے۔ یہ ہندوستان کے ہی ایک طبقہ کی رسم ہے، جس کو انیسؔ نے چابکدستی سے واقعۂ کربلا کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ اسی طرح اسی مرثیے میں سفید چادر اوڑھانے کی بات کی ہے جو آج بھی ہندوستان میں ایک بیوہ عورت کو اوڑھائی جاتی ہے:

حضرت یہ کہہ کے ہٹ گئے باچشمِ اشک بار　　پیٹی یہ سر کہ غش ہوئی بانوئےؑ دل فگار
چادر سپید اڑھا کے دلھن کو بحالِ زار　　گودی میں لائی زینبِؑ غمگین و سوگوار
چلّائی ماں یہ گر کے تن پاش پاش پر　　قاسمؑ بنے اٹھو دلھن آئی ہے لاش پر

جناب صغریٰؑ امام حسینؑ کی بیٹی تھیں اور جب قافلہ مدینے سے روانہ ہوا تھا تو جناب صغریٰؑ اپنی بیماری کی وجہ سے ساتھ میں نہیں آئی تھیں۔ اس واقعہ کو میر انیسؔ نے بہت سے مرثیوں میں بیان کیا ہے۔ رخصت کے وقت جو باتیں جناب صغریٰؑ کی زبان سے ادا کی گئی ہیں، ان کا گہرا تعلق بھی ہندوستانی ثقافت سے ہے۔ ایک بہن کی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے سر پر سہرا دیکھے۔ بھائی کے جانے کی خبر سن کر صغریٰ حضرت علی اکبرؑ سے منت کرتی ہیں۔ میر انیسؔ جناب صغریٰؑ کے جذبات کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں:

رخساروں پہ سبزے کے نکلنے کے میں صدقے　　تلوار لیے شان سے چلنے کے میں صدقے
افسوس سے ان ہاتھوں کو ملنے کے میں صدقے　　کیوں روتے ہو، اشک آنکھوں سے ڈھلنے کے میں صدقے
جلد آن کے بھینا کی خبر لیجو بھائی　　بے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجو بھائی

لکھنا مجھے ، نسبت کا اگر ہو کہیں ساماں　　حق دار ہوں میں نیگ کی میرا بھی رہے دھیاں
اور مرگئی پیچھے تو رہے دل میں سب ارماں　　لے آنا دلھن کو مری تربت پہ میں قرباں
خوشنود مری روح کو کر دیجیو بھائی　　حق نیگ کا تم قبر پہ دھر دیجیو بھائی

یہاں پر میر انیسؔ نے ایک بہن کے نیگ لینے کی بات کر کے خالص ہندوستانی رسم کو بیان کیا ہے اور مرثیے کو پوری معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے، جس طرح نیگ لینے کی ہندوستانی رسم ہے اسی طرح کنگنا کھیلنے کی رسم ہندوستان میں آج بھی رائج ہے۔ میر انیسؔ نے اس رسم کو واقعۂ کربلا کے پس منظر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

دم بدم ساس بھی سر پیٹتی ہے ساتھ اس کے　　ابھی کنگنا نہ کھلا تھا کہ بندھے ہاتھ اس کے

اسی طرح ''کلیاتِ انیسؔ'' کے پہلے مرثیہ ''یارب! چمنِ نظم کو گلزار ارم کر'' میں بہت سی ہندوستانی رسومات کا تذکرہ ملتا ہے، اس مرثیے میں انیسؔ نے امامِ حسینؑ کی ولادت سے لے کر شہادت تک کا ذکر کیا ہے۔ امام حسینؑ کی ولادت کے وقت کس طرح سب خوشیاں منا رہے ہیں کہ جبرئیلؑ امین نازل ہوتے ہیں اور امام حسینؑ پر پڑنے والے مصائب کی خبر رسولؐ خدا کو دیتے ہیں۔ جب امام حسینؑ پر پڑنے والے مصائب کے بارے میں بی بی فاطمہؑ زہرا سنتی ہیں تو ان کا غم سے برا حال ہوجاتا ہے۔ میر انیسؔ نے ایک ماں کی کیفیت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ سننے اور پڑنے والے کے دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔

بیٹی کو یہ معلوم نہ تھا یا شہِ عالم　　بچھے گی زچہ خانے کے اندر صفِ ماتم
اب دن ہے چھٹی کا مجھے عاشورِ محرم　　تارے بھی نہ دیکھے تھے کہ ٹوٹا فلکِ غم
پوشاک نہ بدلوں گی نہ سر دھوؤں گی بابا　　چلّے میں بھی چہلم کی طرح روؤں گی بابا

اس بند میں جہاں انیسؔ نے بی بی فاطمہؑ کے غم کا بیان کر کے مرثیے کو پرسوز بنایا ہے وہیں چھٹی، چلّے اور تاروں کا دیکھنا جیسے الفاظ برت کر اس کو ہندوستانی رنگ دیا ہے جس سے سرزمین ہندوستان کے سامعین کے لیے یہ مرثیہ اور مؤثر ہوجاتا ہے۔ اپنے موضوع کو مزید واضح کرنے کے لئے مراثی انیسؔ سے چند مصرعے مثال کے طور پر درج کیے جا رہے ہیں جس میں ہندوستانی رسم و رواج کو بیان کیا گیا ہے:

؎ اب سالی کس کے ہاتھ میں مہندی لگائے گی
؎ شاہد رہیں سب دودھ بھی بخشا نہیں میں نے

مہندی تمھارا لال ملے ہاتھ پاؤں　　میں　　لاؤ دلھن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

کنگنا بندھا تھا ہاتھ میں اس خوش صفات کے　　سہرے سے یہ عیاں تھا کہ دولھا ہیں رات کے

بہنوں کے نیگ لینے کی حسرت، صندل سے مانگ اور بچوں سے گودی بھری رہنے کی دعا، دلھن کے ہاتھوں کی مہندی، دودھ بخشنا خالص ہندوستانی رسمیں ہیں جس کو میر انیسؔ نے بڑی مہارت سے مرثیہ میں پیش کیا ہے۔ یہ انیسؔ کا کمال فن ہی تو ہے کہ انھوں نے مرثیے میں ہندوستانی فضا کو اس طرح سمویا ہے کہ چودہ سو سال قبل کا واقعہ موجودہ دور کی داستان لگتا ہے اور اس کی فضا ہمارے سماج کی فضا معلوم ہوتی ہے، جس سے قاری یا سامع اس واقعہ سے خود کو وابستہ محسوس کرنے لگتا ہے اور عرب کا پس منظر ہندوستانی سماج و معاشرت اور تہذیب میں ڈھل جاتا ہے اور پھر اپنے ایک منفرد رنگ میں نمایاں ہوتا ہے۔ میر انیسؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے جہاں مرثیہ میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو خوبصورتی سے پرویا ہے اور ہندوستانی رسومات کا ذکر کرتے ہوئے خواتین کے جذبات کی فنی حسن کے ساتھ ترجمانی کی ہے، وہیں انہوں نے خواتین کربلا کے عزم و حوصلہ اور قربانی کے جذبہ کو خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ عورت جس کو کمزور دل کا کہا جاتا ہے، وہیں انیسؔ نے عورت کے ہمت و حوصلہ کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے اور ایک ایک عورت کی نفسیات کو مرثیہ کے قالب میں ڈھالا ہے۔ مراثی انیسؔ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خاتون کے لیے میر انیسؔ کے دل میں جو جذبہ ہے وہ بہت اعلیٰ ہے۔ اس بارے میں صالحہ عابد حسین کا

کہنا ہے:

''میر انیسؔ کے کلام سے جس میں سینکڑوں مرثیے اور لاکھوں اشعار ہیں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں عورت کا درجہ بہت بلند ہے۔ عام طور پر وہ عورت کو محبت کی دیوی، حیا کی کان، ایمان کی جان، شرافت و نیکی کی تصویر، قربانی و ایثار کی مورتی سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انہیں عورت میں بے خوفی، جرأت، ہمت، عزم و حوصلہ اور استقلال اور بہادری کے جوہر بھی نظر آتے ہیں۔ جو اصول وحق کے لیے بڑے سے بڑے پہاڑ سے ٹکر لے سکتی ہے۔ جان اور جان سے زیادہ عزیز شے قربان کر سکتی ہے۔ اور ان کا یہ عقیدہ صرف خاندان نبوت کی عورتوں اور اہلِ بیتؑ امام حسینؑ تک محدود نہیں بلکہ وہ عام عورتوں یہاں تک کہ امام حسینؑ کے دشمنوں کی عورتوں میں بھی عالی ظرفی اور ایمان و شرافت کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ کہ انیسؔ کے لکھے ہزاروں صفحات کھنگال ڈالیے مگر کہیں آپ کو ظالم نفس پرست، بدعقیدہ، حرص وحوس کی غلام عورت نظر نہیں آئے گی۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ انیسؔ کی ماں بیوی اور خاندان کی دوسری عورتیں بلند کردار اور مضبوط شخصیت کی مالک ہوں گی۔ (خواتینِ کربلا کلام انیسؔ کے آئینے میں از صالحہ عابد حسین، ص۔ ۵، ۶)

اگر واقعۂ کربلا کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں سب سے اہم اور مرکزی کردار جناب زینبؑ کا نظر آتا ہے اور انیسؔ کا کمالِ فن یہ ہے کہ انہوں نے جناب زینبؑ کے کردار کے مختلف پہلوؤں کو مرثیوں میں پیش کیا ہے۔ جناب زینبؑ ہمت و حوصلہ، شجاعت اور حق گوئی کا مظہر ہیں۔ ایک خاتون کو جہاں سارے رشتہ عزیز ہوتے ہیں، وہیں جب وہ ماں بنتی ہے تو اس کو سب سے زیادہ اپنی اولاد سے محبت ہونے لگتی ہے کیونکہ اولاد عورت کے وجود کا حصہ ہوتی ہے اور وہ اپنی اولاد کی ہر طرح سے حفاظت کرتی ہے اس کے پروان چڑھنے کی دعائیں کرتی ہے، ماں اپنی اولاد پر اپنی ہر خوشی قربان کر دیتی ہے یہاں تک کہ وقت پڑنے پر اپنی جان بھی قربان کر دیتی ہے۔ لیکن یہ کربلا کی مائیں ہیں جو حق کے لیے راہ خدا میں نہ صرف اپنے بیٹوں کو بھی قربان کر دیتی ہیں بلکہ ان کو میدان جنگ میں جانے کے لئے پورے عزم کے ساتھ تیار کرتی ہیں:

صدقے گئی سن لو یہ میں کہتی ہوں جتا کر　　تم پہلے فدا کیجیو سر شہؑ کے قدم پر
میدان میں زخمی ہوئے گر قاسمؑ و اکبرؑ　　پھر تم مرے فرزند نہ میں دونوں کی مادر
جب دل ہوا ناراض تو فرزند کہاں کے　　کس کام کا وہ لعل جو کام آئے نہ ماں کے

اعدا کو مرے دودھ کی تاثیر دکھا دو　　اجلالِ حسنؑ شوکتِ شبیرؑ دکھا دو

جعفرؑ کی طرح جوہرِ شمشیر دکھا دو　　تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھا دو
خورشیدِ امامت میں قرابت میں قریں ہو　　تم شیر ہو شیروں کے حسینوں کے حسیں ہو

جعفرؑ سے نمودار کے دلبر ہو دلیرو　　حیدرؑ سے دلاور کے ، دلاور ہو دلیرو
جرار ہو ، کرار ہو ، صفدر ہو دلیرو　　ضرغام ہو ، ضیغم ہو ، غضنفر ہو دلیرو
تیروں سے جوانوں کے جگر توڑ کے آؤ　　خیبر کی طرح کوفے کا در توڑ کے آؤ

یہاں پر قابل غور بات یہ ہے کہ جناب زینبؑ ایک ماں ہوتے ہوئے اپنے بچوں کا حوصلہ بڑھا رہی ہیں اور ان کو جنگ کے لیے آمادہ کر رہی ہیں ساتھ ہی یہ بھی درس دے رہی ہیں کہ قاسمؑ و اکبرؑ سے پہلے تم اپنی قربانی پیش کرنا نہیں تو یہ ماں تم سے ناراض ہو جائے گی۔

جنابِ زینبؑ تاریخ کربلا کی ایسی عظیم خاتون ہیں جو تمام مصائب سہنے کے باوجود مقصد حسینؑ سے پیچھے نہیں ہٹتیں اور اگر یہ کہا جائے کہ آج کربلا زندہ ہے تو اس میں جناب زینبؑ کا اہم کردار ہے، تو غلط نہ ہوگا۔ دربارِ یزید میں انھوں نے علیؑ کے لہجے میں خطبہ دے کر عزم و حوصلہ کا ثبوت دیا۔ جب قافلہ دربارِ یزید میں پہنچا تو یزید نے خاندانِ زہراؑ کے بارے میں گستاخی کی۔ اپنے آباؤ اجداد کے جھوٹے قصیدے پڑھنے لگا اور سرِ حسینؑ سے بھی شرارت کی۔ یہ دیکھ کر زینبؑ کو جلال آ گیا اور انھوں نے دشمنوں کو بے باکی سے للکارا۔ انیسؔ جنابِ زینبؑ کے ہمت و حوصلہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

سن کے یہ آ گیا بنتِ شہِؑ مرداں کو جلال　　تھر تھرا کر کہا ، کیا بکتا ہے او بد اقبال
صاحبِ عزت و توقیر محمدؐ کی ہے آلؑ　　کبھی ہم لوگوں کی عزت پہ نہ آئے گا زوال
ہم کو بے قدر جو سمجھا تو خطا کرتا ہے　　دیکھ مصحف میں خدا کس کی ثنا کرتا ہے

آلِ احمدؐ کو حقارت سے نہ دیکھ او مقہور!　　سب پہ روشن ہے کہ ہم لوگ ہیں اللہ کا نور
مار کر سبطِؑ پیمبرؐ کو یہ نخوت ، یہ غرور　　خیر! ہم دور ، نہ تو دور ، نہ محشر ہے دور
حق کا دریائے غضب جوش میں جب آئے گا　　باندھنا ہاتھ کا سادات کے کھل جائے گا

کہہ کے یہ ، غیظ میں آئی جو علیؑ کی جائی　　آسماں آ گئے جنبش میں ، زمیں تھرائی
سر شبیرؑ سے ناگاہ صدا یہ آئی　　تھام لے غیظ کو زینبؑ ، ترے صدقے بھائی
نہ تلاطم میں کہیں قہرِ الٰہی آجائے　　کہیں اُمت کی نہ کشتی پر تباہی آجائے

میر انیسؔ کے مراثی میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جس میں جنابِ زینبؑ نے باطل کے سامنے کہیں پر بھی سر نہیں جھکایا ہے اور تمام مصائب کے باوجود حق کے راستے سے ان کے قدم کہیں بھی نہیں ڈگمگائے ہیں بلکہ اپنے ہمت و حوصلہ کا مظاہرہ کر کے دشمنوں کو للکارنے کا

کام کیا ہے۔

تاریخ کربلا کی خواتین نے چاہے وہ ماں ہو، زوجہ ہو، بہن ہو یا بیٹی ہو ہمت وحوصلہ سے کام لیا ہے ان کے سامنے رشتوں کی محبت سے زیادہ مشن حسینؑ ہے اور انہوں نے اپنے بیٹوں کو راہ خدا کے لئے ہی تیار کیا ہے یہی وجہ ہے کہ جب صبحِ عاشور نمودار ہوتی ہے اور جنگ کا آغاز ہوتا ہے، تو ہر ماں چاہتی ہے کہ میرا لعل پہلے قربان ہو۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیں، جس میں جہاں انیسؔ نے ایک ماں کے سچے جذبات کی ترجمانی کی ہے کہ جب بیٹا جوان ہوتا ہے تو اس کے پروان چڑھانے اور دلھن گھر میں لانے کے ارمان پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ کربلا کی مائیں ہیں جنھیں اس بات کا خیال ہے کہ یہ قربانی کے لیے پیدا ہوئے ہیں:

بھیگیں جو مسیں ماں نے کیا سجدۂ باری　　یعنی مرے گلشن میں چلی بادِ بہاری
سبزہ ہوا آغاز تو فرمایا کہ واری　　صد شکر کہ سرسبز ہوئی کشت ہماری
شادی تھی کہ اب گھر میں دلھن لانے کے دن ہیں　　اس کی نہ خبر تھی کہ خزاں آنے کے دن ہیں

تاریخ کربلا میں مادرِ جنابِ قاسمؑ کا کردار بھی بہت اہم ہے اور میر انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اُمِّ فرویٰؑ کے جذبۂ قربانی کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اُمِّ فرویٰؑ امامِ حسنؑ کی زوجہ حضرت قاسمؑ کی ماں ہیں۔ روزِ عاشور جب جنگ کا آغاز ہوتا ہے اور امام حسینؑ کی جانب سے اصحاب وانصار کی قربانیاں پیش ہونے لگتی ہیں، تو مادرِ قاسمؑ کی بس یہی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا سب سے پہلے قربانی پیش کرے لیکن امامِ حسینؑ جنگ کی اجازت نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ قاسمؑ تم میرے بھائی کی نشانی ہو اور ابھی کمسن ہو۔ میر انیسؔ مادرِ قاسمؑ کے جذبۂ ایثار کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

مادر نے دی صدا شہؑ والا نہ روکیے　　ہاتھوں کو جوڑتی ہوں میں ، مولا نہ روکیے
میداں سے بڑھتے آتے ہیں اعدا نہ روکیے　　مرنے کی ہے انھیں بھی تمنا نہ روکیے
سینہ میں بے قرار دلِ ناصبور ہے　　صدقے گئی ، غلام کی خاطر ضرور ہے

یہاں پر میر انیسؔ نے ایک ماں کے جذبہ کو پوری فن کاری سے پیش کیا ہے۔ اسی مرثیے کے ایک اور بند میں ایک ماں کی خواہش کو اس طرح بیان کیا ہے:

کہتیں تھیں شب کو مجھ سے یہ اماں بچشمِ تر　　قربان جاؤں آج قیامت کی ہے سحر
عمو پہ دیکھنا جو ہجومِ سپاہِ شر　　لانا دلھن کا دھیان نہ مطلق مرے پسر
حسرت یہی ہے اور ہے یہ آرزو مری　　تم مرکے آئیو کہ رہے آبرو مری

جنابِ قاسمؑ چچا کے پاس اذن کے لیے جاتے ہیں لیکن امام حسینؑ کو خیال ہے کہ قاسمؑ ابھی کم سن ہیں اور اپنی بیوہ ماں کا سہارا ہیں، اس لیے میدان جنگ میں جانے کی اجازت نہیں دیتے، ادھر مادر قاسمؑ اضطراب کے عالم میں ہیں اور ان کو شوہر کی وصیت بھی یاد آرہی ہے کہ امام حسنؑ نے وقت آخر حضرت قاسمؑ کے بازو پر ایک تعویذ باندھا تھا جس میں لکھا تھا کہ کربلا میں میری طرف سے حسینؑ پر جاں نثار کرنا۔ انیسؔ

اس پورے واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

کہیو کہ اے یتیم حسن تم پہ مرحبا　　کیا خوب ماں کو شاد کیا تم پہ میں فدا
حیراں ہوں میں کھڑے ہوئے تم دیکھتے ہو کیا　　اب تک رضا نہ لی ، مجھے حیرت کی ہے یہ جا
اب کون ہے جہاں میں شہؑ خوشخصال کا　　کیا ہے چچا کے بعد ارادہ جدال کا

شب کو کیے تھے آپ نے مادر سے یہ کلام　　اقرار کیا کئے تھے ، تاسف کا ہے مقام
عمو پہ ہے سحر سے یہ نرغہ میں ازدحام　　کچھ کرسکے نہ تم مددِ شاہؑ خاص و عام
سمجھا گئے تھے باپ بھی کیا کیا ہزار حیف　　بازو کی بھی سند کو نہ دیکھا ہزار حیف

کیا کہہ گئے تھے آپ سے شبرؑ جگر فگار　　تجھ کو اسی سخن کا تصور ہے بار بار
کہتا تھا کون باپ سے ہنگامِ اختصار　　خادم کرے گا پہلے عزیزوں سے سر نثار
اس دم کہاں ہے جرات و ہمت وہ آپ کی　　ہے ہے عمل کیا نہ وصیت پہ باپ کی

اس طرح کی مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی میر انیسؔ کی نظر میں کربلا کی خواتین کا تصور بہت اعلیٰ ہے اور انہوں ایک ایک خاتون کے ہمت وحوصلہ کی اس طرح ترجمانی کی ہے کہ قاری کے دل میں ان خواتین کا مقام بہت اعلیٰ ہوجاتا ہے۔ اور میر انیسؔ کے فن کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا۔

میر انیسؔ نے اپنے مرثیوں میں جہاں خاندانِ رسالت کی بہوؤں اور بیٹیوں کے ہمت وحوصلہ کا ذکر کا ہے وہیں اس خاندان کی کنیزوں کے حوصلہ کی بھی داد دی ہے۔ انھوں نے امام حسینؑ کی کنیز شیریں کا ذکر بھی کیا ہے اور ہند کے حوصلے کو بھی بیان کیا ہے۔ روایت میں ملتا ہے کہ ہندہ خاندانِ امام حسینؑ کی کنیز رہ چکی تھی یہی وجہ ہے کہ اسے خاندانِ اہلِ بیتؑ سے عقیدت تھی۔ ہندہ بہت خوبصورت تھی اسی لیے یزید نے اس سے عقد کیا تھا۔ ہندہ یزید کی زوجہ ضرور تھی لیکن خاندانِ اہلِ بیتؑ سے اس کی محبت ومودت کم نہیں ہوئی تھی۔ میر انیسؔ نے ہندہ کے کردار کو اپنے مرثیے میں خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد قافلہ قید کیا جاتا ہے اور جب ہندہ کو علم ہوتا ہے تو اس کی راتوں کی نیند بھوک اور پیاس سب اڑ جاتی ہے اور وہ مزید غم زدہ ہوجاتی ہے۔ جب یزید اس سے دریافت کرتا ہے تو وہ اس سے ڈرتی نہیں بلکہ طیش میں آجاتی ہے۔ میر انیسؔ ہندہ کی اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہے ظلم وستم کا ترے عہد میں رواج　　اپنے جگر کے زخم کا میں کیا کروں علاج
تجھ کو تو عید ہے مجھے صدمے گزرتے ہیں　　یہ کون ہیں جو راتوں کو فریاد کرتے ہیں
کھانے کو میں نہ ہاتھ لگاؤں گی کیسی بھوک　　اٹھتی ہے بار بار کلیجے میں میرے ہوک

یہ بیکسوں پہ ظلم غریبوں سے یہ سلوک　　ان کے بغیر مجھ پہ یہ کھانا ہے مثل خوک

یہاں پر میر انیسؔ نے ہندہ کی شکل میں ایک باہمت خاتون کا کردار پیش کیا ہے جو حق پرستوں کے لیے اپنے جابر وظالم شوہر کو للکارتی ہے۔ایک عورت کا اپنے شوہر کے لیے دلیری اور بے خوفی سے مظاہرہ کرنا آسان کام نہیں ہے لیکن میر انیسؔ نے اپنے کرداروں کی تعمیر ایسے کی ہے کہ وہ اپنے نفس پر قابو پا کر حق کے راستے کو منتخب کرتی ہیں اور پھر وہ ہر طرح سے ثابت قدم رہتی ہیں۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ میر انیسؔ نے خواتین کرداروں کی ایسی عکاسی کی ہے کہ ایک طرف تو خواتینِ کربلا کا ہمارے ذہن میں مرتبہ بہت اعلیٰ ہو جاتا ہے دوسری طرف یہ کردار آج کے معاشرے کی خواتین کے لیے نمونۂ عمل بھی ہیں۔

ماخذ۔کلیات انیس۔مرتب رانا خضر سلطان، ناشر بک ٹاک لاہور،۲۰۰۶ء

انیسؔ اور انیسؔ شناس۔مرتبہ حسن مثنیٰ، ایلیا پبلیکیشنز، گوپال پور، سیوان بہار، ۲۰۱۳ء

خواتین کربلا کلام انیس کے آئینہ میں از صالحہ عابد حسین مکتبہ جامعہ دہلی

سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ اردو شاعری کا ایک تخلیقی رجحان۔پروفیسر گوپی چند نارنگ۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ا

اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقاء از ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری، نظامی پریس لکھنؤ، دسمبر ۱۹۸۱ء

میر انیسؔ سے تعارف از صالحہ عابد حسین، مکتبہ جامعہ دہلی ۲۰۱۱ء

❁❁❁❁

رباعی

وزن اخرب/اخرم

کہتی ہیں پاکیزہ علامات انیسؔ　　کیا فتح کے گاڑے ہیں نشانات انیسؔ

ترتیب لغت پاتا ہے اِن کے دم سے　　لکھتے ہیں مُستند روایات انیسؔ

قیصر عباس قیصر

خاندانِ اِنیس کی زبان

شہابؔ کاظمی

فروغِ مرثیہ کے مدیر جناب اصغر مہدی اشعرؔ نے ہم سے جناب میر ببر علی المتخلص انیسؔ علیہ رحمۃ پر ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کی اور ہمارے پاس تعمیلِ ارشاد کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ مضمون انھیں ایک معینہ مدت کے اندر اندر درکار تھا چنانچہ ہم نے کیسۂ ذہن کو ٹٹولا تو پتا چلا کہ انیسؔ کے بارے میں اس قدر اور اسی قدر بڑی بڑی ہستیوں نے مصدقہ اور غیر مصدقہ لکھ چھوڑا ہے کہ انیسؔ علیہ الرحمہ کے بارے میں جو بھی لکھا جائے گا وہ تکرار کے علاوہ کچھ نہ ہوگا اس الیکٹرانک دور میں میر انیسؔ اور دیگر شعراء سے متعلق ساری معلومات اب آپ کی Finger Tips پر مہیا ہیں لکھیں تو کیا لکھیں ایک Billion سے زائد کی آبادی میں، یعنی ہندوستان میں، جہاں سے اردو زبان نے رواج پایا وہاں دیوناگری نے اردو کو فارغ خطی لکھ کر دے دی ہے۔ اردو کوئی پڑھ ہی نہیں سکتا پاکستان میں علیٰ الخصوص پنجاب میں جہاں سے سینکڑوں اردو رسالے اور جریدے نکلتے تھے جو فروغ اردو کے لیے آبِ حیات تھے وہاں بھی قحط سالی کا موسم آ کے جانے کا نام نہیں لیتا ہر چند اردو یہاں کی سرکاری زبان ہے دستِ قضا کی دراز دستی اتنی بڑھی کہ فیضؔ، فرازؔ، قتیلِ حفیظؔ، نسیمؔ امروہوی، احمد ندیمؔ قاسمی وغیرہ جیسے سپوت ماؤں نے جنم دینا چھوڑ دیئے۔ پاکستان میں لسانی اور مذہبی تعصب کی تیز ہواؤں نے امیدوں کے نشیمن اجاڑ دیئے ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں نظامِ تحریر وتخلیق کی باگ ڈور ہے وہ مردہ پرستی کا شکار ہیں اور یہی آسان اور سودمند ہے۔ کیوں یہ بھی پھر کبھی اس سلسلے میں ایک فارسی ضرب المثال بھی ہمارے سامنے ہے اور سچ ہے قدرِ گوہر بعدِ زوال۔

جیتے جی کوئی یہ بھی نہیں پوچھتا کہ مرحوم شاعر، مصنف، ادیب کے گھر میں کے دن کا فاقہ ہے مگر مرتے ہی اس پر تعزیت نامے لکھے جاتے ہیں۔ اس کے نام پر انجمنیں اور ادارے قائم کر لیے جاتے ہیں اور ایسے واقعات بھی ہیں کہ جو زندگی میں مرحوم کے مخالف تھے وہ لوگ ان انجمنوں کے نگراں اور منظم بھی ہو جاتے ہیں۔

خیر چونکہ ہم نے بات میر انیسؔ سے شروع کی ہے اور وہ اردو زبان علی الخصوص صنفِ مرثیہ گوئی سے متعلق ہیں اور تھے اس لیے واپس لوٹتے ہیں سب کی معصوم اور گنہگار آنکھوں نے یہ بات بغیر تعصب دیکھی ہے کہ زبان اور دین و مذہب کی ترقی میں مملکت کے سربراہوں کا عمل دخل بہت ہوتا ہے۔ حکومت جس زبان کی یا جس مذہب کی سرپرستی کرے وہ بآسانی ترونج پا جاتا ہے۔ جو لوگ اس فرمانروا کے مذہب سے تعلق نہیں بھی رکھتے وہ بھی حکومت سے بگاڑ کو اپنے لیے مفید نہیں پاتے۔ وہ فرقے زیادہ پھولتے پھلتے ہیں جو حاکموں کے قریب ہوتے ہیں۔ وہ مشاغل جن کو حاکم پرورش کرتے ہیں وہ ہر دلعزیز ہو جاتے ہیں دلّی کے اجڑنے کے بعد اہل فنون پر دلّی میں روزگار تنگ ہو گیا۔ اودھ اور حیدرآباد میں حالات دلّی سے بہتر تھے۔ چنانچہ بہت سے شعراء اور دیگر پیشوں سے متعلق لوگوں نے اودھ اور ریاست حیدرآباد کی طرف

ہجرت کی اور نسبتاً آسودگی سے زندگی گزرنے لگی۔ فارغ البالی کی ہوا نے فنونِ لطیفہ کے سوئے ہوئے جذبوں کو بیدار کیا گمنامی کی زندگی نے نام وری کے شوق میں انگڑائیاں لینا شروع کر دیں۔ درباروں تک رسائی کے لیے سیڑھیاں نظر آنے لگیں۔ شاہی تہذیب و تمدن کے پروردگاروں نے خصوصی ایام میں سید کونینؑ شہزادہ امام حسینؑ اور ان کے اقرباء کی مجلس و ماتم کے فروغ کے لیے تحریک دی تو وہ جو ہمیشہ سے گرفتارِ محبتِ حسینؑ تھے وہ اور وہ جو نبیؐ کریم حضور صلی اللہ وعلیہ وسلم کے خانوادے کے لیے دلوں میں نرم گوشے رکھتے تھے وہ بھی آنکھوں میں نم لیے جمع ہو گئے ان میں وہ بھی تھے جو اسلام کے دور، ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کے دلوں میں بھی ظلم و جبر و استبداد کے خلاف چنگاریاں بھری ہوئیں تھیں وہ بھی دبی زبانوں ہی سے سہی مگر ہمنوائی کا دم بھرنے لگے۔ جو ایک فطری ردِعمل تھا اکثر نوابینِ اودھ اور رجواڑے وغیرہ جن کا میلان شیعیت کی طرف تھا۔ سرزمینِ لکھنؤ مرثیہ کے لیے سازگار تھی۔ شعر و ادب (غزل، مثنویوں سمیت) ایک عرصے سے بادشاہوں، نوابوں کو مرغوب تھا۔ بڑے بڑے نامور شعرا بادشاہوں اور نوابوں کی خدمت میں حاضر رہتے اور ارتقائے زبان کے لیے کوشاں رہتے۔ فنِ زبانِ اُردو جن کی گودیوں میں پرورش پاتا۔ مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی جاتیں۔ بعض نوابین ان شعرا کی شاگردی اختیار کرتے انعام و اکرام پاتے، فراغت سے زبانِ اُردو کی ترویج و ترقی میں مشغول رہتے اور اس طرح نوابینِ اودھ بادشاہ عیش و عشرت سے دور رہ سکے تھے۔

دہلی سے ہجرت کرنے والوں میں سادات کا ایک خاندان جناب میر ضاحکؔ کا تھا جو فیض آباد میں آ کر بس گیا ایسے ہی اجڑنے والوں میں ایک گھرانہ اور تھا جو لکھنؤ میں اپنے ایک چند سالہ فرزندِ ارجمند جس کو دنیا نے بعد میں مرزا دبیرؔ کے نام سے پہچانا وہ بھی تھا فرق یہ تھا کہ یہ خاندان غیر سادات سے تھا اور اس خاندان میں انیسؔ کے خاندان کی طرح پانچ پشت سے شعر گوئی کی کوئی نظیر نہیں تھی۔ بظاہر یہ دو معمولی فرق تھے مگر متعصب فکریں اس کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں حتّٰی کہ امتِ دبیرؔ نے ایک خواب بھی گھڑ لیا جس میں امام علیہ السّلام نے حضرت دبیرؔ کی طرف ہوتے ہوئے غیر سادات ہونے کا فائدہ حضرت دبیرؔ کو دیا۔

ایک وقت تھا کہ لکھنؤ میں میر انیسؔ مرثیہ پڑھنے فیض آباد سے تشریف لاتے تھے پھر ایک وقت آیا کہ خاندانِ میر ضاحکؔ فیض آباد سے مستقلاً لکھنؤ ہجرت کر کے آ گیا اور غالباً اسی سبب سے لکھنؤ دو امتوں میں بٹ گیا۔ ایک انیسیے کہلانے لگے اور دوسرے دبیریے: یہی وقت تھا کہ جب نام آوری اور شہرت نے دونوں حضرات کے قدم چومے جب شہرت اور نیک نامی کی سند ہاتھ آتی ہے تو سب سے پہلے جو بھونکتا ہے وہ غرور و تمکنت ہوتی ہے مگر تاریخ کہتی ہے کہ پیکران دونوں دروازوں سے ایسی کوئی آواز نہیں سنائی دی گئی۔ امتوں کی بات الگ ہے مگر دونوں حضرات میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کے لیے کبھی کوئی کسرِ شان یا اہانت آمیز لفظ بھی قلم سے نہیں لکھا اور زبان سے نہیں کہا اور اگر کہتے تو شاید حالیؔ یہ نہ کہہ پاتے۔

اردو گو راج چار سو تیرا ہے　　شہروں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیسؔ کا سخن ہے باقی　　تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

خیر جیسا ہم نے ابتداً عرض کیا کہ ہم انیسؔ پر کوئی مضمون لکھ کر اپنی رائے نہیں دے رہے ہیں۔

ہندو پاک کی تقسیم سے پہلے بھی اس حدودِ اربعہ میں جس میں آج مملکتِ پاکستان ہے وہاں اردو شعر و ادب سے متعلق بہت زرخیز شہر نہیں تھے۔ لاہور، ملتان، سیالکوٹ، پشاور یا دو ایک شہروں کے علاوہ سندھ تک کوئی چراغ جلتا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ لاہور دلّی کے قریب تھا۔ اس وجہ سے لاہور میں یہ روشنی اپنی چمک سے ذہنوں کو خیرہ کرتی تھی پھر سیالکوٹ میں ایک ایسا سورج نکلا جس کی شعاؤں نے پورے ہندوستان کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا میری مراد حضرت علامہ سر محمد اقبالؔ سے ہے ورنہ وہاں کا ماحول طویل نظموں کے لیے قطعاً ناہموار نہیں تھا یہ جناب حفیظؔ جالندھری تھے جنھوں نے شاہ نامۂ اسلام لکھنے پر کمر باندھی جو ایک طویل بلکہ بہت طویل نظم ہے اور اودھ میں مرثیوں کی شہ پر لکھی گئی ہے اسی طرح حالیؔ کی نظم مدو جزر اسلام ہے۔ پاکستان کی حدود میں ہجرت کر کے آنے والے افراد کے علاوہ صفِ مرثیہ اجنبی شے تھی۔ علامہ اقبالؒ نے صرف شکوہ اور جواب شکوہ مرثیوں کے انداز پر لکھے، اس کے علاوہ پنجاب میں سکونت پذیر دو نام اور قابلِ ذکر ملتے ہیں یعنی جناب قیصرؔ بارہوی اور دوسرے جناب وحید الحسن ہاشمی قیصرؔ بارہوی صاحب نے پنجاب میں مرثیوں کی قرأت میں ترنم کو داخل کر کے وہاں کی سامعتوں کے لیے مقبول بنا لیا تھا مرحوم موصوف نے سو سے زیادہ مرثیے لکھے اور خوب سے خوب تر لکھے مگر ان کی پذیرائی جتنی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی اس کا سبب پھر کبھی بیان ہوگا کہ یہ قصہ اردو مرثیہ کے ٹھیکداروں کا ہے اور ہم اس وقت اس باب میں کوئی موشگافی کے حق میں نہیں۔

انیسؔ کی جو تصویر ہے سو ہے، یہاں سے ہم ایک کتاب جو نسبتاً نئی ہے کی طرف آتے ہیں اس کتاب کا نام ہے۔ ''اسلاف و اخلافِ انیسؔ''، مصنف اس کے ہیں جناب مرحوم سید محمد عباس آصف جو چشم و چراغِ خاندانِ انیسؔ میں سے ہیں۔ کتاب کی ضخامت چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ناشر و مرتب اس کے تھے مرحوم علی احمد دانش (آلِ انیسؔ) یہ کتاب انیسؔ اکادمی آف اورینٹل لرننگ، نیو جرسی، امریکہ کے مالی تعاون سے ڈائمنڈ پریس لکھنؤ سے چھپی ہے علی احمد دانش (آلِ انیسؔ) نے اس کتاب میں انیسؔ اکادمی کے ارکان کے نام ایک سپاس نامے کے طور پر شامل کیے ہیں اس کتاب میں سید محمد عباس آصف (مرحوم) باقیات خاندان انیسؔ میں جو معروف ہستیاں گزری ہیں اور جن کے بارے میں بہت سی معلومات پردے میں تھیں ان سب کا تفصیلی ذکر مع نمونہ کلام درج کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اس کتاب میں ایک باب ''انیسؔ کی زبان'' کے بارے میں بھی قائم کیا ہے۔ ہمارے خیال میں تو یہ کتاب انتہائی کاوش و جانفشانی سے مرتب کی گئی ہے مگر ''انیسؔ کی زبان'' پر جو موشگافیاں کی گئی ہیں وہ اگر ''فروغِ مرثیہ'' کے اوراق کے ذریعے عوام الناس تک پہنچ جائے تو نہ صرف ۔۔۔۔۔ شعرا کی تربیت و تعلیم میں مفید ثابت ہوگا۔ بلکہ پرانے شعراء اور دیگر ادب سے دلچسپی رکھنے والے افراس بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں باالفاظِ دیگر ''اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا'' اور گویا یہی ہمارے اس مضمون مدعا ہے ہمارے خیال میں اگر ہم کوئی تحریر لکھیں اور اس کا کوئی فائدہ قارئین کرام کو نہ پہنچے تو وہ وقت کے زیاں کے علاوہ کچھ نہیں اس لیے ہم مذکورہ کتاب کے صفحہ ۳۱ سے ۴۰ تک کی فوٹو کاپی پر اکتفا کرتے ہیں ہم اس کتاب کے ٹائٹل پیج کی تصویر بھی شاملِ مضمون کر دی ہے پتا نہیں یہ کتاب Rekhta.com پر ہے کہ نہیں یہ آپ خود تلاش کر سکتے ہیں۔

سچ ہے کہ اس زبان کو کوئی جانتا نہیں
جو جانتا ہے اور کو وہ مانتا نہیں

خاندانِ انیسؔ کی زبان:

اردو زبان دہلی میں پیدا ہوئی لیکن جب وہاں کے حالات سازگار نہ رہے تو اودھ کے سلاطین اور روسا نے اس کی طرف توجہ کی اور اسکی پرورش کرنا شروع کیا پہلے دہلی کی زبان معیاری زبان سمجھی جاتی تھی، اب فیض آباد اور لکھنؤ مثالی قرار پائے اور پرانے الفاظ پُرانے سکّوں کی طرح ٹکسال باہر ہوئے اور نئے نئے الفاظ محلات شاہی سے ڈھل کر نکلنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ وضع الفاظ اور ان کی تحقیق اور تحفظ کے لیے دہلی میں ایک دفتر تھا جس کے میر منشی میر حسنؔ صاحب تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد جب وہاں سے شعرا فیض آباد آ گئے تو ایسا ہی ایک دفتر فیض آباد میں قائم ہوا اور میر حسنؔ صاحب کے فرزند خلیقؔ اس کے میر منشی مقرّر ہوئے۔ اس کی تصدیق میر انیسؔ صاحب کے ایک نواسے قاضی سید عباس حسین صاحب عرف نّھے صاحب مرحوم نے (جن کے والد فیض آباد کے باشندہ تھے، نے بھی کی) جو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مگر جوانی میں ہجرت کر کے فیض آباد چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کیا۔ ہمیں اس دفتر کے متعلق زیادہ علم نہیں۔ بعض تذکرہ نویسوں نے ایسا ہی تحریر کیا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ خاندانِ انیسؔ کی زبان ہمیشہ مستند مانی گئی ہے۔ اس کے وجوہ کیا ہو سکتے ہیں؟ ذیل میں چند اصول پیش کیے جاتے ہیں جن پر خاندان انیسؔ عامل رہا اور اہلِ زبان کو ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

زباندانی کے اصول

(۱) اس کا کلام اور اس کی گفتگو دائرہ تہذیب کے اندر شرفا اور صلحا کی ہو۔ قسم زیادہ نہ کھاتا ہو۔ الفاظ دشنام اثنائے گفتگو میں استعمال نہ کرے۔ یا ایسے الفاظ جو ذرا سے تغیّر سے دشنام سے مشابہ ہو جاتے ہیں ان سے پرہیز کرے۔ جیسے سال کی جمع سالا ہے، یا جیسے ''امتحان میں بار بار فیل ہونے سے میرے کئی سالوں کا نقصان ہو گیا'' یہاں پر کئی سالوں کے بجائے ''کئی برس کا نقصان ہو گیا'' بولا جائے گا۔

(۲) بازاری الفاظ اور سوقیانہ مصطلحات استعمال نہ کرتا ہو۔

(۳) اس کے کلام اور تحریر و تقریر میں مغلق اور غیر مانوس الفاظ نہ آنے پائیں جن کے سمجھنے کے لیے تامل اور تفکر کی ضرورت ہو اور عوام کی سمجھ سے باہر ہوں بلکہ روزمرّہ کے مستعمل الفاظ فقرے اور جملے ہوں۔

(۴) اس کا کام اغلاط سے پاک ہو یعنی وہ اپنے کلام میں مذکر الفاظ کو مذکر استعمال کرے اور مونث کو مونث اور ان کے لیے مذکر یا مونث صیغۂ ہائے افعال بھی استعمال کرے۔ مثلاً ''قلم ٹوٹ گئی'' غلط ہے ''قلم ٹوٹ گیا'' بولنا چاہیے۔ ''باغ بک گئی'' غلط ہے ''باغ بک گیا'' صحیح ہے۔ اسی طرح ''روٹی کھایا'' غلط ہے ''روٹی کھائی'' صحیح ہے۔ ''کتاب پڑھا'' غلط ہے ''کتاب پڑھی'' صحیح ہے۔

(۵) اسی طرح اُس کو الفاظ جمع کی بھی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔ عربی اور فارسی الفاظ کی جمع اردو میں بہ طریق عربی و فارسی بھی مستعمل ہے اور اردو کے ادیبوں نے بعض فارسی و عربی الفاظ کی اردو کے اصول پر واو اور نون کا اضافہ کر کے بھی بنانے کی اجازت دی ہے اس کو چاہیے کہ ایک اصول پر جمع بنائے اور استعمال کرے، ایسا نہ کرے کہ عربی لفظ کی عربی جمع کو واحد سمجھ کر پھر اس پر وَ اور نَ کا اضافہ کر کے اردو جمع بھی بنالے جیسے بعض کم علم لوگ ''عالم'' کی جمع ''علماء'' کو واحد سمجھ کر اس کی جمع ''علماؤں'' یا ''شاعر'' کی جمع ''شعراؤں'' یا ''لفظ'' کی جمع

''الفاظوں'' بنالیتے ہیں یہ غلط ہے۔

(۶) اس کو روزمرّہ استعمال ہونے والے فارسی اور عربی کے الفاظ کے معانی کا علم ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ ''لیل'' اور ''شب'' دونوں کے معنی ''رات'' کے ہیں تو وہ اپنی گفتگو میں ''شب لیلۃ القدر'' یا ''لیلۃ القدر کی رات'' یا ''شبِ قدر کی رات'' نہ کہہ دے ورنہ لوگ اس کو جاہل سمجھیں گے اور اس کا وقار نہ رہے گا۔

(۷) اس کو عورتوں اور بچّوں کی زبان سے بھی واقفیت ہونا چاہیے۔ یعنی اس کو اگر اپنے کلام میں کسی محل پر عورتوں اور بچّوں کی گفتگو کے لیے جذبات کے اظہار کی ضرورت پڑے تو وہ ان کو انہیں کی زبان میں صحیح صحیح ادا کرے، مردوں کی گفتگو میں عورتوں کے الفاظ و محاورات نہ استعمال کرے۔

(۸) اس کو حتی المقدور اہلِ حرفہ اور اپنے وطن کے مروجہ علم و فنون کے محاورات و مصطلحات کا علم ہونا چاہیے تاکہ وہ اگر اتفاق سے کبھی کسی اہلِ فن یا اہلِ حرفہ سے گفتگو کرے تو اس کی گفتگو سمجھنے اور اس کو سمجھانے میں دشواری نہ ہو یا اگر کسی موقع پر کسی خاص فن یا صنعت کے متعلق اس کو تقریر کرنا ہو تو حاضرین کو اچھی طرح سمجھا سکے۔

(۹) کچھ عرصے سے وقت اور رقم کے اعداد خواہ وہ ایک سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو واحد بولتے ہیں اور ان کے لیے جمع کو واحد کہتے ہیں جیسے ''آٹھ بجاہے'' ''دس بجاہے'' ''بارہ بجاہے'' یہ سب غلط ہے۔ ان سب میں ''بجے ہیں'' ہونا چاہیے۔

(۱۰) اہل قریہ کے الفاظ یا دوسری زبانوں کے اُردو میں مستعمل الفاظ جنکو پرانے ادیبوں نے کچھ تغیّر دے کر اپنا لیا ہے اسی طرح استعمال کیے جائیں جس طرح مستعمل ہیں، ان کو ان کے اصلی تلفّظ میں استعمال کرنا خلاف فصاحت ہے۔

(۱۱) ہر زبان میں بہت الفاظ مترادف اور ہم معنی بھی ہوتے ہیں لیکن ان میں کبھی کبھی ذرا سا فرق ہوا کرتا ہے ایسے الفاظ اُردو میں بھی ہیں۔ اس کو ایسے الفاظ کے معنوں میں جو خفیف سا فرق ہو اس کا علم ہونا چاہیے اور مترادف الفاظ میں جو لفظ جس محل اور مقام کے لیے مناسب ہو وہی صرف کرنا چاہیے۔ ''ہر سُخن مَوقع و ہر نُکتہ مَقامے دَارد''

(۱۲) اس کو متروک الفاظ کا بھی علم ہونا چاہیے اور جو الفاظ ترک ہو چکے ہیں ان کو اپنے کلام میں صرف نہ کرے۔

(۱۳) اس کو عربی فارسی کے الفاظ کا صحیح تلفظ معلوم ہونا چاہیے وہ اپنے کلام میں ''تخت کو بہ فتحتین اور شتر'' بہ سکون تائے تحتانی نہ استعمال کرے۔

(۱۴) اس کو زیادہ سے زیادہ الفاظ پر غور ہونا چاہیے۔

(۱۵) اس کا کلام صاف و شُستہ ہو اس کی گفتگو میں تعقید نہ ہو اور اس کا بیان گنجلک نہ ہو عام فہم ہو۔

(۱۶) اردو کے الفاظ کی فارسی یا عربی کے الفاظ کے ساتھ ترکیب فارسی کی اضافت کے ساتھ غلط ہے۔ اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ اسی طرح اردو کے دو الفاظ کی ترکیب بھی بہ طریق فارسی ناجائز ہے مثلاً فرس عربی ہے گھوڑے کو کہتے ہیں اور 'باگ' اردو ہے اس کی عربی 'عنان' ہے اور فارسی 'لگام' ہے تو ''باگِ فرس'' کی ترکیب غلط ہوگی ''عنانِ فرس'' یا ''لگامِ فرس'' صحیح ہوگا یا پھر گھوڑے کی باگ صحیح ہوگا۔ اسی طرح ''انگوٹھی پکھراج'' اور ''پیتلی تانبا'' بھی غلط ہے۔

''ماں باپ'' کے بجائے ''ماتا پتا'' ''لالٹین'' کے بجائے ''لینٹرن'' کہنا یا لکھنا خلاف فصاحت ہے۔

(۱۷) یہی اصول واو عاطفہ کے لیے بھی برتا جائے گا۔ ''تلوار و نیزہ'' غلط ہے۔ ''تلوار اور نیزہ'' یا ''شمشیر و نیزہ'' درست ہے۔ ایسے ہی ''تلوار و بھالا'' یا ''سانپ و بچھو'' یا ''چاند و سورج'' یہ سب غلط ہیں۔ ''تلوار اور بھالا'' ''سانپ اور بچھو'' ''چاند اور سورج'' صحیح ہے۔

(۱۸) اسی طرح اسمِ فاعل ترکیبی بھی اُردو اور فارسی کی ترکیب سے بنانا درست نہیں ہے جیسے آج کل ہمارے بعض اخبار نویس ''سنسنی خیز'' کی لفظ لکھا کرتے ہیں ایسی ترکیبوں سے بھی پرہیز لازم ہے۔

(۱۹) ''والا'' اُردو زبان کا کلمہ نسبت ہے۔ اس کا استعمال سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے مثلاً کسی مقام کی طرف نسبت جیسے دلّی والا، بمبئی والا، لکھنؤ والا، یا کسی جنس کی طرف جیسے چاندی والا، جوتی والا، تار والا، آم والا، وغیرہ وغیرہ یہ سب صحیح لیکن آج کل اس لفظ ''والا'' کو اس قدر وسعت دے دی گئی ہے کہ مروف اشارہ تک کے ساتھ ''والا'' کا التزام کر دیا جاتا ہے اور ''یہ والا قلم'' اور ''یہ والا کاغذ'' کہہ دیا جاتا ہے حالانکہ ''یہ قلم'' اور ''وہ کاغذ'' مطلب کو پورے طور پر ادا کر دیتا ہے۔

(۲۰) پرانے زمانے کی بعض عورتوں نے بعض الفاظ پر ''والا'' کا اضافہ کر کے ان فقرات سے مخصوص چیزیں مراد لی تھیں جن کا استعمال لکھنؤ کی عورتوں کی زبان پر اب بھی ہے جیسے ''زمین والا'' سانپ کو اور ''اوپر والا'' چاند کو کہتی ہیں۔ اب اگر کوئی مقرّر اپنی تقریر میں یا مقالہ نگار یا شاعر اپنی نثر یا نظم میں ''اہلِ زمین'' کے لیے ''زمین والے'' کہہ دیں تو اردو کے اہل زبان اس کے معنی سانپ سمجھیں گے۔ ایسی ترکیبوں سے بھی پرہیز لازم ہے۔

میر انیسؔ کے خاندان میں سب سے پہلے اُردو کے شاعر میر غلام حسین ضاحکؔ تھے لیکن ان کا کلام فی الوقت ہماری دسترس سے باہر ہے بجز چند اشعار کے اس وجہ سے ان کی زبان کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے۔ ان کے فرزند میر حسنؔ میر دردؔ کے شاگرد اور میرؔ و سوداؔ کے معاصر تھے۔ میر خلیقؔ اور میر انیسؔ اور ان کے بھائی انسؔ و مونسؔ، مرزا غالبؔ، آتشؔ، ناسخؔ وغیرہ کے ہم عصر تھے۔ لیکن ہم کو میر انیسؔ اور ان کے اسلاف یا اخلاف کے کلام میں متذکرہ صدر اصول زبان دانی کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسی بات نہیں ملتی جو ان کے کلام کو ان کے معاصرین کے کلام سے کسی طرح ممتاز ثابت کر سکے۔

یا ان کی زبان کی دوسروں کی زبان پر فوقیت اور برتری ظاہر کرے اور یہ بات متیقن ہو جائے کہ جیسی زبان میر خلیقؔ جانتے تھے آتشؔ و ناسخؔ نہیں جانتے تھے۔ یا میر حسنؔ جیسی زبان جانتے تھے میرؔ و سوداؔ اور دیگر معاصرینِ میر حسنؔ نہیں جانتے تھے لیکن یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ بہت سے ایسے الفاظ جو ترک کے قابل تھے میر حسنؔ نے بہت پہلے ترک کر دیے تھے جبکہ میر تقی میرؔ جو میر حسنؔ کے بعد تک زندہ رہے انہیں الفاظ کو بہت بعد تک استعمال کرتے رہے۔ اس کا اندازہ ہر دو اساتذہ کا کلام دیکھنے سے ہو سکتا ہے۔

میر انیسؔ اور میر خلیقؔ کے معاصرین شیخ ناسخؔ اور خواجہ آتشؔ میر خلیق اور ان کے خاندان کی زبان کے قابل تھے۔ ناسخؔ اپنے شاگردوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ ''اگر زبان سیکھنا ہو تو میر خلیقؔ سے سیکھو''۔ اسی طرح میر مونسؔ برادر میر انیسؔ بھی کہا کرتے تھے کہ ''جیسی زبان ہمارے بابا جان نظم کر گئے ہیں ویسی ہم کو بھی نہیں آتی''۔ خود میر انیسؔ بھی اپنے پدرِ بزرگوار کی زبان دانی کے قائل تھے جیسا کہ ایک مرثیہ کے

مقطع میں اپنی زبان پر میر خلیقؔ کی زبان ہونے کا فخر کیا ہے۔

بس اے انیسؔ بزم میں ہے نالۂ و فغاں　　پوچھ ان کے دل سے جو ہیں سخن فہم و نکتہ داں
حق ہے سُنا نہیں کبھی اس حُسن کا بیاں　　گویا کہ یہ خلیقؔ کی ہے سربسر زباں
سچ ہے کہ اس زباں کو کوئی جانتا نہیں　　جو جانتا ہے اور کو وہ مانتا نہیں

ایک مرتبہ دو آدمیوں میں میر انیسؔ کی زبان کے متعلق اختلاف ہوا، ایک کہتا تھا کہ میر انیسؔ کی زبان دہلی کی ہے، دوسرا کہتا تھا کہ لکھنؤ کی ہے دہلی والے ایسی زبان کیا بول سکتے ہیں۔ آخر تصفیے کے لیے خود میر صاحب کے پاس آئے اور ان سے دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ''میں نہ دہلی کی زبان بولتا ہوں نہ لکھنؤ کی میں اپنے گھر کی زبان بولتا ہوں جو مجھ کو میرے باپ دادا نے سکھائی ہے۔'' اپنے مرثیے کے مقطع میں فرماتے ہیں۔

بس اے انیسؔ بس کہ نہیں طاقتِ بیاں　　ہر بند زخمِ دل پہ ہے گویا نمک نشاں
یہ بول چال اور یہ رنگینیٔ زباں　　کیونکر نہ ہو بھلا کہ یہ ہے طرزِ خانداں
بس یہ کلام بے مددِ کبریا نہیں　　جب تک نمک نہ ہو تو سخن کا مزا نہیں

اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ میر انیسؔ صاحب کے خاندان میں الفاظ کی بری جانچ پرتال ہوتی تھی اور تحریر و تقریر میں دہلی یا لکھنؤ کی کوئی پابندی نہ تھی بلکہ جو الفاظ (خواہ دہلی میں مستعمل ہوں یا لکھنؤ میں) ان حضرات کا مذاق صحیح قابل قبول اور لائقِ استعمال جانتا تھا وہ بولے جاتے تھے ورنہ ترک کر دیئے جاتے تھے اور شاگردوں اور گھر کے بچّوں کو بھی ان کے استعمال سے روکا جاتا تھا۔

میر خلیقؔ صاحب کے بعد بعض الفاظ جن کو زمانہ ترک کرتا جا رہا تھا، میر انیسؔ صاحب نے بھی اپنے کلام میں استعمال کرنا چھوڑ دیئے۔ اسی طرح بعض قدیم الفاظ جن کو میر انیسؔ نے باقی رکھا تھا ان کے فرزند میر نفیسؔ نے ترک کیے، میر انیسؔ کے بعد میر نفیسؔ کو بھی اُردو شعرا اور ادیبوں نے مستند زباندان مان لیا تھا اور برابر نزاعی مسائل پر ان سے استفادہ کرتے تھے۔ اسی طرح جناب عارفؔ مرحوم اور فائقؔ و لائقؔ سے بھی مسائل زبان پر استفتا کیا جاتا تھا۔

❁❁❁❁

رباعی

شیریں زباں تھے خلق میں شیریں سخن انیسؔ　　تنہا تھے اپنی ذات سے اک انجمن انیسؔ
مدح حسینؑ موت کے بستر سے کر گئے　　رکھتے تھے اپنے سر پہ یدِ پنجتنؑ انیسؔ

اشفاق نجمیؔ

میرا انیسؔ

فدا محمد ناشادؔ

اقلیمِ سخن کے شہنشاہ میر ببر علی انیسؔ کی شاعری، جس کا مرکز ومحور مرثیہ گوئی ہے، اگر ہم اُنہیں آسمانِ مرثیہ گوئی کے آفتابِ عالمتاب کہیں تو بے جا نہ ہوگا، اُن کے فنِ شاعری پر اب تک ہزاروں نہیں تو سینکڑوں کتابیں چھپ کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں، ہزاروں مقالے مختلف ادبی وعلمی رسالوں اور اخبارات کی زینت بن چکے ہیں، جہاں کئی علمی وادبی اداروں نے اُن کی ادبی اور ثنائی خدمات پر یادگاری شمارے شائع کیے ہیں، وہاں اِس موضوع پر مجھ جیسے کم علم وفہم شخص کا کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ لیکن جب زمانے میں خدائی کے دعویدار بادشاہ نمرودِ لعین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھڑکتے شعلوں اور دھکتے انگاروں میں جھونک دیا تو اپنے دلوں میں درد رکھنے والے مختلف صاحبانِ شعور اُس آگ کو بجھانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے کہ ایک ننھی سی چڑیا بھی اپنی چونچ میں پانی لے کر آتشِ نمرود پر گرانے پہنچی۔ کسی نے اُس چڑیا سے پوچھا کہ اتنے سارے افراد کی کوششیں اِس آگ کو بجھانے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں، کیا تمھارے اِس قطرہِ آب سے اِس تنور کی آگ بجھ سکے گی، اُس چڑیا نے جواب دیا کہ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے، لیکن میں یہ کوشش اِس لیے کر رہی ہوں کہ اِس کارِ خیر میں حصہ لینے والوں کی فہرست میں اپنا نام بھی لکھوا سکوں۔ یہی کچھ میری یہ کوشش بھی ہے۔ وگرنہ میر انیسؔ جیسے بے مثال اور یکتائے روزگار شاعرِ انسانیت کی شاعرانہ عظمت پر قلم اُٹھانے کی میں کہاں اور میری جرأت کہاں!

میر ببر علی؛ رضوی قبیلے کے سادات میں سے تھے، جو بچپن ہی سے صنفِ شاعری کی جانب قدم بڑھا چکے تھے اور ابتدائی دنوں میں اپنا تخلص حزیںؔ رکھا ہوا تھا، جسے بعد میں انیسؔ رکھنے کی تجویز معروف شاعر اور دبستانِ لکھنو کے بانی شیخ امام بخش ناسخؔ نے دی تھی، جسے قبول کرتے ہوئے آپ حزیںؔ سے انیسؔ بن گئے اور اتنے بڑے شاعر بن گئے جن کا نام صرف میرؔ، غالبؔ، نظیرؔ، ذوقؔ، سوداؔ، جوشؔ اور اقبالؔ ہی نہیں بلکہ حافظؔ، خیامؔ، فردوسیؔ اور محتشمؔ جیسے شعراء کے صف میں بھی نمایاں نظر آنے لگا۔ یوں تو انیسؔ علیہ الرحمہ کے انتہائی خوبصورت، فکر انگیز، نصیحت آموز قطعات، رباعیات، سلام، اور نظمیں اردو ادب کا حصہ ہیں، آپ کو فارسی زبان پر بھی بجا طور پر دسترس تھی۔ اُن کے فارسی میں قطعات ورباعیات کے علاوہ بہت سے خطوط بھی چھپ چکے ہیں۔ اُنہوں نے بھی شاعری غزل گوئی سے ہی شروع کی، عالمِ شباب میں اُنکی کئی دلنشین ودلسوز غزلیں تھیں، لیکن ہم تک جو پہنچی ہیں، اُن میں سے ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں ؎

اشارے کیا نگہِ ناز دلربا کے چلے　　جب اُن کے تیغ چلے نیمچے قضا کے چلے
مثالِ ماہیِ بے آب موج تڑپا کی　　حباب پھوٹ کے روئے جو وہ نہا کے چلے
کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی　　چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

یہ وہ غزل ہے جو اُنہوں نے لکھنؤ میں منعقدہ ایک مشاعرے میں پیش کی تھی، جسے سُن کر سامعین جھوم اُٹھے تھے اور اُنہوں نے اُٹھ اُٹھ کر داد دی تھی، جب یہ خبر انیسؔ کے والد میر مستحسن خلیقؔ تک پہنچی، جو خود بھی غزل گوئی میں اُس دور کے ممتاز شاعروں میں سے تھے، انہوں نے میر انیسؔ کو بلایا اور اُس مشاعرے کے متعلق دریافت کرنے لگے، لیکن میر انیسؔ اُس مشاعرے کی روداد والد کے سامنے پیش کرنے سے کتراتے رہے۔ تب میر خلیقؔ نے اُنہیں اُن کی اُس غزل کی بات چھیڑ دی جس کی تعریف کئی لوگوں سے سن چکے تھے، ساتھ ہی اُس غزل کو سننے کی خواہش کا اظہار کیا، لیکن انیسؔ شفیق والد کے احترام کے پیشِ نظر اِسے سنانے سے گریز کرتے رہے، لیکن والد کے اصرار پر آخر کار اُنہیں یہ غزل سنانی ہی پڑی، جسے سن کر میر خلیقؔ نے اُن کی سخن سازی کی بھرپور تعریف کرتے ہوئے حوصلہ افزائی کی، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ''اَب اِس غزل کو سلام کرو'' اگر آپ اپنی شاعری کی اِن فاضلانہ صلاحیتوں کو ائمہ طاہرینؑ کے مناقب و مراثی کی جانب موڑ دو تو نہ صرف اِس جہاں میں بلکہ جہانِ ابدی میں بھی باعثِ بلندیِ درجات ہو سکتی ہے۔ والد کی اِن نصیحتوں پر عمل کرتے ہوئے اُنہوں نے اِس غزل کو اُسی قافیہ و ردیف کے ساتھ سلام کے قالب میں منتقل کر کے والد کے سامنے پیش کیا، جس پر انھوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے رثائی ادب میں مشقِ سخن جاری رکھنے پر مزید زور دیا۔ اُس سلام کے چند اشعار یہ ہیں ؎

گُنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اُٹھا کے چلے　　خُدا کے آگے خجالت سے سَر جھکا کے چلے
خیال آ گیا دنیا کی بے ثباتی کا　　چلے جہان سے اصغرؑ تو مسکرا کے چلے
حسینؑ کہتے تھے وا حسرتا علی اکبرؑ　　بہارِ باغ جوانی ہمیں دکھا کے چلے
مَلک پُکارے کہ اُلٹا زمین کا طبقہ　　حسینؑ فوج پہ جب آستیں چڑھا کے چلے
ملی نہ پھولوں کی چادر تو اہلِ بیتِؑ اَنام　　مزارِ شاہؑ پہ لختِ جگر چڑھا کے چلے
چلے وطن کو جو عابدؑ تو کہتے تھے رو کر　　علیؑ کے چاند کو ہم خاک میں چھپا کے چلے

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

اپنی غزلوں کے نسخوں کو تو والد کی خواہش پر میر انیسؔ نے خود ہی تلف کر دیا تھا، لیکن اُن کی چند غزلوں کے اشعار جو صاحبِ ذوق افراد نے اپنے پاس محفوظ کیے تھے، اَب تک دست بدست لوگوں تک پہنچتے رہے ہیں۔ جن میں سے ایک اور غزل کے اشعار یوں ہیں ؎

شہیدِ عشق ہوئے قیسِ نامور کی طرح　　جہاں میں عیب بھی ہم نے کیے ہنر کی طرح
سیاہ بختوں کو یوں باغ سے نکال اے چرخ　　کہ چار پھول تو دامن میں ہوں سپر کی طرح
تجھی کو دیکھوں گا جب تک ہیں برقرار آنکھیں　　مری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح
تمھارے حلقہ بگوشوں میں ایک میں بھی ہوں　　پڑا رہے یہ سخن کان میں گہر کی طرح

انیسؔ یوں ہوا حالِ جوانی و پیری
بڑھے تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

میر انیسؔ کی غزل کا ایک اور مطلع بعض اشعار کے دلدادہ احباب سے سنتے رہے ہیں، جو نہایت خوبصورت اور معروف ہے، لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود پوری غزل تو مجھے کہیں سے بھی دستیاب نہ ہوسکی، ہوسکتا ہے کسی انیسیے کے پاس یا مرحوم کے خاندان کے کسی فرد کے پاس اِس غزل کا مکمل نسخہ موجود ہو۔ اِس کا مفہوم تو عام سا ہے، لیکن تخیل اور صنعت کلام بے مثل و بے نظیر ہے، ملاحظہ فرمائیے ؎

لکھ کر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دیا　　اُن کا تو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

میر انیسؔ کے خاندان میں شاعری کا سلسلہ تو کئی پشتوں سے چلا آ رہا تھا، یوں شاعری انھیں وراثت میں ملی۔ اُن کے پردادا میر ضاحکؔ سے اُن کے والد میر خلیقؔ تک ہر ایک اپنے اپنے دور کے ممتاز شعراء میں سے تھے۔ جن میں سے ہر ایک کے کلام کے مجموعے علیحدہ علیحدہ شائع ہو کر سرکاری و ادبی اداروں کے علاوہ مختلف شائقینِ ادب کی لائبریریوں کی زینت بن چکے ہیں۔ میر انیسؔ کی طرح اُن کے شفیق والد میر خلیقؔ کی بھی بہت سی غزلیں موجود ہیں لیکن دونوں باپ بیٹوں نے اپنی غزلوں کو شہرت نہیں دی، بلکہ یہ کہیں تو بے جا نہیں ہوگا کہ اُن غزلوں کو تلف کر دیا گیا۔ اب جو کچھ دست یاب ہے، وہ اُن کے چاہنے والوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ورنہ دونوں نے صرف رثائی اَدب کو ہی فروغ دیا، اور اُسی صنف سخنِ میں وہ یدطولیٰ حاصل کر لیا، جو کسی اور کے حصّے میں نہیں آ سکا۔ اردو شاعری میں مثنوی صنف بھی شروع سے ہی موجود تھی، لیکن اِس حوالے سے میر انیسؔ کے دادا، مثنوی سحر البیان کے خالق میر حسنؔ کا حصہ محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ نے اردو ادب کو اِس صنف سخن سے مالا مال کر دیا ہے۔ مراثیِ انیسؔ نے تو نہ صرف انیسؔ کو دنیائے ادب میں حیاتِ جاودانی عطا کرتے ہوئے اُنہیں خدائے سخن یا ناخدائے سخن کے درجے پر فائز کر دیا، بلکہ اُنکے خاندان کیلئے بھی باعث عزت و شہرت بن گئے۔ اُس دور میں مرزا سلامت علی دبیرؔ بھی کمال کے شاعر تھے، انہیں اردو کے علاوہ فارسی اور عربی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا، مرثیہ گوئی میں دبیرؔ نے لکھنؤ میں اپنا سکہ جمایا ہوا تھا، لکھنؤ کے اُس ماحول میں میر انیسؔ کے لیے پاوں جمانے کی گنجائش انتہائی محدود تھی، لیکن میر انیسؔ کی زبان کی شستگی کے علاوہ اُس میں موجود سلاست و روانی اور بھرپور منظر نگاری نے اُن کے کلام کو اِس قدر مقبول عام بنا دیا، جس کی مثال اَب تک کی اردو شاعری میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ انیسؔ و دبیرؔ کے آپس میں ہمیشہ خوشگوار تعلقات رہے اور دونوں ایک دوسرے کے بہت زیادہ قدردان تھے۔ رثائی ادب کا مرکز و محور تو حضرت امام حسینؑ کی ذاتِ اقدس ہے اور مرثیے کی بنیاد کربلا کے اِسی تاریخی واقعہ پر قائم ہے جس کی ابتدا اُن کی مدینے سے کربلا کی جانب سفر سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر شہادت کے بعد اہلِ بیتِ اطہارؑ کی کوفہ و شام سے ہوتے ہوئے مدینے میں واپسی تک کے جملہ واقعات کا بیان ہے۔ اہل حرمؑ اور امام علیہ السلام کی مدینہ سے روانگی کا منظر انیسؔ نے یوں بیان کیا ہے ؎

کنعانِ محمدؐ کے حسینوں کا سفر ہے　　خورشید لقا ، زہرہ جبینوں کا سفر ہے
چُھٹتا ہے وطن ، گوشہ نشینوں کا سفر ہے　　اک دن کا نہیں کوچ ، مہینوں کا سفر ہے
گل رو چمنِ خُلد میں جانے کو چلے ہیں
گھر چھوڑ کے جنگل کے بسانے کو چلے ہیں

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے　　جانے وہی بلبل ، جو بچھڑ جائے چمن سے
واقف ہے مسافر کا دِل اِس رنج و محن سے　　چُھٹتا نہیں گھر ، جان نکل جاتی ہے تَن سے
آرام کی صورت نہیں مسکن سے بچھڑ کر
طائر بھی پھڑکتا ہے نشیمن سے بچھڑ کر

یہ مرثیہ ۱۷۸ مسدس اشعار پر مشتمل ہے، جو امام علیہ السلام اور اُن کے ساتھی اصحاب کے مدینے سے رخصت ہونے کے حالات، بیمار بیٹی فاطمہ صغرؑا سے اہلِ بیتِ اطہارؑ کی الوداعی ملاقات، کربلا تک کے حالاتِ سفر، سفر کی صعوبتوں کا بیان، کوفے کے حالات کی اطلاع اور حضرت مسلمؑ کی خبرِ شہادت، حرؑ الرّیاحی کے قافلے سے ملاقات، اُن سے تبادلہ خیالات و مذاکرات، میدانِ کربلا میں وارد ہونے اور وہاں قیام پذیر ہونے وغیرہ کے تفصیلی واقعات پر مشتمل ہیں۔ اَنیسؔ کا بیشتر رثائی کلام عام طور پر دعائیہ کلمات پر ختم ہوتا ہے۔ جن کے چند نمونے درج کر رہا ہوں۔ اِس مرثیہ کے اختتامی دعائیہ کلمات پر مشتمل بندیوں ہے ؎

مصروف بُکا بزم میں ہیں شاہؑ کے غم خوار　　ہر شخص کے بَر لائیں مطالب شہؑ ابرار
خالق سے انیسؔ اَب یہ دعا کر بہ دلِ زار　　یارب ! اِسی ماتم سے رہے مجھ کو سروکار
ہر دم پسرِ فاطمہؑ کی یاد میں گذرے
دِن رونے میں، شب نالہ و فریاد میں گذرے

انیسؔ علیہ الرحمہ کے بہت سے مرثیوں میں سے ایک اور بھرپور نہایت دلسوز مرثیہ ۲۴۵ مسدس اشعار پر مشتمل ہے جو اِس شعر سے شروع ہوتا ہے جب کربلا میں داخلہِ شاہؑ دیں ہوا،، اِس مرثیے کا آخری بند بھی دعائیہ ہے، ملاحظہ فرمائیے ؎

مولا مزارِ پاک پہ بلوائیے شتاب　　اَب ہجر کی انیسؔ کے دِل کو نہیں ہے تاب
رہ جائے گی ہوس ، جو دیا زیست نے جواب　　خاکِ شفا ملے مجھے ، یا ابنِ بوترابؑ
اچھی نہیں مریض کو دوری مسیح سے
حسرت یہ ہے کہ روؤں لپٹ کر ضریح سے

ایک اور انتہائی مقبولِ عام مرثیہ ''جب قیدیوں کو خانۂ زنداں میں شب ہوئی'' اِس مرثیہ کا دعائیہ مقطع یوں ہے ؎

بَس ، اے انیسؔ بزم میں ہے گریہ و بُکا　　وقتِ دُعا ہے ، خالقِ اکبر سے کر دُعا
یا رب بہ حقِ احمدؐ و زہراؑ و مجتبیٰؑ　　دکھلا دے جلد روضۂ سلطانِ کربلا
دم لب پہ ہے ، زیارتِ مولا نصیب ہو
بیمارِ غم کو قربِ مسیحا نصیب ہو

اپنے بیشتر مراثی کے اِن دعائیہ کلمات کو عقیدتوں کے حسین ترین پیکر میں ڈھال کر دل کی گہرائیوں سے جس خلوص و محبت کے ساتھ

بارگاہ امامؑ عالی مقام میں پیش کیا ہے اُس سے اِس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ میر ببر علی انیسؔ کو خامسِ آلِ عباؑ، سید الشہداؑ، حضرت امام حسینؑ سے کس قدر عاشقانہ وابستگی رہی ہے۔ یوں تو اُن کے تمام مراثی علم و اَدب کے عظیم ترین شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ عقیدتوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے، اَنیسؔ کا ہر ایک مرثیہ اپنے اندر واقعاتِ کربلا کا ایک گراں بہا خزانہ ہے۔ جس میں اُنہوں نے چھوٹے سے چھوٹے نکتے کو بھی بہت ہی دل نشین انداز میں ایسے پھیلا کر بیان کیا ہے، جنہیں سن کر پتھر کا دل بھی موم ہوسکتا ہے۔ اُردو اَدب میں اِن کے مرثیوں کو، اور خاص طور پر اُن کے مرثیوں میں منظر نگاری کو وہ اہم مقام حاصل ہے، جس کی نظیر کسی اور کے کلام میں مل نہیں سکتی۔ اُن کے ایک مرثیہ ''جَب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' میں روزِ عاشورا میدانِ کربلا میں جس قدر گرمی کی شدّت تھی اُس کی منظر کشی جس دِل نشین طریقے سے انیسؔ نے کی ہے، کسی اور کی بس کی بات شاید نہ ہو، ملاحظہ فرمائیے۔

آبِ رواں سے منھ نہ اُٹھاتے تھے جانور　　جنگل میں چُھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر　　خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھے نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں !

وہ لوں ، وہ آفتاب کی حدّت ، وہ تاب و تب　　کالا تھا رنگ دھوپ سے دِن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب　　خیمے جو تھے حبابوں کے ، تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک ، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دُھوپ سے پانی فرات کا

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار　　ایک ایک نخل جَل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گُل ، نہ لہکتا تھا سبزہ زار　　کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخِ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دِل سب کے سرد تھے
پتّے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گُماں　　انگارے تھے حباب ، تو پانی شرر فشاں
منھ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں　　تہہ میں تھے سب نہنگ ، مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ ، گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی ، کباب تھی

اُس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہؑ اُمم　　نہ دامنِ رسولؐ تھا ، نہ سایۂ علم

شعلے جگر سے آہ کے اُٹھتے تھے دم بہ دم　　اودے تھے لب ، زباں میں کانٹے ، کمر میں خم
بے آب تیسرا تھا جو دِن میہمان کو
ہوتی تھی بات بات میں لکنت زبان کو

لو ، پڑھ کے چند شعرِ رجز شاہِؑ دیں بڑھے　　گیتی کے تھام لینے کو روحؑ الامیں بڑھے
مانندِ شیرِ نر کہیں ٹھہرے ، کہیں بڑھے　　گویا علیؑ اُلٹتے ہوئے آستیں بڑھے
جلوہ دیا جری نے عروسِ مصاف کو
مشکل کشا کی تیغ نے چھوڑا غلاف کو

میر انیسؔ شاعری کے جملہ اصناف سُخن پر قادر تھے۔اُن کے محاسن کلام اور اُن کی شاعرانہ قدر و قیمت پر برِصغیرِ پاک و ہند میں موجود دنیائے ادب کے محققین اور دانشور بہت کچھ لکھ چکے ہیں، مزید لکھا جاتا رہے گا۔ یہ انیسؔ کا ایک شاہکار مرثیہ ہے جِس میں سانحۂ کربلا کے دوران اہلِ بیت اطہارؑ کو درپیش مشکلات کی تفصیل موجود ہے، جنھیں برداشت کرتے ہوئے، امامؑ نے تپتی ہوئی دھوپ میں گرمی کی ناقابل برداشت شدّت، بھوک اور پیاس کے ساتھ، جوان بیٹوں، بھائیوں، عزیزوں اور وفادار اصحاب اور جان نثار ساتھیوں کے لاشوں کو اُٹھایا۔اور پھر ایک لشکرِ جرّار کے سامنے نواسہِ رسولؐ نے سینہ سپر ہو کر ایسی جنگ لڑی کہ لشکر اشقیا کے کچھ سپاہی بھاگ کر کوفے کے شہر تک پہنچ گئے۔ جو میدان میں رہے اُن میں بھی ایسی ہلچل مچ گئی کہ سنبھلے نہیں پا رہے تھے۔ لیجیے ایسے دو بند ملاحظہ فرمائیے ۔

آئے حُسینؑ یوں کہ عقاب آئے جِس طرح　　آہو پہ شیر ، شرزۂ غاب آئے جِس طرح
تابندہ برق سوئے سحاب آئے جِس طرح　　دوڑا فرس نشیب میں آب آئے جِس طرح
یوں تیغِ تیز کوند گئی اُس گروہ پر
بجلی تڑپ کے گرتی ہے جِس طرح کوہ پر

اللہ رے لڑائی میں شوکت جناب کی　　سونلائے رنگ میں تھی ضیا آفتاب کی
سوکھے وہ لب ، کہ پنکھڑیاں تھیں گلاب کی　　تصویر ذوالجناح پہ تھی ، بوترابؑ کی
ہوتا تھا غل جو کرتے تھے نعرے لڑائی میں
بھاگو ، کہ شیر گونج رہا ہے ترائی میں

اِس طرح کی مکمل منظر نگاری نکتہ بہ نکتہ موبمو ایسے شخص کا کرنا جو خود اِن مناظر کا چشم دید نہ ہو کیسے ممکن ہو سکتا تھا؟ اِنہی حالات کے پیش نظر برصغیر کے ممتاز دانشور عالم دین اور پُرمغز شاعر علامہ کوثر نیازی نے ایک موقع پر بجا ارشاد فرمایا تھا، کہ لوگ کہتے ہیں کہ کربلا میں امامِ حُسینؑ کے بہتّر ساتھی تھے، لیکن میرا ایمان ہے کہ امامؑ کے بہتّر نہیں تہتّر ساتھی تھے اور تہتّر واں روح انیسؔ تھی، کربلا اُن کے سامنے تھی اور وہ اُس میدان میں اِسی طرح موجود تھی، جِس طرح اصحاب حُسینؑ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اِس قدر درست منظر نگاری کرنا کسی ایسے شخص کے لیے ممکن نہ تھا،

جس نے خود اِن حالات کو بہ چشم خود نہ دیکھا ہو۔ کربلا میں امام حُسین علیہ السلام کے تہتّر ساتھی ہونے کا اعتراف تو کراچی میں مقیم رثائی ادب کے ایک اور نامور شاعر خالد عرفان نے بھی اپنے مرثیہ ''خون اور خوشبو'' میں یوں کیا ہے ۔

کِس طرح کا شبیرؑ کا رہوارِ سفر تھا　　یہ برق تھا ، پارہ تھا ، ستارا تھا ، شرر تھا
جِس کو نہ ہواؤں کا ، نہ صحراؤں کا ڈر تھا　　چل جائے تو شمشیر تھا ، ٹھہرے تو سِپر تھا
دریاؤں میں کشتی تھی ، ہواؤں میں پری تھا
مولا کے رفیقوں میں تہتّر واں یہی تھا

فرق اتنا سا ہے کہ خالد عرفان نے اپنے اِس مرثیہ میں تہتّر واں ساتھی امام علیہ السلام کے باوفا رہوار ذوالجناح کو قرار دیا ہے، مجھے اِن دونوں تخیّلات سے بجا طور پر اتفاق ہے، اور میں اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ کربلا میں روحِ انیسؔ اور ذوالجناح کے ساتھ امام حسینؑ کے چوہتّر ساتھی تھے۔ جو اِس میدانِ کارزار میں ہمہ وقت موجود رہے ہیں۔ یہ ماننا پڑیگا کہ جِس قدر واقعاتِ کربلا کو تسلسل کے ساتھ مدلّل ، سلیس اور عام فہم طریقے سے بھرپور جوشِ تکلّم کے ساتھ میر ببر علی انیسؔ نے بیان کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میر انیسؔ واقعۂ کربلا کے جزئیات اور تفصیلات سے بخوبی واقف تھے۔ اِسی لیے اُن کے مرثیوں کی تاثیر سننے والوں کے دلوں کو پگھلا کر آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت ٹپکتے ہیں اور لبوں سے آہ آہ کی صدائیں بے ساختہ نکل پڑتی ہیں۔ میر انیسؔ علیہ الرحمہ کو جو مقام اور شناخت رثائی ادب میں حاصل ہوئی وہ کسی اور صنفِ سخن کی نسبت اِس قدر ممتاز ہے کہ صاحبانِ علم و ادب کے نزدیک آپ لسان الغیب ہو گئے۔ یہاں تک کہ اُن کے ہم عصر اور رثائی ادب کے بلند ترین شاعر مرزا سلامت علی دبیرؔ نے اُن کی رحلت پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے ۔

داد خواہم　یا غیاث المستغیثین الغیاث　　از کہ دل مایوس گردد بے سخنور بے انیسؔ
آسماں بے ماہِ کامل سدرہ بے روحؑ الامیں　　طور سینا بے کلیم اللہ ، منبر بے انیسؔ

یہ مرزا سلامت علی دبیرؔ کی جانب سے میر ببر علی انیسؔ کی وفات پر تحریر کردہ منظوم خراج عقیدت کے ابتدائی اور آخری اشعار ہیں، جو فارسی زبان کے ۱۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ آخری شعر ابجد کے حساب سے ہندسوں میں منتقل کرنے پر اُن کی تاریخِ وفات نکلتی ہے۔ اِسی طرح میر انیسؔ کے بھائی میر مونسؔ نے اپنے بھائی کی رحلت پر ایک قطعہ یوں تحریر کیا ہے ۔

افسوس دِلا ! انیسؔ مغفور نہیں　　ہر چشم لہو روئے تو کچھ دور نہیں
تارے بھی ہیں ، خورشید بھی ہے ، ماہ بھی ہے　　آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں ، وہ نور نہیں

❁❁❁❁

مراثیٔ انیسؔ کے نسائی کرداروں کا مطالعہ

(تہذیب کے تناظر میں)

ممتاز فاطمہ کاظمی

کیا بتائیں کہ کیا ہیں میر انیسؔ　　فکر کی انتہا ہیں میر انیسؔ
کربلا نشر گاہِ دینِ خدا　　ناشرِ کربلا ہیں میر انیسؔ
آسمانِ ادب کے کاہکشاں　　آپ کے نقشِ پا ہیں میر انیسؔ
مر نہیں سکتے رہتی دنیا تک　　بے نیازِ قضا ہیں میر انیسؔ
ہو گئے ہوں گے دو سو سال مگر　　ہر صدی کی صدا ہیں میر انیسؔ
استعارہ ہیں مرثیے کا آپ　　یعنی خود مرثیہ ہیں میر انیسؔ
نازشِ شیعیانِ پاک و ہند　　میرؔ و غالبؔ ہیں یا ہیں میر انیسؔ
مرثیے کا ہے میرِ قافلہ کون　　ہر کسی نے کہا، ہیں میر انیسؔ
میر ضاحکؔ ہوں یا خلیقؔ و حسنؔ　　فخر ہر ایک کا ہیں میر انیسؔ
ہیں سفینہ رثاء کا مرزا دبیرؔ　　ناخدائے رثاء ہیں میر انیسؔ
جس کو مشکل ہو مدحِ حیدرؑ میں　　اس کے مشکل کشا ہیں میر انیسؔ
کیوں نہ سرسبز ہو زمینِ رثاء　　اس کی آب و ہوا ہیں میر انیسؔ
کاروانِ ثنائے آلِ نبیؐ　　تیری بانگِ درا ہیں میر انیسؔ
خلد میں درمیانِ معصومین　　دیکھا مدحت سرا ہیں میر انیسؔ
ماضی و حال اور مستقبل　　علم و تہذیب کا ، ہیں میر انیسؔ
دین و مذہب ہوں یا ہوں علم و ادب　　شعبہ ہو کوئی سا ، ہیں میر انیسؔ
زہر کو قند میں بدل ڈالیں　　ایسے شیریں نوا ہیں میر انیسؔ
سوز خوانی یا مرثیہ گوئی　　سبطِ جعفر ہیں یا ہیں میر انیسؔ

ایک ادب سے شوق رکھنے والے قاری کے لیے عام ادبی مذاق اور پسندیدگی کے بدلتے ہوئے معیار اور ایک شاعر کی قدر و قیمت میں عہد بہ عہد اتار چڑھاؤ کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے اور ان تبدیلیوں کی ہم کو سمجھنے اور ایک ادبی شاہکار کو مختلف زمانوں کے زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرنا اور وقتاً فوقتاً اپنے ادبی سرمایہ کا جائزہ لینا اور خاص طور پر ادب کے ان گوشوں کا از سرِ نو تجربہ کرنا جو کسی زمانے میں بہت روشن تھے اور اب زمانے کے پیچ و خم میں اوجھل ہو گئے ہیں۔ میں نہ صرف ادبی مذاق کی تربیت کرنے اور ادبی روایات کا شعور حاصل کرنے کے لیے ایک ضروری مشق ہے بلکہ اپنے عصر کے لیے ایک صحت منداور پہلو دار روایتی پس منظر کی تعمیر اور عصری تخلیقات کے لیے صحیح نقد و نظر کا معیار قائم کرنے کے سلسلے میں ایک قیمتی خدمت بھی ہے۔ ۱

مراثیِ انیس کا مطالعہ اگر تہذیب کے تناظر میں کیا جائے اور ان کی شعری قوتِ تخلیق کو ان کے مرثیوں کی ہی وساطت سے دریافت کیا جائے تو شاید کوئی ادبی بد دیانتی نہ ہو۔ جامع اردو لغت میں تہذیب کے معنی پاک کرنا، اصلاح کرنا، اصلاح، درستگی، آراستگی، شائستگی، خوش اخلاقی، انسانیت، سوسائٹی کے اصول اور رسم و رواج (انگریزی لفظ Culture کا ترجمہ) ۲

فرہنگِ آصفیہ میں تہذیب کے معنی ہیں: شائستگی، خوش اخلاقی، اہلیت، لیاقت، آدمیت، تربیتِ انسانیت اور شرافت۔ ۳

اردو لغت (تاریخی اصولوں پر) جلد پنجم میں تہذیب کی تعریف کچھ اس طرح کی گئی ہے: (۱)۔ ذہنی ترقی جو زندگی کے چلن میں کارفرما ہو، شائستگی، ادب و تمیز (۲) طرزِ معاشرت، رہنے سہنے کا انداز، تمدن۔ ۴

اردو میں کئی الفاظ اور اصطلاحیں ایسی ہیں کہ انہیں تقریباً مترادف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ تہذیب و ثقافت کو بھی اکثر اوقات ہم معنی ہی سمجھا جاتا ہے۔ ثقافت ایک محدود مظہرِ حیات کا نام ہے جب کہ تہذیب کا پھیلاؤ مقامیت سے نکل کر کسی مکمل خطۂ ارض کی پہچان بن جاتا ہے۔

انیسؔ کی شاعری بھی ایک تہذیب ہے۔ یہ اودھ کی تہذیب ہوتے ہوئے بھی صرف اودھ کی تہذیب نہیں ہے۔ اس میں وہی پھیلاؤ، وہی جاذبیت، وہی حسن ہے، جو کسی بھی آدمی کی ملکی اور قومی حیثیت کو ثانوی بنا کر اسے کائناتی بنا دیتا ہے۔ بیگانہ یگانہ بن جاتا ہے۔ عرب کے حسینؑ ساری دنیا کے حسینؑ بن جاتے ہیں۔ بڑی تہذیب ہڈیوں کا ڈھانچہ نہیں گوشت پوست کا جیتا جاگتا جسم اور سوچتا دماغ ہوتی ہے۔ ۶

پروفیسر مجتبیٰ حسین کے خیال میں:

''ان کی دنیا اردو کی شاعری کی جانی پہچانی دنیا سے اگر یکسر نہیں تو بڑی حد تک مختلف ہے۔ جس میں غزل، قصیدہ، مثنوی کی ہلکی ہلکی آوازیں کبھی کبھی ذرا دیر کے لیے سنائی دیتی ہیں مگر پھر جلد ہی اس دنیا کی بلند ترین آوازوں میں ڈوب جاتی ہیں۔ اس کی آب و ہوا، اس کی مٹی، اس کی پیداوار، اس کے رسم و رواج، آدابِ زندگی ہماری شاعری کے موسم، خو بو اور رہن سہن سے الگ ہیں۔ اس کی آب و ہوا گرم، بے حد گرم، مٹی سرخ اور یہاں بے سر لوگ اگتے ہیں۔ یہاں کے رسم و رواج میں دانا پانی بند ہے اور آدابِ زندگی میں لازم قرار دیا گیا ہے کہ آدمی نفس و اموال و ثمر کو لے کر بہ رضا و رغبت قربان گاہ پر پہنچ جائے۔ مثنوی کے شہزادے شہزادیاں، قصیدے کے سلاطین اور غزل کے لیلیٰ مجنوں، قیس فرہاد، رقیبان، روسیاہ اور رندانِ باصفا یہاں نہیں ملتے۔ یہاں بالکل دوسرے قسم کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ مائیں بہنیں،

بیٹے، بھائی، بھانجے، بھتیجے، باپ، دوست، احباب ایک طویل اور صبر آزما سفر کرتے ہوئے اس بے آب و گیاہ سرزمین پر پڑاؤ ڈال دیتے ہیں جس کا نام کربلا ہے جہاں تشنگی سے ایک ایسا چشمہ پھوٹتا ہے جو آنے والی صدیوں کو مستقلاً سیراب کرتا رہتا ہے۔ ۷

انیسؔ نے کربلا کے واقعات کو لکھنؤ کے جانے پہچانے معاشرے اور ہندوستانی تہذیب کے پس منظر میں پیش کر کے اس صنفِ سخن کو ہر اعتبار سے مقبولِ خاص و عام بنا دیا ہے۔ اگر یہ صورت وہ اختیار نہ کرتے تو لکھنؤ اور پورے ہندوستان کے عوام جو عرب کی تہذیب و تمدّن سے قطعاً ناواقف تھے ان کے لیے اردو مرثیہ ایک اجنبی چیز ہوتا۔ جس کو وہ حیرت سے تو سن سکتے تھے مگر اس سے کوئی اثر قبول نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح مجالسِ عزا اور مرثیہ کا مقصد ہی ختم ہو جاتا۔ ۸

میر انیسؔ کے تہذیبی شعور کے متعلق شارب ردولوی کہتے ہیں:

''انیسؔ و دبیرؔ'' کے مراثی کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ انہوں نے اسے عصری تہذیب میں اس طرح ڈھال دیا کہ سامع بھی اپنی شخصیت کو اسی کا ایک کردار محسوس کرنے لگتا تھا اور ہر واقعہ کا چشم دید گواہ بن جاتا تھا۔''

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ''میر انیسؔ اگر ہندوستانیوں کی نظروں کے آگے اگر عرب عورت کا مکمل نقشہ کھینچ دیتے تو ان کے کلام کو اس قدر مقبولیت نہیں ہوتی کیونکہ ہندوستانی ان کی پیش کردہ ہستیوں کو اپنی چیز نہ سمجھ کر ان سے غیریت برتتے اور یہ مغائرت انہیں ان ہمدردیوں اور اس پر خلوص محبت سے روکے رہتی جو میر انیسؔ کے پڑھنے کے بعد حضرتِ زہراؑ، حضرتِ زینبؑ وغیرہ کے لیے دلوں میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے میر انیسؔ نے جن نسائی سیرتوں کو پیش کیا ہے ان میں ایک حد تک ہندوستانی فطرت کو بھی شامل کر لیا ہے۔

اردو مرثیے میں ہندوستانی تہذیب کے حوالے سے مولانا سیّد باقر صاحب شمسؔ لکھنوی کہتے ہیں کہ:

''مرثیے کی ایک خصوصیت یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ واقعہ عرب کا ہے، کلچر ہندوستان کا جو ہندو مسلم کلچر کا آمیزہ ہے۔ مرثیے میں یہ کلچر موجود ہے۔''

ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ انسانی کرداروں کی تشکیل و ترتیب میں ثقافت و تہذیب دونوں کے عوامل کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔

میر انیس کے نسائی کرداروں کی تہذیبی سرگرمیوں کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہاں مختلف انسانی رشتوں کی قوس قزح میں ان کی تربیت، طرزِ تخاطب اور رسم و رواج دکھائی دیتے ہیں۔ انسانی رشتوں کی یہ قوس قزح بہت ہی دلکش ہے۔ ایک مثالی گھرانے میں بھائی بہن کی محبت، بھائی بھائی کی محبت، چچا بھتیجی/ بھتیجے کی محبت، دوست دوست کی محبت، آقا اور غلام کی محبت کے بے شمار اظہار بہت ہی سلیقے کے ساتھ اشعار کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ میر انیسؔ کے مرثیوں میں خواتین کا کردار کے حوالے سے ڈاکٹر پروین کاظمی کہتی ہیں کہ:

''جب ہم رسولِ اکرمؐ اور ان کی آلؑ کے گھرانے پر نظر ڈالتے ہیں تو عرب تہذیب کے اعلیٰ عناصر اور بنو ہاشم کی ثقافت کے نمایاں پہلو باہم آمیز نظر آتے ہیں۔ مراثی انیسؔ میں جو کردار ہمیں نظر آتے ہیں ان کے عمل، طرزِ حیات، اندازِ فکر اور آدابِ معاشرت ہی سے ہم ان کی صفاتِ اعلیٰ کا یقین کرتے ہیں۔''

مثل مشہور ہے کہ انسان کو حضر اور سفر میں پہچانا جا سکتا ہے۔ چنانچہ رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی زندگی جو مکّے اور مدینے سے وابستہ ہے تو وہ حضر

کی صورت ہے اور کربلا کے لیے قافلۂ حسینؑ کی روانگی ایک حیثیت سے ان دونوں زاویوں ہے وہ کرداری رخ سامنے آتے ہیں جنھیں ہم ثقافتی زندگی اور تہذیبی سرگرمی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

مہدی حسن احسن ''واقعاتِ انیسؔ'' میں لکھتے ہیں کہ: انیسؔ نے خاندانِ رسالتؐ کے مراسم اور طرزِ معاشرت کو ہندوستان کے ایک شریف خاندان کی طرز معاشرت کے مطابق دکھانے کا ارادہ کیا ہے اور پھر ان سوانح میں اپنی زبان اور شاعری کا اثر بھرا ہے۔ امامؑ کے گھرانے کی زبان اور باہم چھوٹے بڑوں کا حفظِ مراتب اور خاندانی مدارج کو کس قدر مہذب پیرائے میں نظم فرمایا ہے اور اسی تخیل نے کیریکٹر کی اصل شان دکھائی ہے۔

امام حسینؑ کے گھرانے میں فطری محبت کے زیرِ اثر ہمیں بہت سی مثالیں نظر آتی ہیں۔ اس مثالی گھرانے میں محبت کی سب سے بڑی مثال حضرت امام حسینؑ اور بی بی زینبؑ کی ہے۔ میر انیسؔ نے اس محبت کو اس طرح نظم کیا ہے:

سب بیبیاں موجود ہیں بچوں کو لیے پاس　　جو پوچھتا ہے وجہ تو کہتی ہیں بصد یاس
اک ایک کا اندیشہ ہے اک ایک کا وسواس　　لوگو مجھے شبیرؑ کے بچنے کی نہیں آس
مانگو یہ دعا غیب سے بے کس کی مدد ہو
صدقے کرو مجھ کو کہ بلا بھائی کی رد ہو

جب کہ بھائی بہن کی بے قراری اور تڑپ کو دیکھتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار اس انداز سے کرتے ہیں:

فرمایا بہن تم نے بنایا ہے یہ کیا حال　　ماتھا ہے بھرا خون میں بکھرے ہوئے ہیں بال
نہ سر پہ عصابہ ہے نہ چادر ہے نہ رومال　　پیٹو نہیں جیتا ہے ابھی فاطمہؑ کا لال
دم تن سے میرا گھٹ کے نکل جائے گا زینبؑ
رو لیجیو جب رونے کا وقت آئے گا زینبؑ

محبت کی دوسری اہم مثال حضرت زینبؑ اور حضرت عباسؑ کی ہے۔ میر انیسؔ حضرت زینبؑ کی زبانی حضرت عباسؑ جو فوجِ حسینی کے علمبردار ہیں، ان کی صفات کو اس مہارت سے نظم کرتے ہیں کہ حضرت عباسؑ کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے:

عاشق ، غلام ، خادمِ دیرینہ جانثار　　راحت رساں ، مطیع ، نمودار ، نامدار
فرزند ، بھائی ، زینتِ پہلو ، وفا شعار　　جرار ، یادگارِ پدر ، فخرِ روزگار
صفدر ہے شیر دل ہے بہادر ہے نیک ہے
بے مثل سینکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے

محبت کی تیسری اہم مثال حضرت فاطمہ صغریٰؑ اور حضرت علی اکبرؑ کی ہے، یہ محبت بھی درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ قافلۂ حسینی جب مدینے سے روانہ ہو رہا تھا اس وقت بی بی صغریٰؑ بھائی کی جدائی کے غم میں اشکبار ہیں، بھائی بھی مسلسل گریہ کر رہے ہیں۔ رخصت کے وقت کی کیفیت کو میر انیسؔ نے کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے:

ہاں ذکر یہ تھا آئے جو روتے ہوئے اکبرؑ　　چلّائی بہن بھائی کی چھاتی سے لپٹ کر
سرخ آنکھیں تھیں اور زرد تھا غم سے رخِ انور　　اس سینے کے ان ہاتھوں کے قربان یہ خواہر
فریاد ہے بن موت بہن مرتی ہے بھائی
تقدیر ہمیں تم سے جدا کرتی ہے بھائی

بھائی کا غمزدہ چہرہ اور آبدیدہ آنکھیں دیکھ کر بہن کے لہجے کا انداز ملاحظہ کیجیے:

بھیّا مری تنہائی پہ آنسو نہ بہاؤ　　ہرچند یہ مشکل ہے کہ جیتا ہمیں پاؤ
وہ دن ہو کہ پھر خیر سے اس شہر میں آؤ　　صدقے گئی جلد آنے کا وعدہ کیے جاؤ
عرصہ ہو تو خط لکھ کے طلب کیجیو بھائی
اب بیاہ میں مجھ کو نہ بھلا دیجیو بھائی

اس مثالی گھرانے میں محبت کی چوتھی اہم مثال، حضرت امام حسینؑ اور بی بی سکینہؑ کی ہے۔ بی بی سکینہؑ وہ شخصیت ہیں جنھیں امام حسینؑ نے نمازِ شب کی دعاؤں میں مانگا۔ آپ اپنی اس بیٹی سے شدید محبت کرتے تھے اور بیٹی بھی آپ کے بغیر ایک پل سکون سے نہیں رہتی تھی۔ امام حسینؑ وقتِ آخر جب رخصت کے کے لیے خیامِ حسینی میں آئے اس وقت کے منظر کو میر انیس نے اس طرح نظم کیا ہے:

زینبؑ کی وہ زاری وہ سکینہؑ کا بلکنا　　وہ چاند سا منھ اور وہ بندے کا چمکنا
وہ ننھی سی چھاتی میں کلیجے کا دھڑکنا　　حضرت کا وہ بیٹی کی طرف یاس سے تکنا
حسرت سے یہ ظاہر تھا کہ معذور ہیں بی بی
پیدا تھا نگاہوں سے کہ مجبور ہیں بی بی

مثالی گھرانے میں محبت کی پانچویں اہم مثال چچا اور بھتیجی یعنی حضرت عباسؑ علمبردار اور حضرت سکینہؑ بنت الحسینؑ کی ہے۔

حضرت عباسؑ کی شہادت کی خبر جب حضرت سکینہؑ کو ملتی ہے تو اس وقت جنابِ سکینہؑ کے حال سے متعلق بند ملاحظہ کیجیے:

کہتی ہے کبھی ننھے سے ہاتھوں کو وہ مل کر　　اب منھ نہیں دکھلائے گی بابا کو یہ دختر
کیوں مشک چچا جان کو دی وائے مقدر　　میرے لیے مجروح ہوا ان کا برادر

طرزِ تخاطب:

برِصغیر پاک و ہند کے مقامی معاشرے میں رشتوں کو مخاطب کرنے کے لیے جو الفاظ رائج تھے وہ بھیا، بہنا، عمو، والی، وارث، رانڈ وغیرہ ہیں۔ میر انیسؔ نے ان الفاظ کو اپنی شاعری میں استعمال کیا اور وہ کلچر بھی نمایاں کیا جس سے رشتوں کی بے ساختگی کا اظہار دکھائی دیتا ہے۔ میر انیسؔ نے حسبِ موقع جو الفاظ استعمال کیے وہ آج تک مستعمل ہیں مثلاً اماں، بابا، بھیا، بہنا، عمو، لفظ رانڈ اب معاشرے میں رائج نہیں متروک ہو چکا ہے۔ لیکن میر انیسؔ نے ہندوستانی تہذیب کے پس منظر میں اس لفظ کو لاچار اور بے کس کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

امام حسینؑ نے مدینے سے سفر کا ارادہ کیا تو یہ فیصلہ بھی کیا کہ بی بی صغریٰؑ کو اپنے ہمراہ نہیں لے کر جائیں گے۔ جنابِ فاطمہ صغریٰؑ اپنے بابا

سے اس طرح درخواست کرتی ہیں:

میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو　　بابا مجھے فضہؑ کی سواری میں بٹھا دو

جب قافلۂ حسینی روانہ ہونے لگتا ہے تو آپ اپنی خواہش کا اظہار اپنی والدۂ گرامی سے اس طرح کرتی ہیں، انیسؔ کی زبانی سنیے:

قربان گئی آخری دیدار دکھا دو　　امّاں مجھے اصغرؑ کو پھر اک بار دکھا دو

خیامِ حسینیؑ جب نہر سے ہٹائے گئے اور حضرت عباسؑ واپس امام حسینؑ کے خیمے میں آئے تو جنابِ سکینہؑ کے جذبات کو انیسؔ نے کچھ اس طرح نظم کیا:

منھ رکھ کے منھ پہ بالی سکینہؑ نے یہ کہا　　عمّو کو میرے پھیر کے لایا مرا خدا

ثانیٔ زہراؑ جب نوکِ نیزہ پر اپنے بھائی کا سر دیکھتی ہیں تو انیسؔ اس کیفیت کو اس طرح نظم کرتے ہیں:

بھیّا سلام کرتی ہے خواہر جواب دو　　چلّا رہی ہے دخترِ حیدرؑ جواب دو

تم تشنہ دہن ذبح ہوئے مجھ کو یہ غم ہے　　اور آپ کو بھینا کی اسیری کا الم ہے

حضرت قاسمؑ کی لاش لے کر جب امامِ مظلوم واپس آتے ہیں تو میر انیسؔ اس وقت کی جو منظر کشی کرتے ہیں وہ ملاحظہ کیجیے:

در پہ خاموش کھڑی تھی جو بنے کی مادر　　جا کے خیمے میں یہ رانڈوں سے کہا رو رو کر

لاش آتی ہوئی دیکھی تو ہوا دل مضطر　　بیبیوں میں تمھیں شادی کی یہ دیتی ہوں خبر

عشق و راحت کی کوئی آن میں رات آتی ہے
دھوم سے میرے پر ارماں کی بارات آتی ہے

رسم ورواج:

کربلا میں موجود خواتین مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ہیں۔ میر انیسؔ فطرتِ انسانی کے بہت راز داں ہیں۔ وہ جانتے ہیں خواتین اپنے بھائی اور بیٹوں کے سر پر سہرا سجانے کی آرزومند ہوتی ہیں۔ میر انیسؔ ماؤں اور بہنوں کے ارمانوں کو اس دور کے رسم ورواج کے مطابق اس سلیقے سے نظم کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شب کٹتی ہے کس طرح سے دن ڈھلتا ہے کیوں کر　　پوچھے کوئی ماں سے کہ پسر پلتا ہے کیوں کر

بہن اپنے بھائی کے سر پر سہرا دیکھنے کی خواہش مند ہے اور اپنے بھائی سے اپنی آرزو کا اظہار کر رہی ہے:

وہ دن ہو کہ بوٹا سی تمھاری دلھن آئے　　سب پھولوں کے گہنے میں سنواری دلھن آئے

جلدی کہیں یا حضرتِ باری دلھن آئے　　تم جیسے ہو بس ویسی ہی پیاری دلھن آئے

ہمشیر کو تربت میں نہ ترسائیو بھائی
بھابھی کو میری قبر پہ لے آئیو بھائی

ہندوستانی تہذیب میں خوشی کے موقع پر ایک رسم ''نیگ'' لینے کی ہے۔بہنیں بھائی کی شادی کے موقع پر ہلکا پھلکا جھگڑا کرتی ہیں اور ''نیگ''،لیتی ہیں۔حضرت زینبؑ کے دونوں فرزند چھوٹے تھے۔حضرت سکینہؑ اپنی پھوپھی جنابِ زینبؑ سے محبت بھرے انداز میں ''نیگ'' لینے کی فرمائش کررہی ہیں:

حق ہے مرا جھگڑا میں کیے بن نہ رہوں گی　　خوش ہوں یا خفا نیگ لیے بن نہ رہوں گی

حضرت زینبؑ ایک ماں ہیں۔ماں کی تمنااورانیسؔ کا لہجہ ملاحظہ کیجیے:

بچوں تمھیں قسمت نے نہ پروان چڑھایا　　حسرت رہی ماں نے نہ تمھیں دولھا بنایا

حضرت علی اکبرؑ کی والدہ کو بھی اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی تمنا تھی۔حضرت علی اکبرؑ جب شہید ہوجاتے ہیں تو ماں کے جذبات کی عکاسی انیسؔ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

اب گھر میں مرے کس کی دلھن آئے گی اکبرؑ　　ماں بیاہ کا جوڑا کسے پہنائے گی اکبرؑ

ہئے ہئے نہ ترا بیاہ رچانا ہوا نصیب　　پوتے کو گود میں نہ کھلانا ہوا نصیب
ہئے ہئے نہ دلھن بیاہ کے لانا ہوا نصیب　　شادی کے بدلے خاک اڑانا ہوا نصیب

ندی لہو کی چاند سی چھاتی سے بہہ گئی
بہنوں کو نیگ لینے کی حسرت ہی رہ گئی

ہندوستانی تہذیب میں ایک رسم یہ ہے کہ ہندوؤں میں بیوہ کی چوڑیاں توڑ دی جاتی ہیں۔رنڈسالہ پہنادیا جاتا ہے۔ازدواجی تعلق پیدا کرلیا تو سارے کنبے میں مطعون ہوجاتی ہے۔لوگ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں۔ہندوستان کے مسلمان شرفاء کا بھی یہی مزاج بن گیا تھا۔میرانیسؔ نے رنڈاپے کے دکھ اور کیفیات وجذبات کو مختلف انداز میں نظم کیا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

میں رانڈ ہوئی دل میرا دیتا ہے گواہی　　پردیس میں آئی میرے بچوں کی تباہی

اس شور میں زینبؑ نے کہا شہؑ سے کہ جاؤ　　زینبؑ نے کہا بانوئےؑ بے کس ادھر آؤ
اب زیرِ علم زوجۂ عباسؑ کو لاؤ　　پہلے جو مناسب ہو تو رنڈسالہ پنھاؤ

تقدیر نے لوٹا ہے اس آفت کے سفر میں
اک دن تھا کہ یہ بن کے دلھن آئی تھی گھر میں

زینبؑ سے عرض کرتی ہے رو رو کے دل فگار　　کچھ دم الجھ رہا ہے نہیں قلب کر قرار
ہئے ہئے یہ شور نہر پہ کیسا ہے؟ میں نثار　　گرتی ہے ردا کانپنے میں سر سے بار بار

جن خواتین کو کربلا میں رنڈاپہ کا سامنا کرنا پڑا اس میں سب سے زیادہ اہمیت امامِ عالی مقام کی بیٹی بی بی کبریٰؑ کی ہے۔جنھیں حضرت قاسمؑ

سے منسوب کیا جاتا ہے۔ حضرت قاسمؑ کی جب پامال شدہ لاش خیمے میں آئی ہے، اس بند میں انیسؔ نے جس طرح بزرگوں کی شان، رسم و رواج نظم کیے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

بانوؑ نے کہا لاش پہ لے آؤ دلھن کو　　دولھا کا جو کچھ حال ہے دکھلاؤ دلھن کو
اب شرم سے کیا فائدہ سمجھاؤ دلھن کو　　جوڑا کوئی رنڈسالے کا پنھاؤ دلھن کو
صف ماتمی بچھوا کے یہ مسند تو اٹھاؤ
اے صاحبو نتھ ناک سے کبریؑ کی بڑھاؤ

ایک رات کی بیاہی دلھن کے ارمانوں کو میر انیسؔ نے اس طرح نظم کیا ہے:

صاحب بتا تو دو تمھیں رونے میں کیا کہوں　　پیاسا کہوں ، شہید کہوں یا بنا کہوں
بے کس کہوں کہ فدیہ راہِ خدا کہوں　　دولھا کہوں کہ قاسمؑ گلگوں قبا کہوں
ماتم بھی یوں تو ہوتا ہے شادی بھی ہوتی ہے
اک شب کی رانڈ دولھا کو کیا کہہ کے روتی ہے

پروفیسر مجتبیٰ حسین انیسؔ کی شاعری کے متعلق کہتے ہیں:

انیسؔ کے لہجے کی پاکیزگی اور نفاست اردو شاعری کا بے خزاں پھول ہے۔ انیسؔ سے زیادہ شاعری کے رموز و نکات سے آگاہ دنیا کے کم ہی شاعر ہونگے۔ شاعری میں کتنی گہرائی ہوسکتی ہے یا ہونی چاہیے انیسؔ نے بڑے حسنِ بیاں کے ساتھ ان کی توضیح کردی ہے۔ انیسؔ کہتے ہیں:

روز مرہ شرفاء کا ہو سلاست ہو وہی　　سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی　　یعنی موقع ہو جہاں جس کا ، عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہو ، مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے　　تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے　　زیب ہے خال سیہ چہرہ گلرو کے لیے
داناں کس کہ فصاحت بہ کھلا مے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اشعار کے ذریعے انیسؔ نے اپنے کلام کی خصوصیت گنائی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مقتضیات پر اس سے بہتر نہیں لکھا جاسکتا۔ روزمرہ کی پاکیزگی، زبان کی سلاست، لہجے کی متانت، ناقبلِ فہم صنعتوں کے استعمال سے گریز اور عبارت کا با موقع ہونا، یہ اتنی بڑی باخبری ہے جو دنیا کے کسی بھی بڑے شاعر کے لیے سرمایۂ افتخار ہوسکتی ہے۔ انیسؔ کے مرثیے کائنات کی آواز ہیں، کائنات ایک ہے مگر اس کے مظاہرے بے شمار ہیں، انیسؔ کی شاعری کا بنیادی اسلوب ایک ہے مگر یہ ایک اسلوب ہزاروں لہجوں، ہزاروں اندازوں میں تبدیل ہو

جاتا ہے۔ یہ کبھی شام ہے، کبھی رات ہے، اس میں بچوں کی زبان کی معصومیت ہے، جوانوں کے مزاج کی تازگی اور جرأت ہے۔ بوڑھوں کی فکری پختگی ہے۔ یہ ماں کی محبت، باپ کی شفقت اور بہن کا پیار ہے۔ اتنی ہمہ گیری، اتنا تنوع اردو شاعری میں کہیں نظر نہیں آتا، انیسؔ نے ایک جگہ کہا ہے:

لہجہ سنو زبانِ فصاحت نواز کا　　تارِ نفس میں سوز ہے مطرب کے ساز کا

انیسؔ کے لہجے کو ملاحظہ کیجیے: آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، باپ بیٹی کی گفتگو دیکھیے۔ باپ میدانِ جنگ میں جا رہا ہے اور یہ یقین ہے کہ پلٹ کر نہ آئے گا، باپ بیٹی کو سمجھا رہا ہے کہ:

جانا ہے دور ، شب کو جو آنا نہ ہو ادھر　　پہلے پہل ہے آج شبِ فرقتِ پدر
ضد کر کے روئیو نہ ہمیں چاہتی ہو گر　　سو رہیو ماں کی چھاتی پہ غربت میں رکھ کے سر
راحت کے دن گزر گئے، یہ فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو جو یتیموں کا طور ہے

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولی وہ تشنہ کام　　آنکھوں سے خوں بہا کے یہ کہنے لگے امامؑ
بتلایئے مجھے کہ یتیمی ہے کس کا نام　　کھل جائے گا یہ درد و الم تم پہ تا بہ شام
بی بی نہ پوچھو کچھ یہ مصیبت عظیم ہے
مر جائے جس کا باپ وہ بچہ یتیم ہے

ایک نظر اس ماں کو بھی انیسؔ کی نظر سے دیکھیے جس کے سامنے دونوں بچوں کی لاشیں لائی گئی ہیں:

بھائی کے آگے لاشوں پہ جا کے کروں میں بین　　گر مر گئے تو مر گئے وہ دونوں نورِ عین
بے صبر ہے یہ دل میں کہیں گے مجھے حسینؑ　　کیوں کر چلوں کھڑے ہیں شہنشاہِؑ مشرقین
روؤں گی میں تو پھر علی اکبرؑ بھی روئیں گے
صدمہ یہ مجھ کو ہے کہ برادر بھی روئیں گے

یہ شہیدوں کی ماں ہے، اس تصویر میں نور ہے، برکت ہے، طہارت ہے۔ یہی ماں اپنے بیٹوں کی لاش پر بین کرتی ہیں، بند دیکھیے:

بچو تمہی بتاؤ میں غربت میں کیا کروں　　بھائی گھرا ہوا ہے اس آفت میں کیا کروں
نے گھر نے وطن ہے مصیبت میں کیا کروں　　فاقوں میں تشنگی میں مصیبت میں کیا کروں
راحت نہ روح کو نہ کسی دل کو صبر ہے
پانی نہ غسل کو نہ کفن ہے نہ قبر ہے

یہ وہ ماں ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ جو انسانی زندگی کے تلف ہو جانے پر نوحہ کناں ہے۔ انیسؔ کا لہجہ اس موقع پر نوحہ ہے، بین ہے، مرثیہ ہے، دکھ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انیسؔ کے مرثیے انسانی رشتوں کے احترام اور تحفظ کے ساتھ نسائی رشتوں کے احساسات و

جذبات کی سب سے بڑی اور اہم دستاویز ہیں۔

حواشی:

(۱) پروفیسر کرار حسین، مرزا دبیر از سرِ نو مطالعہ کرنے کی ضرورت، مشمولہ رثائی ادب، شمارہ ۳۵، کراچی: محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلیکیشنز، ۲۰۱۳ء، ص ن ۳۳۔ (۲) جامع اردو لغت، مرتبہ پروفیسر نصیر احمد خان، لاہور: زبیر بکس ۲۰۱۹ء، ص ن ۳۸۱۔ (۳) ڈاکٹر پروین کاظمی، میر انیسؔ کے مرثیوں میں خواتین کا کردار، حیدرآباد: مدینہ کمپیوٹر اینڈ پرنٹنگ ایجنسی، ۲۰۱۴ء، ص ن ۳۴۔ (۴) ایضاً۔ (۵) ایضاً۔ (۶) پروفیسر مجتبیٰ حسین، انیس کی یاد میں، مشمولہ رثائی ادب، شمارہ ۳۶، کراچی: محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلیکیشنز، ۲۰۲۱ء، ص ۵۱۔ (۷) انیس نطق عظیم مشمولہ رثائی ادب، محولہ بالا، ص ۱۷۔ (۸) ساحر لکھنوی، مرثیوں میں لکھنؤ کے شیعوں کے آداب و رسم و رواج مشمولہ نگارشات، ساحر، کراچی: آثار و افکار اکادمی پاکستان، ۲۰۱۹ء، ص ن ۱۹۷۔ (۹) ایضاً ص ۱۹۶۔ (۱۰) ایضاً ۱۹۷، ۱۹۸۔ (۱۱) ایضاً ص ۱۹۸۔ (۱۲) ڈاکٹر پروین کاظمی، محولہ بالا، ص ۱۹۵۔ (۱۳) ایضاً۔ (۱۴) ساحر لکھنوی، محولہ بالا، ص ۱۹۸۔ (۱۵) ایضاً، ص ۱۹۹۔ (۱۶) ایضاً ص ۸۳۔ (۱۷) ایضاً ص ۸۴۔ (۱۸) ایضاً ص ۸۶، ۸۷۔ (۱۹) ایضاً ص ۸۷۔

❁❁❁❁

رباعی

گرتے ہیں اشک گوہرِ نایاب کی طرح　　آنکھوں کی سیپیوں سے کہ پلکوں سے ٹوٹ کے
اتنے ہی دردناک کیے مرثیے رقم　　روتے ہیں مجلسوں میں عزادار پھوٹ کے

اشفاق نجمیؔ

رباعی

وزن اخرب

زیبا ہے کہو اسکو رئیسِ اردو　　استاد سمجھتے ہیں جلیسِ اردو
تہذیبِ سُخن جس نے جہاں کو بخشی　　الفاظ کا داتا ہے انیسؔ اردو

قیصر عباس قیصر

حضرت عباسؑ ابنِ علیؑ۔ میر انیسؔ کے کلام کی روشنی میں

ذیشان زیدی

خدائے سخن میر ببر علی انیسؔ پر کچھ لکھنا سورج کو آئینہ دکھانے کے مترادف ہے۔ ایمان، شجاعت اور وفا کی بلندیوں پر جب نگاہ کرتے ہیں تو وہاں ایک شخص نظر آتا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی جو فضل و کمال میں، قوت اور جلالت میں اپنی مثال آپ ہے۔ جو اخلاص، استحکام، ثابت قدمی اور استقلال میں نمونہ ہے اور ہر اچھی صفت جو انسان کی بزرگی کو عروج عطا کرتی ہے اس شخص میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک لشکر کا علمبردار نہیں بلکہ مکتبِ شہادت کا سپہ سالار ہے جس نے تمام دنیا کو درسِ اطاعت، وفاداری، جانثاری اور فداکاری دیا ہے اور وہ حیدرِ کرارؑ کا لختِ جگر حضرت عباسؑ ہے۔

واقعۂ کربلا میں حضرت عباسؑ علمدار کے لافانی کردار کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ میر انیس کے کئی شاہکار مرثیے حضرت عباسؑ کے حال میں ہیں جو خصوصاً تحت اللفظ خوانی کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ اس انتخاب میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ ولادت حضرت عباسؑ سے شہادت حضرت عباسؑ تک سلسلہ قائم رہے۔ اس لیے عمداً ایسا بھی کرنا پڑا ہے کہ ایک مرثیے کے بند میں دوسرے مرثیے کے بند ملا کے ترتیب دیے ہیں تا کہ اختصار بھی قائم رہے اور بات ترتیب وار آگے بڑھتی رہے

حضرت عباسؑ کی ولادت:

حضرت فاطمہؑ کی شہادت کے بعد بی بی ام البنینؑ کے ساتھ امام علیؑ کا عقد ہوا۔ بی بی ام البنینؑ کو ہمیشہ ایک فرزند کی تمنا تھی

جس روز سے آئی تھی یداللہ کے گھر میں　　رہتی تھی شب و روز تمنائے پسر میں

ممتاز غلاموں میں جو گل فام ہو میرا　　زہراؑ کی کنیزوں میں بڑا نام ہو میرا

جلد اس کو ثمر نخلِ دعا کا ہوا حاصل　　اللہ نے بخشا پسرِ نیک شمائل

دکھلائی جو تصویرِ پسر بختِ رسا نے　　عباسؑ علیؑ نام رکھا شیرِ خدا نے

یعنی آفتاب ۳ شعبان کو طلوع ہوا اور ماہتاب ۴ شعبان کو۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں:

آئینۂ تصویرِ یداللہ ہے عباسؑ　　شبیرؑ تو خورشید ہے اور ماہ ہے عباسؑ

اور حسب و نسب ایسا منفرد ہے کہ:

اللہ رے نسب واہ ری توقیر زہے جاہ　　دادا تو ابوطالبؑ غازی سا شہنشاہ

عم جعفرِؑ طیار ہزبرِ صفِ جنگاہ　　اور والدِ ماجد کو جو پوچھو اسداللہ
فخر ان کو غلامی کا حسینؑ ابنِ علیؑ کی
مادر کو کنیزی کا شرف بنتِ نبیؐ کی

حضرت عباسؑ کی اپنے پدر علیؑ ابن طالبؑ سے اس قدر مماثلت تھی کہ:

الفت وہی ، حیا وہی ، مہر و وفا وہی　　طاعت وہی ، وقار وہی ، اتقا وہی
بخشش وہی ، کرم وہی ، جود و سخا وہی　　جرات وہی ، جلال وہی ، دبدبہ وہی
خُلق اس میں جواں مردیِ شاہؑ نجف اس میں
تھے علم امامت کے سوا سب شرف اس میں

امام حسینؑ سے محبت:

بچپن ہی سے انھیں حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ بہت زیادہ مودت اور عقیدت تھی۔

فخر اپنا سمجھتے تھے یہ نعلین اٹھانا　　معراج تھی رومال کھڑے ہو کے ہلانا
ساتھ آنا سدا شاہؑ کے اور ساتھ ہی جانا　　تھی عین تمنا قدم آنکھوں سے لگانا
شہؑ سوتے تھے تو تکیے پہ نہ سر دھرتے تھے عباسؑ
مانندِ قمر پھر کے سحر کرتے تھے عباسؑ

یعنی چاند ساری رات سورج کے گرد چکر کاٹ کر اپنی رات تمام کر رہا ہے۔ ان مصرعوں کو جواہرات میں تولنا چاہیے

لکھے کوئی کیا الفتِ سردار و علمدار　　دیکھا نہ کبھی عاشق و معشوق میں یہ پیار
بلبل کو بھی یہ گل کی محبت نہیں زنہار　　قمری بھی نہیں سرو کی اس طرح طلبگار
اک آن فراق ان میں شب و روز نہیں ہے
پروانہ بھی یوں شمع کا دلسوز نہیں ہے

امام علیؑ ابن ابوطالبؑ کی ایک خاص وصیّت:

مولائے کائنات اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں اور اپنے اصحاب و اہل عیال کو وصیتیں کر رہے ہیں۔ میر انیسؔ یہ منظر یوں پیش کرتے ہیں

روئے علیؑ حسنؑ کو گلے سے لگا لگا　　اور ہاتھ ان کے ہاتھ میں نو بیٹوں کا دیا

امام علیؑ کی خواہش تھی کہ عباسؑ ہمیشہ حسینؑ کے ساتھ رہیں

عباسؑ کو بلا کے گلے سے لگا لیا　　ہاتھ ان کا دے کے ہاتھ میں شبیرؑ سے کہا
اے لال یہ غلام تمھارا ہے باوفا　　میری طرح سے پیار اسے کیجیو سدا
آفت کا دن جو تجھ کو مقدّر دکھائے گا
اس روز یہ غلام بہت کام آئے گا

حضرت ام البنینؑ سے گفتگو:

اُم البنینؑ ایک بار امام حسینؑ کو ایک گفتگو کی تفصیل بتا رہی ہیں؛

اک روز کہا میں نے کہ عباسؑ وفادار　　تم ان کا غلام آپ کو کیوں کہتے ہو ہربار
صدقے گئی یہ طرفہ محبت ہے نیا پیار　　جو تم ہو سو وہ ہیں خلفِ حیدرؑ کرار
مرتے ہوئے حیدرؑ نے سپرد ان کے کیا ہے
کچھ خطِّ غلامی تو نہیں لکھ کے دیا ہے

حضرت عباسؑ کے جواب میں قیامت کے مصرعے ہیں؛

اتنا مرا کہنا تھا کہ بس آنکھ پھرا لی　　تھرّا کے کہا بات یہ کیا منھ سے نکالی
توبہ کرو یکساں ہوا میں اور شہِؑ عالی!　　میں بندۂ ناچیز وہ کونین کے والی
قطرہ کبھی دریا کے برابر نہیں ہوتا
ذرّہ کبھی خورشید کے ہمسر نہیں ہوتا

کیا کیا دلیلیں پیش کر رہے ہیں؛

زہراؑ نے مجھے دودھ پلایا ہو تو کہہ دو　　کاندھے پہ محمدؐ نے بٹھایا ہو تو کہہ دو
جبریلؑ نے جھولا جو جھلایا ہو تو کہہ دو　　ان رتبوں میں رتبہ کوئی پایا ہو تو کہہ دو
وہ فخرِ دو عالم ہیں امامؑ دو جہاں ہیں
اسرارِ لدنّی مرے سینے میں کہاں ہیں

حضرت عباسؑ کا سراپا؛

سراپا نگاری میں انیسؔ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ حضرت عباسؑ نہایت نورانی چہرے کے مالک تھے، جو آپ کے کمال و جمال کی نشانیوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس لیے آپ کا ایک لقب قمر بنی ہاشم بھی ہے۔ چہرہ مبارک کی کیا خوب تعریف ہے؛

اللہ رے ثنائے قلمِ کاتبِ تقدیر　　حیرت میں ہے بہزاد بیاں صورتِ تصویر
یہ حاشیۂ خط ، یہ رُخِ بازوئے شبیرؑ　　ہے نور کا سورہ ورقِ ماہ پہ تحریر
دیکھے یہ لطافت نہ کبھی پھولوں کی بو میں
بینی ہے نشانی کی طرح مصحفِ رو میں

ابوالفضل عباسؑ کے دہنِ مبارک کی مدح میں ایک بند حاضر ہے؛

مضمونِ دہن کے شعرا رہتے ہیں جویا　　پوچھے کوئی کوثر سے زبانوں کو بھی ہے دھویا؟
غُنچہ جو کہا لطفِ سُخن اور بھی کھویا　　اسرارِ الٰہی سے بھی واقف ہوئے گویا !

ہیں عقدہ کشا منھ سے جو بولیں تو کُھلے گا
اس عقدہ کو اگر آپؑ ہی کھولیں کو کُھلے گا

اوردندان مبارک کی تعریف میں یہ بند ملاحضہ کیجیے؛

دانتوں کو گُہر مرثیہ گو کہتے ہیں سارے　　بتلاؤ گُہر خوب ہیں یا عرش کے تارے
یہ دُرِ نجف وہ ہیں علیؑ کو جو ہیں پیارے　　تاروں کو بھی صدقے فلک ان پر سے اتارے
کیا وصف کریں ان کا سوا صلِّ علیٰ کے
گوہر نہیں قطرے ہیں یہ سب نورِ خدا کے

عباسؑ۔اور معنیِ عباسؑ

منتہی الادب میں ہے کہ عبّاس اس مرد کے لیے بولا جاتا ہے جو انتہائی شجاع، پیش قدمی کرنے والا، بہت رعب و دبدبے والا اور بہت جم کرلڑنے والا ہو۔میدان جنگ میں بپھرے ہوئے شیر کو عبّاس کہتے ہیں۔میر انیسؔ کے کچھ بند ملاحظہ کیجیے

کیا پنجہ ہے اس صاحبِ صمصام کا پنجہ　　انگشت ملائے تو پھرے سام کا پنجہ
ہم پنجہ نہ پنجے سے ہو ضرغام کا پنجہ　　مخصوص یہ شمشیر کے ہے کام کا پنجہ
یہ انگلیاں سب عقدہ کشائی کے لیے ہیں
پنجہ پہ وہ قربان ہیں جو پنجتنؑ ہیں

خود شیر ہے ، جد شیر ، چچا شیر ، پدر شیر　　نعرے ہیں جدا شیر کے دل شیر ، جگر شیر
پلکیں ہیں اگر شیر کا پنجہ تو نظر شیر　　کیونکر نہ ہو اس طرح کے شیروں کا پسر شیر
ٹلتے نہیں میداں سے یہ پیشہ ہے انھیں کا
کہتے ہیں نجف جس کو وہ بیشہ ہے انھیں کا

مدینے سے روانگی:

۲۸ رجب کو امام حسینؑ کا قافلہ کوفہ کے لیے روانہ ہورہا ہے۔مدینے میں ایک سوگ کا عالم ہے۔لوگ حضرت عباسؑ کو دیکھ کر امام علیؑ کی زیارت کر لیتے تھے اوراب؛

عباسؑ کا منھ دیکھ کے کہتا ہے کوئی ، آہ!　　اب آنکھوں سے چھپ جائے گی تصویر یداللہ

ایک موقع پر جب قافلہ تیار ہوجاتا ہے تو احترام کا عالم دیکھیے

عباسؑ علیؑ سے علیؑ اکبر نے کہا تب　　ہیں قافلہ سالارِ حرم ، حضرتِ زینبؑ
پہلے وہ ہوں اسوار تو محمل پہ چڑھیں سب　　حضرتؑ نے کہا ، ہاں یہی میرا بھی ہے مطلب
گھر میں مرے ، زہراؑ کی جگہ بنتِ علیؑ ہے
میں جانتا ہوں ، ماں مرے ہمراہ چلی ہے

میدان کربلا میں ورود:

۲ محرم الحرام کو امام حسین کا قافلہ کربلا میں داخل ہوتا ہے۔ بنی ہاشم کے شہزادوں کی کیفیت دیکھیے

صحرا کی طرف دیکھ کے خوش ہوگئے اکبرؑ　　دریا پہ ٹہلنے لگے عباسؑ نامور
اکبرؑ شگفتہ ہوگئے صحرا کو دیکھ کر　　عباسؑ جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر
شہؑ بولے ، ہوا نہر کی بھائی ! تمھیں بھائی
ہاں شیر ہو ، دریا کی ترائی تمھیں بھائی

غیظ وغضب اور اس پر ضبط:

میر انیسؔ کے یہاں انتخاب الفاظ اور ان کے محل استعمال کی بڑی اہمیت ہے۔ واقعہ اس وقت کا ہے جب امام حسینؑ کا قافلہ فرات کے کنارے خیمے نصب کرنے کی تیاری کر رہا تھا تو یزیدی فوج کے سپاہی دریا کے کنارے خیمے نصب کرنے سے روکتے ہیں جس پر بلوے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

آغوش میں پھوپھی کے سکینہؑ دہل گئی　　غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی

اس تصویر میں تاثر، ہیبت، خوف، جرأت، دبدبہ، توصیف سب ہے۔ میر انیسؔ جناب فضہؑ کا بیان لکھتے ہوئے کہتے ہیں

محمل سے منھ نکال کے فضہؑ نے یہ کہا　　بلوہ کنارِ نہر ہے اے بنتِ مرتضیٰ
نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں اشقیا　　قبضے پہ ہاتھ رکھے ہیں عباسؑ باوفا
کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

فوج یزید کا سپاہی کہتا ہے:

ہم گھاٹ روکنے کے لیے آئیں ہیں اِدھر　　ہے آج شب کو داخلہِ شمر کی خبر
سنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیرِ نر　　تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضہ پہ کی نظر

اور بیت میں اس شیر کی کیا کیفیت بیان کی ہے

کم تھا نہ ہمہمہ اسدِ کردگار سے　　نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

اور پھر عباسؑ فرماتے ہیں:

تم کون ہو ؟ حسینؑ ہے مختارِ خشک و تر　　ان کے سوا ہے کون شہنشاہِ بحر و بر
دیکھو فساد ہوگا ، بڑھو گے اگر ادھر　　شیروں کا یاں عمل ہے یہ تم کو نہیں خبر

اور بیت میں تو اسلام کی روح بیان کر دی میر انیسؔ نے کہ اسلام لڑائی میں پہل کرنے سے روکتا ہے لیکن دشمن مداخلت کرے تو جہاد کرنا

فرض ہوجاتا ہے

سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں　　بس کہہ دیا کہ پاوں نہ رکھنا ترائی میں

جنابِ عباسؑ کی شجاعت امامِ وقت کی تابع تھی ان کا ہر فعل وعمل امامت کی اطاعت اور تابعداری میں انجام پاتا ہے۔ جب امام حسینؑ حضرت عباس کو سمجھاتے ہیں تو وہ غصے کو قابو میں کر لیتے ہیں

گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے　　قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

مگر کیا حفظِ مراتب ہیں۔ حضرت عباسؑ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ گو میں آپ کا غلام ہوں لیکن ہم دونوں کی رگوں میں علی ابن ابی طالب جیسے شجاع مرد کا خون ہے۔ اگلے بند کی بیت میں حضرت عباسؑ کا جواب دیکھیے

میں ہوں غلام آپ کے ادنیٰ غلام کا　　آقا ! مجھے خیال تھا بابا کے نام کا

دشمن سے مکالمہ:

میر انیسؔ نے مکالمے کو اپنی شاعری کا ایک باقاعدہ جزو بنایا ہے۔ مثلاً ایک منزل ہے جب شمرِ لعیں حضرت عباسؑ سے کہتا ہے

تب شمر نے کہا کہ فصاحت سے کیا حصول　　بیعت انھیں ، تو صلح ہمیں بھی نہیں قبول

اب حضرت عباسؑ کا جواب سنیے جس میں وہ حق و باطل کا فرق واضح کر رہے ہیں

غازیؑ پکارا ، او نجس و مرتد و جہول!　　لیجو نہ منھ سے نامِ جگر گوشۂ بتولؑ !!

سمجھا ہے کیا امامِ عراق و حجاز کو ؟!　　گدّی سے کھینچ لوں گا زبانِ دراز کو !!

تو کیا ہے ؟ اور کیا ہے ترا وہ امیرِ شام ؟　　کرتے ہیں بادشاہ کبھی بیعتِ غلام ؟!

تو بھی نمک حرام ہے ! وہ بھی نمک حرام !!　　او بے ادب ! یزید کجا ؛ اور کجا امامؑ !!

دوزخ سے دور رہتے ہیں ساکن بہشت کے
کعبہ کبھی جھکا نہیں آگے کنِشت کے !!

علَم سے نسبت:

میر انیسؔ نے اپنے مرثیے ''غل آمدِ عباسؑ کا ہے فوجِ ستم میں'' میں اسلام کے چاروں بڑے علمداروں کا ذکر کیا اور فیصلہ کر دیا کہ جب روزِ محشر علم آئے گا تو علمِ حضرتِ عباسؑ ہی کہلائے گا۔ یہاں تک کہ سرکارِ رسالتمآبؐ کے خیبر میں علم دینے کی روایت کو بھی انیسؔ نے مصرعے میں سمیٹ دیا ہے

عالم میں ہوئے چار اولوالعزم علمدار　　اک حضرتِ حمزہؓ تھے تو اک جعفرِ طیّار

بعد ان کے ہوئے زیبِ علم حیدرِ کرّار　　عباسؑ اب اس منصب والا کا ہے مختار

کرسی کے بھی پائے سے سوا پایا ہے رتبہ
کیا دست بدست اس کو یہ ہاتھ آیا ہے رتبہ

یہ وہ ہے علم جس کو پیمبرؐ نے اٹھایا　　کس فخر سے حمزہؓ سے دلاور نے اٹھایا
ہاتھ آیا شرف جب اسے جعفرؓ نے اٹھایا　　وہ اٹھ گئے دنیا سے تو حیدرؑ نے اٹھایا
ہوگا یہ ہما سایہ فگن اب نہ کسی پر
بس خاتمہ ہے حضرتِ عباسِؑ علیؑ پر

علمِ حضرت عباسؑ ذاکرِ مجلس کی پشت پناہی کرتا ہے؛

اللہ اللہ عزّ و جاہِ ذاکر　　دربارِ حسینیؑ میں ہے راہِ ذاکر
پنجہ جو علم کا سرِ منبر ہے انیسؔ　　ہے دستِ علمدار پناہِ ذاکر

یا پھر یہ مشہور رباعی جو پیش خوانی میں پڑھی جاتی ہے؛

بالیدہ ہوں وہ اوج مجھے آج ملا　　ظلِّ علمِ صاحبِ معراج ملا
منبر پہ نشست سر پہ حضرتؑ کا علم　　اب چاہیے کیا تخت ملا تاج ملا

برصغیر کی عزاداری میں جب جلوس نکلتا ہے تو علم آگے آگے ہوتے ہیں۔ کیا کمال رباعی ہے

ظاہر وہی الفت کے اثر ہیں اب تک　　قربانِ شہؑ جنّ و بشر ہیں اب تک
ہوتے ہیں علم آگے اٹھتی ہے جو ضریح　　عباسِؑ علیؑ سینہ سپر ہیں اب تک

جب علم امام باڑوں میں واپس آتے ہیں تو انھیں جھکا کے اندر لایا جاتا ہے۔ منظر نگاری ملاحظہ کیجئے

رُعبِ شہؑ ذی جاہ سے تھراتے ہیں　　سب طرزِ غلامانہ بجا لاتے ہیں
آداب یہ ہے کہ تعزیہ خانے میں　　آتے ہیں تو جھک جھک کے علم آتے ہیں

کربلا میں منصبِ علمداری:

امام حسینؑ کی رضا یہ تھی کہ علم حضرت عباسؑ کو ملے۔ ایک مرثیہ میں جب امام حضرت عباسؑ کو خیمے میں بلواتے ہیں

حضرتؑ نے مسکرا کے کہا آگے آیئے　　کاندھے پہ مصطفیٰؐ کے علم کو اٹھایئے
میداں میں بن کے جعفرِؑ طیار جایئے　　شان و شکوہِ ضیغمِ یزداں دکھایئے
ظلِ نشانِ فوج مبارک ہو آپ کو
لیجے ! یہ اوج و موج مبارک ہو آپ کو

ایک اور مرثیہ جس میں ثانی زہرا حضرت زینبؑ اپنے بھائی عباسؑ کو علم دیتی ہیں

ان کی خوشی وہ ہے جو رضا پنجتنؑ کی ہے　　لو بھائی لو ، علم یہ عنایت بہن کی ہے

رکھ کر علم پہ ہاتھ جھکا وہ فلک وقار　　ہمشیر کے قدم پہ ملا منھ بہ افتخار
زینبؑ بلائیں لے کے یہ بولیں کہ میں نثار　　عباسؑ ! فاطمہؑ کی کمائی سے ہوشیار!
ہو جائے آج صلح کی صورت تو کل چلو
ان آفتوں سے بھائی کو لے کر نکل چلو

کی عرض میرے جسم پہ جس وقت تک ہے سر　　ممکن نہیں ہے یہ کہ بڑھے فوج بدگہر
تیغیں کھنچیں جو لاکھ تو سینہ کروں سپر　　دیکھیں اٹھا کے آنکھ یہ کیا تاب کیا جگر
سر تن سے ابنِ فاطمہؑ کے روبرو گرے
شبیرؑ کے پسینے پہ میرا لہو گرے

شاگردوں کی رزم کا مشاہدہ:

حضرت عباسؑ نے اپنے بھائیوں بھانجوں اور بھتیجوں کو بہترین تربیت دے کے جنگ کے سب فن سکھائے تھے۔ایک موقع جب حضرت عباسؑ علمدار کے بھائی جنگ کے لیے آتے ہیں

نکلے برادرانِ علمدارِ صف شکن　　دکھلا دیے علیؑ کی لڑائی کے سب چلن

آنکھوں میں پھر رہی تھی چمک ذوالفقار کی　　عباسؑ داد دیتے تھے ایک ایک وار کی

اورفرماتے تھے

ہاں صفدرو نشاں نہ رہے فوجِ شام کا　　بیٹوں کو پاس چاہیے باباؑ کے نام کا

حضرت قاسمؑ ازرق شامی ملعون کے حملوں کا بڑھ بڑھ کے جواب دے رہے ہیں

عباسؑ صدا دیتے تھے عمّو ترے قربان　　کس شان سے کرتے ہو وَغا واہ میری جان
وہ دیو ہے ضربت کے بچانے کا رہے دھیان　　ہر وقت کا موقع ہے بڑھے جاؤ نہ اس آن
زد پر دمِ شمشیر کے آنے دو لعیں کو
جاتا ہے کہاں مار لیا دشمنِ دیں کو

ایک اور مرثیہ جہاں حضرت عونؑ و محمدؑ کافروں سے گھمسان کی جنگ لڑ رہے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک ببر شیر اپنے بچوں کے شکار کرنے کے عمل کا مشاہدہ کر رہا ہے

عباسؑ صدا دیتے تھے ہاں اے مرے شیرو　　قابو سے نکل جانے نہ دو پھر انہیں گھیرو
لڑتے ہوئے عجب شان سے شاباش دلیرو　　سر کر دو لڑائی تو ادھر گھوڑوں کو پھیرو

اس جنگ کی خیمے میں بڑی دھوم پڑی ہے
ماں دیوڑھی پہ چھاتی سے لگانے کو کھڑی ہے

حضرت عباسؑ کی رخصت؛

دس محرم روز عاشورا پیاسے بچوں خصوصاً اپنی چار سالہ لاڈلی بھتیجی سکینہ بنت الحسینؑ کے لیے پانی حاصل کرنے جارہے ہیں

روتے ہوئے بڑھے حرمِ شاہِؑ ذوالفقار　　سب نے بلائیں لیں علمِ شہؑ کی بار بار
آئی صدائے حضرتِؑ خاتونِؑ روزگار　　عباسؑ ! میں علم کے فدا اور ترے نثار
شکر خدا کہ جعفرؑ طیار تم ہوئے
واری ! میں خوش ہوئی کہ علمدار تم ہوئے

مشکیزے کو لے آئی سکینہؑ جگر افگار　　غازی نے اسے لے کے بھتیجی کو کیا پیار
خیمے میں پڑا غل کہ چلا شاہؑ کا غم خوار　　غش کھا کے گری زوجہِ عباسِؑ علمدار
ہاتھوں سے اسے تھام کے دل سب نے سنبھالا
شہؑ اٹھ کے جو گرنے لگے زینبؑ نے سنبھالا

تب کہنے لگا شمرِ لعیں یہ نہیں زنہار　　ہے صابر و شاکر پسرِ احمدؐ مختار
آتی ہے صدا ہائے برادر کی جو ہر بار　　ہوتا ہے جدا سبطِ پیمبرؐ سے علمدار
بے وجہ نہیں خیمے میں رونے کا یہ غل ہے
معشوق سے عاشق کے جدا ہونے کا غل ہے

حضرت عباسؑ کی میدان جنگ میں آمد

تکتا تھا مثل شیرِ صفوں کو وہ حق شناس　　حیدرؑ صدا یہ دیتے تھے آکر صفوں کے پاس
کس شان سے چلے ہو ، فدا ہونے بھائی پر　　ہم بھی یوں ہی چڑھے تھے احد کی لڑائی پر

کہتے ہیں مَلک عرش کے پائے کو سنبھالے　　گیتی کو خدا آج تباہی سے بچالے
کیا غزوہ خندق میں بہے خون کے نالے　　ہیں قلعۂ خیبر کے یہی توڑنے والے
نقشہ نظر آجائے گا پھر جنگِ احد کا
پوتا ہے لڑائی پہ چڑھا بنتِ اسد کا

حضرت عباسؑ کی آمد میں میر انیسؔ نے ایک بند میں لفظ رنگ کو چار مختلف معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً دہشت، خوف، تشویش

آنا تھا کہ کچھ اور ہی لشکر کا ہوا رنگ　　سینوں میں جگر ہل گئے چہروں سے اڑا رنگ
سب سوچ میں تھے دیکھیے اب ہوتا ہے کیا رنگ　　بولا کوئی ہے آج لڑائی کا نیا رنگ

لاکھوں ہیں مگر فتح سے دل سرد ہیں سب کے
بے جنگ کیے خوف سے منھ زرد ہیں سب کے

حضرت عباسؑ کی رجز خوانی

تم کیا ، پہاڑ بیچ میں گر ہو تو ٹال دیں　　شیروں کو ہم ترائی سے باہر نکال دیں
مہلت نہ ایک کو دمِ جنگ و جدال دیں　　پانی تو کیا ہے آگ میں گھوڑے کو ڈال دیں
منھ دیکھتے ہیں جو ہیں نگہبان گھاٹ کے
لے جائیں گھر پہ تیغ سے دریا کو کاٹ کے

سرکش ہیں سب ہماری زبردستوں سے زیر　　دادا شجاع ، باپ الوالعزم ، ہم دلیر
جب رن پڑا ہے کردیے ہیں زخمیوں کے ڈھیر　　لائے ہیں جا کے آگ سے پانی خدا کے شیر
عفریت بھاگتے ہیں وہ چوٹیں ہماری ہیں
بیر العلم میں کود کے تلواریں ماری ہیں

جنگ آزما ہیں ، صف شکن و قلعہ گیر ہیں　　صولت میں ، دبدبے میں ، عدیم النظیر ہیں
دنیا کے بادشاہ ہیں ، گردوں سریر ہیں　　اس اوج پر حسینؑ کے در کے فقیر ہیں
رتبے پہ فخر ہے ، نہ شجاعت پہ ناز ہے
گر ہے تو بس غلامی حضرت پہ ناز ہے

حضرت عباسؑ کی جنگ؛

پائی تھی عجب ہاتھ نے غازی کے صفائی　　بس صاف تھی وہ جو کہ تہِ تیغ صف آئی
اعدا کو نظر ضربتِ شاہِؑ نجف آئی　　جوں سیلِ فنا پھر نہ رکی جس طرف آئی
شعلہ تھی شرارہ تھی قیامت تھی بلا تھی
شمشیر تھی یا برق تھی یا قہرِ خدا تھی

حضرت عباسِؑ نہر فرات پر؛

اللہ ری جنگِ شیرِ سلیمانِ کربلا　　چیونٹی بھی مورچوں میں نہ تھی آدمی تو کیا
پہنچے ترائی میں تو یہ اعدا کو دی صدا　　کیوں اب یہ نہر کس کی ہے اے قومِ اشقیاء
اک دم میں ہم شکست ہزاروں کو دیتے ہیں
دیکھو اسد ترائی کو یوں چھین لیتے ہیں

فرما کے یہ سمند کو ڈالا فرات میں　　گویا خضر اتر گئے آبِ حیات میں
دریا دل ایسا کون ہوا کائنات میں　　تسمہ پکڑ کے مشک بھری ایک بات میں

سیراب جب تلک کہ شہؑ بحر و بر نہ ہوں
منظور تھا کہ ہاتھ بھی پانی سے تر نہ ہوں

حضرت عباسؑ کا گھوڑا بھی اپنے مالک کی تاسی کرتا ہے

راکب نے جب کیے نہ لبِ خشک اپنے تر　　رہوار نے بھرا نفس سرد اٹھا کے سر
چاہا بہت کے پانی پیے اسپِ خوش سیَر　　ڈالا نہ اس سمند نے منھ آب میں مگر
انکار تھا بجا فرسِ تیز گام کا
پیاسا تھا تین روز سے گھوڑا امامؑ کا

مشک کا چھدنا اور شہادتِ حضرت عباسؑ؛

کیا کیا نہ لڑے مشک کو کیا کیا نہ بچایا　　گہ چھاتی تلے زیر سپر گاہ چھپایا
جھک کر کبھی دامان سپر اس پہ اڑھایا　　وہ تیر لیا سینے پہ جو مشک پہ آیا
پانی کے لیے خون میں تر ہوگئے عباسؑ
تلوار جب آئی تو سپر ہوگئے عباسؑ

شانے پہ جو ظالم نے برابر سے کیا وار　　جس ہاتھ میں تھی تیغ قلم ہوگیا اک بار
غصّے میں جو قاتل پہ چلے داب کے تلوار　　ہیہات چلی دوسرے قاتل کی بھی تلوار
عباسؑ دلاور کو اسی ہاتھ کا غم تھا
وہ ہاتھ بھی ریتی میں گرا جس میں علم تھا

حضرت عباسؑ نے مشک کو دانتوں میں لے لیا اور خیموں کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔

آنکھیں لہو تھیں ، رخ سے جلال آشکار تھا
مشکیزہ تھا کہ شیر کے منھ میں شکار تھا

مگر افسوس کہ یہ پانی خیامِ حسینؑ تک پہنچنے نہیں پایا، ایک تیر مشک کو لگا، مشک چھد گئی اور پانی زمین پر گر گیا

ہر چند پھٹ گیا تھا سرِ دلبرِ علیؑ　　تسمہ نہ چھوڑا مشک کا دانتوں سے اس پہ بھی
اپنا نہ کچھ خیال تھا ، پیاسوں کی فکر تھی　　ہرنے پہ سر پٹک دیا ، جب مشک چھد گئی
آنکھوں سے بہہ کے اشک بصد یاس گر پڑے
پانی گرا تو گھوڑے سے عباسؑ گر پڑے

واں لاش پہ شہؑ خاک اڑاتے ہوئے پہنچے　　کفار کے لشکر کو ہٹاتے ہوئے پہنچے

بے کس کے مسافر کے مددگار سدھارے　　دنیا سے مرے جعفرؑ طیار سدھارے

میر انیسؔ کی ایک خوناب رباعی ہے جو بعد شہادت فرات کا منظر پیش کرتی ہے

خوں بھائی کا شہؑ کے روبرو بہتا تھا　　پیاسے کا لہو ، کنارِ جو بہتا تھا
تھا بیچ میں سقائے حرم کا لاشہ　　دریا تو اُدھر ، اِدھر لہو بہتا تھا

آیا ہے علم اور علمدار نہ آیا؛

دیوڑھی سے جھکا کر جو اسے خیمے میں لائے　　حضرتؑ کے حرم زیرِ علم پیٹتے آئے
غل پڑگیا ہے ہے اسد اللہ کے جائے　　مشکیزہ بھی تیروں سے چھدا زخم بھی کھائے
پیاسے گئے پانی نہ پیا نہر میں جاکے
صدقے تری سقائی کے قربان وفا کے

میں اس مختصر مضمون کو میر انیس علیہ رحمہ کے ان مصرعوں پر ختم کر رہا ہوں مگر حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!!

کیا کیا نہ جواں مرد ہوئے خلق میں پیدا　　لیکن کوئی عباسؑ کی جرأت کو نہ پہنچا
ہر شہر میں غازی کی شجاعت کا ہے شہرا　　ہر لب پہ ہے یہ ذکر کہ یکتا ہے وہ یکتا
ایسا نہ ہوا کوئی نہ ہوئے گا جہاں میں
جو اہلِ وفا ہے اسے روئے گا جہاں میں

❁❁❁❁

جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیوں پر مشتمل

''فرہنگِ جوشؔ'' شائع ہوگئی ہے

(جس میں جوشؔ صاحب کے ۹ مرثیوں سے ۱۲۰۰ سے زائد الفاظ منتخب کیے گئے ہیں)

ترتیب وتدوین

اصغر مہدی اشعر

انیسؔ کی Negative capability

عادل مختار

شیکسپیئر کی ایک تخلیق سے متاثر ہوکر، انگریزی ادب کے ممتاز رومانوی شاعر، جان کیٹس نے ۱۸۱۷ء میں اپنے بھائیوں جارج اور ٹام کے نام ایک خط میں ایک خاص کی قسم کی تخلیقی صلاحیت کے لیے Negative Capability کی اصطلاح ایجاد کی۔ یہ پُراسرار اصطلاح، ایک فلسفیانہ تجرید کے علاوہ، انسانی نفسیات کی ایک گہری سطح کی دریافت ہے۔

Negative Capability حقیقت کی گہری تہوں تک رسائی کا ایک ذریعہ بنتی ہے، اس کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہے جتنا کہ خود انسان کا تجربہ۔ یہ انسانی جذبات کے پورے میدان کو گھیرے ہوئے ہے، خوشی کی پرجوش بلندیوں سے لے کر مایوسی کی ویران گہرائیوں تک، یہ شدّت سے محسوس کرنے کی صلاحیت ہے۔ بغیر کسی بھی تاریخی حوالے یا تجزیے کے، اپنے آپ کو کسی وجود کی شدّتِ خام میں پوری طرح غرق کر دینا ہی اس کا جوہر ہے۔ یہ دوسروں کے ساتھ ان کے وجود میں خود کو شریک کرنے، ان کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھنے، ان کے درد اور خوشی کا تجربہ کرنے کی صلاحیت ہے۔

اگر بہت ہی آسان لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس صلاحیت کا حامل شاعر اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے اپنے موضوع کے وجود کو اس کی حالتوں اور کیفیات کے ساتھ قبول کرتے ہوئے اسے محضرِ تخلیق تک لے کے آتا ہے۔ اس صلاحیت کا شاعر سے تقاضا یہ ہوتا کہ وہ حقیقت یا سبب تلاش کرنے کے بجائے اپنے موضوع سے متعلق کیفیات کو قبول کرنے والا ہو اور ہر سچائی، اسرار یا شک کے بارے میں مطلق علم حاصل نہ کرے۔

کیٹس کے Negative Capability کے تصور کو مصنف کی اس صلاحیت کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں، اشیاء اور افعال میں مکمل اور تخیلاتی طور پر داخل ہوسکتا ہے جس کی وہ نمائندگی کرتا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے اپنے مضمون Tradition and Individual Talent میں لکھا کہ ایک فنکار کی ترقی، اس کی اپنی ذات کی مسلسل قربانی سے اور اپنی ذاتی شخصیت کے مسلسل معدوم ہونے سے ہوتی ہے۔

اس طرح اس صلاحیت کو آزماتا ہوا شاعر ہر شے ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کہیں پر بھی کوئی اور تو ہوسکتا ہے مگر اپنی تخلیقات میں خود نہیں ہوتا۔

اگرچہ Negative Capability کا تصور کیٹس نے باقاعدہ پیش کیا مگر اس صلاحیت کے اظہار میں وہ خود کمال تک نہ پہنچ پایا کہ جس کمال پر اسے شیکسپیئر نظر آتا ہے۔ کیٹس نے اس صلاحیت کو اپنی شہرہ آفاق Odes میں مظاہرِ فطرت اور چند تجریدات کے حوالے سے تو آزمایا مگر انسانی کرداروں میں وہ اس صلاحیت کو لے کر نفوذ نہیں کر سکا۔ شاید اس کے محدود تجربے کی ایک وجہ اس کی فقط چھبیس برس کے سن

میں موت واقع ہونا ہے۔

میر انیس کے مرثیوں کے مطالعے کے دوران ہمیں بار بار احساس ہوتا ہے کہ میر انیس ایک آفاقی شاعر ہونے کے اعتبار سے اپنے مرثیوں میں Negative Capability کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہیں اور اس حوالے سے وہ مظاہرِ فطرت، حشرات، چرندوں، پرندوں، درندوں اور گزندوں سے لے کر انسانوں تک اپنے موضوعات کے وجود میں نہ صرف نفوذ کرتے ہیں بلکہ بعض دفعہ وہ ان کے وجود کی تشریک سے ان کی خالص کیفیات اور احوال اخذ کرنے بعد انھیں سپردِ قرطاس کرتے ہیں۔ اور شاعر کے اسی منصب کی تعریف کیٹس ان الفاظ میں کرتا ہے، ''اگر شاعر کے کردار کی بات کی جائے تو اس کی اپنی کوئی ذات نہیں ہوتی وہ ہر چیز ہوتا ہے اور کچھ بھی نہیں ہوتا؛ وہ روشنی اور تاریکی دونوں سے لطف اٹھاتا ہے۔۔۔''

اب اگر میر انیس کے کلام سے مثالوں کو اس حوالے سے اکٹھا کیا جائے تو وہ اپنی جگہ ایک الگ مقالے کا مواد ہے مگر وہ مثالیں جو میرے نزدیک بہت ہی محسوس مثالیں ہیں ان میں سے بخدا فارسِ میدانِ تہوّر تھا حُر مرثیے میں عمر ابنِ سعد کا جنابِ حُر سے کیا گیا مکالمہ اوّلین مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب حُر اپنی باتوں سے طرفداریٔ شبیرؑ پر عمر ابن سعد کو مائل نظر آتا ہے تو ابن سعد کہتا ہے:

حر سے گھبرا کے یہ بولا عمرِ سعد شریر　　یہ تو ہے صاف طرفداریٔ شہ کی تقریر
اپنے حاکم کا نہ کچھ ذکر نہ تعریفِ امیر　　اللہ اللہ یہ اوصاف یہ مدحِ شبّیر
سن چکا ہوں میں کہ مضطر ہے کئی راتوں سے
الفتِ شاہ ٹپکتی ہے تری باتوں سے

نہ وہ آنکھیں نہ وہ چتون نہ وہ تیور نہ مزاج　　سیدھی باتوں سے بگڑنا یہ نیا طور ہے آج
تخت بخشا ہے محمد کے نواسے نے کہ تاج ؟　　جن کو سمجھا ہے غنی دل میں ، وہ خود ہیں محتاج
کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے ؟
کہیں کوثر کہ تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے ؟

کیا کسی حُور کا دکھلا دیا حضرت نے جمال؟　　مل گیا سایۂ طوبیٰ کہ جو ایسا ہے نہال؟
قصرِ یاقوت میں پہنچا جو ترا رنگ ہے لال؟　　کون سے میوۂ شیریں پہ ٹپکتی ہے رال؟
دفعتاً حقِّ نمک کو بھی فراموش کیا کیا
کیا تجھے بادۂ تسنیم نے بے ہوش کیا؟

اس مکالمے میں عمر ابن سعد کے کردار کو زیرِ بحث تخلیقی صلاحیت Negative Capability کو ہی بروئے کار لا کر تخلیق کیا گیا ہے۔ اس مکالمے میں گو کہ خلافِ حق کی گئی تقریر ہے مگر اس تقریر کے دوران پہلے خود انیس اور ان کے بعد سامعین و قارئین کو ایک خاص تخلیقی حظ اٹھاتے ہوئے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں، کیٹس کے قول کے مطابق، انیس تاریکی سے بھی تخلیقی حظ اٹھاتے ہیں۔ یہ کمال مذکورہ صلاحیت کے سبب سے ہوا ورنہ اس مکالمے میں موجود خبثِ باطن، طنز اور شقاوت کا اس قدر عمیق اظہار میر انیس کے ذاتی تجربات کا

نتیجہ تو قطعاً نہیں ہوسکتا۔ انیس نے دیگر مقامات پر بالعموم اور اس مقام پر بالخصوص عمر ابن سعد ایسے تاریک کردار کا جو تخلیقی حق عائد ہوتا ہے اسے ادا کیا۔ اور اس سطح تک تخلیقی حقوق کا ادا کرنا ہی ایک آفاقی شاعر کی ذمہ داری ہے کیونکہ مذکورہ صلاحیت تخلیقی عمل کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ یہ ایسے کرداروں کو تخلیق کرنے کی صلاحیت ہے جو پُتلیاں پُتلے نہیں ہیں بلکہ اپنے اپنے شعور، جذبات اور احساس کی گہرائیوں کے ساتھ پیچیدہ، متضاد افراد ہیں جو قطعی اور سطحی درجہ بندی سے انکار کرتے ہیں۔ یہ قاری کو معنی کی تخلیق میں حصہ لینے کی دعوت دیتی ہے۔ مختصراً، Negative Capability کسی وجود کے اسرار کو اپنانے کی دعوت دیتی ہے۔

کیٹس جب بھی کوئی چیز دیکھتا یا کسی چیز کے بارے میں سنتا تو اسی چیز کو اپنا لینے میں وہ لطف محسوس کیا کرتا تھا۔ وہ اس شے کا وجود قبول کرتا اور اپنے آپ کو وہی چیز فرض کیا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا، ''جب کوئی چڑیا میری کھڑکی کے سامنے آتی ہے تو میں اس کے وجود میں شریک ہو جاتا ہوں اور کنکروں میں سے دانہ چگنا شروع کر دیتا ہوں''۔

احساس اور تخیل کی یہی شدّت Negative Capability کا جوہر ہے جو ہمیں میر انیس کے مرثیوں میں جا بجا ملے گا۔ تلوار کے ساتھ تلوار بن کر اور فرس کے ساتھ فرس بن کر رزمِ حُسینؑ کی کیفیات اور احوال کا ذکر اسی ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

ایک بند ملاحظہ ہو جس میں انیس کی نظر اور تلوار میں ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔

پہنچی جو سپر تک تو کلائی کو نہ چھوڑا　　ہر ہاتھ میں ثابت کسی کھائی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شرارت کو لڑائی کو نہ چھوڑا　　تیزی کو رکھائی کو صفائی کو نہ چھوڑا
اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

صبحِ عاشور کے حوالے سے مختلف مخلوقات کی طرف سے تسبیح و تمجید و حمدِ پرودگار کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انیس ایک روح کی طرح ان میں سرایت کرتے جاتے ہیں اور ان کے احوال کو اخذ کرتے ہوئے نظم کو بڑھاتے جاتے ہیں:

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم　　کُوکُو کا شور نالۂ حق سرّہٗ کی دھوم
سبحان ربّنا کی صدا تھی علی العموم　　جاری تھے وہ جو ان کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی حمد
ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی حمد

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار　　اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق تیرے نثار
''یا حی یا قدیر'' کی تھی ہر طرف پکار　　تحلیل تھی کہیں کہیں تسبیحِ کردگار
طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر ہونک رہے تھے کچھار میں

اور جنابِ علی اکبرؑ کی اذان کی صدا بلند ہونے پر دشتِ کربلا کو مجموعی طور پر محسوس کرنا اور خود کو اس کا حصہ قرار دے کر جو تصوراتی تجربہ

حاصل ہوتا ہے ملاحظہ فرمائیں:

چپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر　　تسبیح خواں تھے برگ و گل و غنچہ و ثمر
محوِ ثنا کلوخ و نباتات و دشت و در　　پانی سے منہ نکالے تھے دریا کے جانور
اعجاز تھا کہ دلبرِ شبیرؑ کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

اور جب اسی دشت کا دھوپ کی تمازت سے نقشہ بدلتا ہے تو روحِ انیس اس حرارت اور قہرِ ماحول میں موجودات میں مزید نفوذ کرتی ہے۔

آبِ روا سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور　　جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر　　خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے　　آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے　　گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

اسی حرارت اور اسی دشت تپاں میں جب سہ روز کے پیاسے امام کی طرف نگاہ احساس اٹھتی ہے تو انیس ظاہری انقلاب اور باطنی کیفیت تک رسائی کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہِ امم　　نے دامنِ رسول تھا نے سایۂ علم
شعلے جگر سے آہ کے اٹھتے تھے دم بدم　　اودے تھے لب، زبان میں کانٹے، کمر میں خم
بے آب تیسرا تھا جو دن میہمان کو
ہوتی تھی بات بات میں لکنت زبان کو

مرثیے میں خاص طور پر Negative Capability کو آزمانے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ شہادت کے وقت شہید کی حالت کو اسی صلاحیت سے بھرپور طریقے سے محسوس کر کے نظم کیا جا سکتا ہے کہ جس سے خاص طور پر کلاسیکل مرثیے میں دقت سے کام لیتے ہوئے اعلیٰ ترین رثائی مضامین مرتب ہو سکتے ہیں اور اس ضمن میں بھی کلامِ انیس سے انتہائی قابلِ قدر اور قابل ذکر نمونوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

علمدارِ کربلا کا وقتِ آخر ہے، امام حُسینؑ جنابِ علی اکبر کے ہمراہ ان کے پاس آتے ہیں اور بھائی کا سر اپنی گود میں رکھ کر چند گھڑیوں بعد ہونے والی اپنی شہادت کے احوال کا ذکر کرتے ہیں تو اس مقام پر انیس نے جنابِ عباسؑ کے دم نکلنے کی کیفیت رقم کی ہے:

یہ بات سن کے نزع میں عباس تھرتھرائے　　قطرے لہو کے آنکھوں سے عارض پہ بہ کے آئے

دو بار سر پٹک کے پکارے کہ ہائے ہائے　　پرخوں دہن حسینؑ کے قدموں کے پاس لائے
ہچکی کے ساتھ موت کا خنجر بھی چل گیا
سر پاؤں پر دھرا رہا اور دم نکل گیا

جنابِ حُرؑ کو حالتِ احتضار میں جو سکون حاصل ہے اس میں انیس کے احساس کی شراکت کو ملاحظہ فرمائیں:

قبلہ رو کیجیے لاشہ مرا اے قبلۂ دیں　　پڑھیے یٰسین کہ اب ہے یہ دمِ باز پسیں
کوچ نزدیک ہے اے بادشہِ عرش نشیں　　لیجیے تن سے نکلتی ہے مری جانِ حزیں
بات بھی اب تو زباں سے نہیں کی جاتی ہے
کچھ اوڑھا دیجیے مولا مجھے نیند آتی ہے

کہہ کے یہ گود میں شبیرؑ کی، لی انگڑائی　　آیا ماتھے پہ عرق چہرے پر زردی چھائی
شہ نے فرمایا ہمیں چھوڑ چلے کیوں بھائی　　چل بسے حرِّ جری پھر نہ کچھ آواز آئی
طائرِ روح نے پرواز کی طوبیٰ کی طرف
پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہِ والا کی طرف

شہادتِ علی اکبرؑ کا بیان ہے اور میر انیس فرزندِ جواں کے کٹے ہوئے پیکر پر امام حُسینؑ کی آمد کا احوال لکھتے ہیں۔ امام مظلوم علی اکبر کے فرس ''عقاب'' سے مخاطب ہیں جو انھیں علی اکبر کے لاشے تک لے جائے گا:

مَلنے دے ان رکابوں کے حلقوں سے چشم نم　　ہے ہے اسی میں تھے میرے فرزند کے قدم
بوسے تری لگام کے لوں میں اسیرِ غم　　اکبر کے ہاتھ میں تھی یہی باگ ہے ستم
ہے ہے وہ ہاتھ پاؤں میرے آفتاب کے
قرباں تری لگام کے صدقے رکاب کے

اور جب علی اکبرؑ تک پہنچتے ہیں تو وہ حالتِ احتضار میں ہیں اور زخموں کی وجہ سے تڑپ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر امامؑ فرماتے ہیں:

کیوں کھینچتے ہو پاؤں کو اے میرے گل عذار　　کیوں ہاتھ اٹھا اٹھا کے پٹکتے ہو بار بار
آنکھیں تو کھول دو کہ مرا دل ہے بے قرار　　بیٹا تمہاری ماں کو تمہارا ہے انتظار
بہنیں کھڑی ہیں در پہ بڑے اشتیاق میں
اکبر تمہاری ماں نہ جیے گی فراق میں

کربلا کے شہیدوں کی شہادت اور حالتِ احتضار کی نوعیت کا اختلاف بذاتِ خود دلیل ہے کہ قرآئن کو مدنظر رکھتے ہوئے اک Negative Capability کی صلاحیت ہے کہ جس سے ان موضوعات کی کٹھنائیوں کو سر کیا جا سکتا ہے۔

مگر ایک حوالے سے انیس نے اس صلاحیت کے سبب کمال اس وقت حاصل کیا ہے کہ جب امام حُسینؑ جو اپنی ذات کے کئی ابعاد رکھتے

ہوئے رزمِ کربلا سے شہادت کی منزل پر پہنچتے ہیں تو انیس بھی مقدور بھر کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذات اور اسے سے جڑے ہوئے پہلوؤں کو امام کی ذات کے متعدد اور مختلف ابعاد کے سپرد کر دیں۔ اس حوالے سے امام حُسینؑ کے رزم اور شہادت کی کیفیت سے متعلق چند بند ملاحظہ فرمائیں کہ جن میں ایک ہی شخصیت کے ایک ہی وقت میں شجاعت، ہیبت، رحم، مظلومیت اور شدّتِ مصائب کو انیس نے اپنی مذکورہ صلاحیت کے سبب محسوس کرتے ہوئے نظم کیا۔

امامِ حُسینؑ میدانِ کربلا میں حملۂ آخر سے پہلے اہل وعیال سے رُخصتِ آخر فرما رہے ہیں اور اس حال میں کہ جب قیامت تک کی جدائی درپیش ہے اس حال میں بھی حضرت خداوندِ دوعالم سے مناجات میں محو ہیں۔ اس مقام پر انیس نے قبل از حماسۂ حسینی عرفانِ حُسینی کے رُخ کو جو واضح کیا ہے وہ امامؑ کی ذات میں محو ہوئے بغیر ممکن نظر نہیں آتا۔

یا رب یہ ہے سادات کا گھر تیرے حوالے　　رانڈیں ہیں کئی خستہ جگر تیرے حوالے
بے کس کا ہے بیمار پسر تیرے حوالے　　سب ہیں تیرے دریا کے گُہر تیرے حوالے
عالم ہے کہ غربت میں گرفتارِ بلا ہوں
میں تیری حمایت میں انہیں چھوڑ چلا ہوں

میرے نہیں بندے ہیں ترے اے میرے خالق　　بستی ہو کہ جنگل　تو ہی حافظ تو ہی رازق
باندھے ہیں کمر ظلم و تعدّی پہ منافق　　نے دوست ہے دنیا نہ زمانہ ہے موافق
حرمت ہے ترے ہاتھ امامِ ازلی کی
دو بیٹیاں، دو بہویں ہیں، اس گھر میں علی کی

میں یہ نہیں کہتا کہ اذیت نہ اٹھائیں　　یا اہلِ ستم آگ سے خیمے نہ جلائیں
ناموس لٹیں قید ہوں اور شام میں جائیں　　مہلت مرے لاشے پہ بھی رونے کی نہ پائیں
بیڑی میں قدم طوق میں عابد کا گلا ہو
جس میں تیرے محبوب کی امت کا بھلا ہو

اگر میانِ رزم امام حُسین علیہ السلام کی شجاعت کو دیکھتے ہیں تو انیس امام حُسینؑ کے حملۂ آخر کو نظم کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اس صف سے گئے، بیچ سے اس غول کے نکلے　　جو فوج چڑھی منہ پہ اسے رول کے نکلے
انبوہ سے یوں تیغِ دو سر تول کے نکلے　　گویا درِ خیبر کو علی کھول کے نکلے
اک زلزلہ تھا ئہ فلک و ہفت طبق کو
ہر بار اُلٹ دیتے تھے لشکر کے ورق کو

یہ رزمِ حسین علیہ السلام رقم کرتے ہوئے اور اس حماسۂ حُسینی کو کامیابی سے بیان کرتے ہوئے بھی انیس امام حُسینؑ کے امامِ امت اور وارثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کے رُخ کو بھی محسوس کرتے ہوئے فوراً ایک بند کہتے ہیں کہ جو امامؑ کی اس انتہا کی شجاعت کے ساتھ رافت و رحمت

کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے جس سے خود سامعین کے دلوں میں انقلاب پیدا کرتا ہے:

لڑتے تھے مگر غیظ سے رحمت تھی زیادہ　　شفقت بھی نہ کم تھی جو شجاعت تھی زیادہ
نانا کی طرح خاطرِ امت تھی زیادہ　　بیٹوں سے غلاموں کی محبت تھی زیادہ
تلوار نہ ماری جسے منہ موڑ تے دیکھا
آنسو نکل آئے جسے دم توڑ سے دیکھا

اس رزم میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب امام مظلومؑ اپنے تنِ اطہر پر تیروں تلواروں اور نیزوں کے زخموں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔اس مقام پر انیس نے کوشش کی ہے کہ زخموں کے مشاہدے کے ساتھ ساتھ ان کی تکلیف کا بھی احساس ہو۔

کی شہ نے جو سینے پہ نظر پونچھ کے آنسو　　سب چھاتی سے تھے پہلوؤں تک تیرِ سہ پہلو
ہر سمت سے تیغیں جو لگاتے تھے جفا جو　　سالم نہ کلائی تھی نہ شانہ تھا نہ بازو
برگشتہ زمانہ تھا شہِ تشنہ گلو سے
پھل برچھیوں کے سُرخ تھے سیّد کے لہو سے

امام حُسینؑ کے وقتِ آخر کی کیفیت بھی مذکورہ صلاحیت کو بروئے کار لانے کا تقاضا کرتی ہے۔اس مقام پر انیس کا مندرجہ ذیل بند ذکر کرنا مناسب معلوم ہو رہا ہے:

گر کر کبھی اٹھے کبھی رکھا زمیں پہ سر　　اُگلا لہو کبھی تو سنبھالا کبھی جگر
حسرت سے کی خیام کی جانب کبھی نظر　　کروٹ کبھی تڑپ کے اِدھر لی کبھی اُدھر
اٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے
تیر اور تن میں گڑ گئے جب منہ کے بل گرے

چند ساعتوں میں تنہا امام حُسین علیہ السلام کے احساس اور ان کی ذات، حتی کہ ان کی مظلومیت کے کئی ابعاد کو اس سطح تک محسوس کرتے ہوئے رقم کرنا انیس کی اپنی محدود ذات کو قربان کر کے اس وسیع و بسیط وجود میں محو ہونے کا ہی نتیجہ معلوم ہو رہا ہے۔لہٰذا اس مقام پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسی صلاحیت کے نتیجے میں تخلیق کی گئی نظم ایک ایسی شاعری ہے ہے جو قاری کو متن میں معنی تلاش کرنے کی اجازت دے کر وقت اور جگہ کی وسعت میں اسے شاعر کے ساتھ مکالمے میں مشغول رکھتی ہے۔اس طرح یہ صلاحیت نہ صرف شاعر کی خوبی ہے بلکہ تخلیقی عمل میں حصہ لینے کی دعوت کی صورت میں، قاری کے لیے ایک تحفہ ہے۔

کیٹس کی دنیا طرح انیس کا دشتِ بلا بھی ایک جامد، اور فقط معروضی طور پر معلوم ہستی نہیں ہے، بلکہ یہ انسانی ذہن کی ایک سیال اور مسلسل حرکت کرتی ہوئی تخلیق ہے اور اس سیال کی حرکت خود انیس کی موجودات اور انسانی کرداروں میں نفوذ کرنے کی کوشش کے سبب سے ہے۔اور یہی وہ شے ہے جو ''عظیم شاعری'' کو ''محض شاعری'' سے ممتاز کرتی ہے۔

مرثیۂ انیسؔ میں حضرت امام حسینؑ کے ہندوستان آنے کا تذکرہ

زائر حسین ثالثی

ہندوستان اور عراق کے درمیان فاصلہ تو ہزاروں کلومیٹر کا ہے لیکن موجودہ دور کی برق رفتار سواریوں نے اس فاصلے کو بہت آسان کر دیا ہے۔لیکن سفر کی یہ سہولیات آج سے ۱۴۰۰ رسال پہلے نہیں تھی جب محرم سن ۶۱ ہجری میں حضرت امام حسینؑ نے ہندوستان آنے کی خواہش ظاہر کی اس وقت امام حسینؑ کو یزیدی فوج نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، ان پر پانی بند کر دیا تھا، امامؑ نے فوج کے سپہ سالار عمر بن سعد سے کہا کہ ''تم مجھے راستہ دے دو میں ہندوستان چلا جاؤں'' تب سے لے کر اب تک ہندوستان میں ہر مذہب وملت کے لوگ حضرت امام حسینؑ سے جو عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اس کی مثال دوسرے ملکوں میں کم ہی نظر آتی ہے۔

ہندوستان میں محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی نہ صرف مسلمانوں کے دل اور آنکھیں غم حسینؑ میں جھلک اٹھتی ہیں بلکہ ہندوؤں کی بڑی بڑی شخصیتیں بھی بارگاہ حسینؑ میں خراج عقیدت پیش کرتی نظر آتی ہیں۔

دنیا کے ہر مذہب میں مقتدر شخصیتیں گزری ہیں اور کسی بھی مذہب کا دامن بلند و بالا ہستیوں سے خالی نہیں ہے جن کی عظمت ماننا ہی پڑتی ہے۔لیکن حضرت امام حسینؑ کی بین الاقوامی حیثیت ان کی ذات سے ہر شخص کو اتنی گہری محبت ہے جتنی کہ کسی کو کسی سے نہیں ہے۔اب دنیا کی کسی بھی پڑھی لکھی شخصیت سے اگر حضرت امام حسینؑ سے متعلق معلوم کریں گے تو وہ اس بات کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ یقیناً حضرت امام حسینؑ اپنے نظریات میں تنہا ہیں اور ان کی عظمت کو تسلیم کرنے والی دنیا کی ہر قوم اور دنیا کا ہر مذہب اور اس کے تعلیم یافتہ افراد ہیں۔

چونکہ ہندوستان مختلف مذاہب کو ماننے والوں کا مرکز ہے اور حضرت امام حسینؑ کی شخصیت میں ایسی کشش پائی جاتی ہے کہ ہر قوم ان کو خراجِ عقیدت پیش کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔وقت کے امامؑ کو مستقبل کی خبر ہوتی ہے حضرت امام حسینؑ کے ہندوستان آنے کی خواہش ہندوستانیوں کو امامؑ سے جو محبت ہے وہ حضرت امام حسینؑ کربلا کے میدان میں ہی آنے والی نسلوں میں دیکھ رہے تھے۔اگرچہ امام حسینؑ کی ہندوستان آنے تمنا پوری نہ ہوئی لیکن ان کی شہادت کے بعد بہت سے ایسے واقعات اور معجزات ملتے ہیں جن سے امامؑ کا ہندوستان آنا ثابت ہوتا ہے۔

میر انیسؔ کو دشتِ کربلا کا عظیم ترین سیّاح قرار دیا گیا ہے۔ہندوستان میں محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی مجلس و ماتمِ حسینؑ کی جوشان اور رونق ہوتی ہے اس کی مثال کہیں اور ملنا مشکل ہے۔میر انیسؔ نے جس شان سے اپنے مرثیہ

''ہے زیورِ عروسِ سخن پنجتنؑ کی مدح''

میں حضرت امام حسینؑ کا بہ اعجاز ہندوستان آنا بیان کیا ہے شاید ہی کسی دوسرے مرثیہ نگار کے یہاں یہ منظر کشی نظر آئے۔

مرثیے کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے کہ ؎

ہے زیورِ عروسِ سخن پنجتنؑ کی مدح　　زینت کلام کی ہے رسولؐ زمن کی مدح
ہے لذّتِ زباں شہؑ خیبر شکن کی مدح　　آرام و جان و دل ہے حسینؑ و حسنؑ کی مدح
ہر دم یہ ذکر باعثِ عیش و سرور ہے
دل کی جو روشنی ہے تو آنکھوں کا نور ہے

پھر امام حسینؑ کی مدح میں یہ بند بھی بہت خوبصورت انداز میں کہے ہیں ؎

محبوبؐ ذوالجلال کا پیارا حسینؑ ہے　　مہر عرب کی آنکھوں کا تارہ حسینؑ ہے
بعد از حسنؑ امام ہمارا حسینؑ ہے　　بخشش کا عاصیوں کی سہارا حسینؑ ہے
سب کو اسی کی حشر کے دن احتیاج ہے
حقّا کہ اس کے سر پہ شفاعت کے تاج ہے

اس کے بعد میر انیسؔ نے حضرت امام حسینؑ کی مدح میں مسلسل کئی بند نظم کئے ہیں۔ ذکر حضرت امام حسینؑ کر کے رونا یا رُلانا عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور گناہوں کی بخشش کا سبب بھی ہے۔ حضرت رسولؐ خدا نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہؑ زہرا سے فرمایا کہ:

''اے فاطمہؑ قیامت کے دن ہر آنکھ روئے گی سوائے اس آنکھ کے جو حسینؑ کے مصائب پہ روئی اور وہ جنت کی نعمات کو دیکھتی ہوئی نظر آئے گی۔''

میر انیسؔ رونے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ؎

ذکرِ حسینؑ حق کی عبادت سے کم نہیں　　رونے کا اجر اجرِ شہادت سے کم نہیں
نالہ ہر اک اذان و اقامت سے کم نہیں　　ہر صف کشی نمازِ جماعت سے کم نہیں
مسجد سے اوج پست ہے کب اس مقام کا
وہ گھر خدا کا ہے تو یہ گھر ہے امامؑ کا

ماہِ محرم شروع ہوتے ہی عزاخانوں میں علم، پٹکے، تعزیے سجادئے جاتے ہیں۔ میر انیسؔ تعزیہ خانے کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عزاخانے کے در کو دیکھ کر گلشن ارم رشک کرتا ہے تو صبا جنت کی خوشبو لے کر دمبدم آتی ہے۔ عزاخانے کی خوشبو کی شان ایسی ہے کی رضوانِ جنت آ کر اگر اسے سونگھے تو وہ شمیم بہشت کو بھول جائے ؎

رفعت کروں میں تعزیہ خانے کی کیا رقم　　ہے جلوہ گاہِ روحِ رسولؐ فلک حشم
ایک ایک در ہے رشکِ درِ گلشنِ ارم　　آتی ہے بوئے خلد صبا لے کے دمبدم
سونگھے اگر فتیلۂ عنبر سرشت کو
رضواں بھی بھول جائے شمیمِ بہشت کو

ہے کہکشاں کو شوق کہ میں رہ گزر بنوں　　خورشید کو ہوس ہے کہ قندیلِ در بنوں
زُہرہ کو آرزو ہے کہ رشکِ قمر بنوں　　ہے لو لگی ہوئی کہ چراغ آن کر بنوں
کہتے ہیں نجم اختر طالع بلند ہوں
مجمر بنے جو مہر تو ہم بھی سپند ہوں

منبر پہ روضہ خوانی کرنے والے کا اندازِ بیان ہو یا علَم کی شان، مجلس میں جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ کے آنے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ۔

ہیں پست اوج پایہ منبر سے نہ فلک　　منبر پہ روضہ خواں ہے کہ ہے عرش پر ملک
پٹکوں کا نوراور علم پاک کی جھلک　　جس کی چمک زمین سے ہے آسماں تلک
مجلس میں مومنوں نے جو آنسو بہائے ہیں
دیکھو دعا کو ہاتھ علم نے اٹھائے ہیں

ہے جلوہ گر جو حضرت عباسؑ کا علم　　شوکت وہی ہے رعب وہی اور وہی حشم
مشکِ سکینہؑ دیکھ کے لگتے ہیں تیرِ غم　　ہیہات ایسے شیر کے بازو ہوئے قلم
ہر دم رہے نہ کیوں دلِ زہراؑ بھرا ہوا
ہے آج تک لہو سے پھریرا بھرا ہوا

پھر مرثیہ کے آگے کے بند میں میر انیسؔ کربلا میں روضۂ حضرت امام حسینؑ کے متولی پارسا کی زبانی حضرت امام حسینؑ کے ہندوستان آنے کا ذکر کرتے ہیں۔

رونق ہو کیوں نہ تعزیہ خانوں میں جا بجا　　ہوتے ہیں خود شریک شہنشاہِ کربلا
کرتا ہے نقل اک متولی پارسا　　یعنی ہوا فلک پہ جو ظاہر مہِ عزا
عیش جہاں دلوں کے فراموش کر گیا
سب شہر مثل کعبہ سیہ پوش ہو گیا

بزمِ عزا تھا روضۂ سلطانِؑ مشرقین　　دن رات مجلسیں تھیں بس اور ماتمِ حسینؑ
مردوں میں شور سینہ زنی عورتوں میں بین　　آتی تھی فاطمہؑ کی صدا ہائے نورِ عین
جس دم بیاں شہادت سرورؑ کے ہوتے تھے
زوار قتل گاہ میں جا جا کے روتے تھے

پھر روضۂ حضرت امام حسینؑ کا متولی پارسا ذکر کرتا ہے کہ ایک رات میں نے غور سے روضے پہ نظر کی تو دیکھا کہ مرقد پہ اداسی چھائی ہوئی ہے، نہ گنبد پہ وہ نور نہ ہی ضریح پہ رونق ہے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے شہر سے سفر کر جائے۔

اک شب جو میں نے غور سے روضہ پہ کی نظر　　دیکھا اداسی چھائی ہے مرقد پہ سر بسر
صندوق پہ وہ نور نہ رونق ضریح پر　　جس طرح بادشاہ کرے شہر سے سفر
ہے عرش، پر وہ زینتِ عرشِ بریں نہیں
ثابت یہ تھا مکاں تو ہے لیکن مکیں نہیں

متولی پارساذکر کرتا ہے کہ اسی اضطراب میں کئی شب وروز گزر گئے اور چہلم کے بعد میانِ خواب میں دیکھا کہ روضہ میں شہِ آسماں جناب (حضرت امام حسینؑ) جلوہ گر ہیں ایسا لگتا ہے کہ ضریحِ پاک برجِ آفتاب ہے۔فرشے حضرت امام حسینؑ کی شان پر قربان ہورہے تھے۔ زمین پہ جابجا چاندنی بکھری تھی تو نور آسمان تک جاتا تھا۔اور مولاؑ اپنے چاہنے والوں کے لئے دعا کررہے تھے۔

کرتے تھے ہاتھ اٹھائے ہوئے حق سے یہ دعا　　یا غافر المعاصی و یا واہب العطا
بہر نبیؐ و حیدرؑ و زہراؑ و مجتبیٰؑ　　کچھ اور دے نہ اکبرؑ و اصغرؑ کا خوں بہا
امت کے واسطے مرے پیاروں کو بخش دے
یارب گناہ تعزیہ داروں کے بخش دے

جب شاہِ تشنہ لب (حضرت امام حسینؑ) دعا سے فارغ ہوئے تو متولی پارسا نے بصد ادب قدم پر جھک کر عرض کی۔

فارغ جو اس دعا سے ہوئے شاہِ تشنہ لب　　کی عرض میں نے جھک کے قدم پر بصد ادب
خادم یہیں رہا ہے محرم میں روز و شب　　رونق جو آج ہے یہ نہ تھی اس کا کیا سبب
ہر سو ہجومِ حسرت و اندوہ و یاس تھا
مولاؑ کمال روضہ انور اداس تھا

متولی پارسا کی بات سن کر حضرت امام حسینؑ کہتے ہیں کہ؛

کیا یاں نہ تھے حضورؑ کہا آپ نے کہ ہاں　　میں نورِ حق ہوں عرشِ خدا ہے مرا مکاں
ہے ہر جگہ ظہور زمیں ہو کہ آسماں　　تھا شیعیانِ ہند کا شبیرؑ میہماں
تربت تو یاں ہے کیوں مرے زائر اداس تھے
جو کربلا سے دور ہیں ہم ان کے پاس تھے

مصروف دل سے ہیں مرے غم میں وہ خوش سیر　　سر پیٹنے میں ہوتے ہیں دس دن انھیں بسر
بر میں سیاہ لباس تو رخ آنسوؤں میں تر　　مجلس نہ جس میں ہو کوئی ایسا نہیں ہے گھر
ہر چند کس جگہ مرا گھر دہر میں نہیں
ماتم جو کچھ ہے واں یہ کسی شہر میں نہیں

آداب تعزیت میں ہیں مصروف صبح و شام　　سو سو طرح کا نذر میں کرتے ہیں اہتمام

لب پر کبھی درود و تحیّت کبھی سلام　　حرمت ضریح کی ہے علم کا ہے احترام
رتبے میں تربتوں کو وہ قرآں سمجھتے ہیں
منبر کو اور ضریح کو ایماں سمجھتے ہیں

پیاسوں کا ذکر تشنہ دہانی ہے جابجا　　چشموں سے آنسوؤں کی روانی ہے جا بجا
ہم کو ملا نہ جو وہی پانی ہے جا بجا　　نوحے ہیں اور مرثیہ خوانی ہے جا بجا
دل ان کے بے کسی پہ مری درد ناک ہیں
سینے تو ہیں کبود گریبان چاک ہیں

دروازے پہ سبیلیں ہیں لنگر ہیں جا بجا　　رستے ہیں مثلِ آئینۂ قلب با صفا
بازار میں بلند ہے سقّوں کی یہ صدا　　پی لو یہ آب بہرِ شہنشاہِ کربلا
پیاسے نہ جاؤ نذرِ حسینؑ قتیل ہے
تھا جس کا قحطِ آب وہی پانی سبیل ہے

کیا عشق ہے کہ نام پہ میرے فدا ہیں سب　　کیوں کر نہ ہوں غلام شہؑ لافتا ہیں سب
غم خوارِ اہلبیتؑ رسولؐ خدا ہیں سب　　مظلوم کے ہیں دوست کثیر البکا ہیں سب
سبطِ نبیؐ کی پیاس پہ آنسو بہاتے ہیں
خنجر کا نام سن کے تو غش ان کو آتے ہیں

سنتے ہیں نامرادیٔ قاسمؑ کا جب بیاں　　سر پیٹتے ہیں سب بنے دولھا بصد فغاں
غل کرتے ہیں کہ مر گئے عباسؑ نوجواں　　اکبرؑ کے غم سے چشم کسی کی ہے خوں فشاں
جب ذکر تشنہ کامیٔ اصغرؑ کے ہوتے ہیں
کرتوں سے منھ کو ڈھانپ کے بچے بھی روتے ہیں

پیاسے رہے ہیں ساتویں تاریخ سے جو ہم　　شربت پہ نذر دیتے ہیں وہ صاحب کرم
ہوتا ہے آٹھویں سے تو سب شہر بزمِ غم　　تابوت واں اٹھاتا ہے کوئی کوئی علم
روحِ علیؑ بھی ساتھ محبّوں کے ہوتی ہے
زہراؑ ہر ایک بزم میں جا جا کے روتی ہے

دُلدُل بنا کے لاتے ہیں وہ سب بہ چشم تر　　مجلس کے لوگ پیٹتے ہیں اٹھ کے اپنا سر
چھینٹیں لہو کی زین پہ اور تیر اِدھر اُدھر　　ہرنے سے وہ لٹکتی ہوئی تیغ اور سپر
غش آتے ہیں کلیجوں پہ شمشیر پھرتی ہے
آنکھوں میں ذوالجناح کی تصویر پھرتی ہے

ہوتی ہے جب عیاں وہ شب حسرت و ملال		جس کی سحر کو قتل ہوا فاطمہؑ کا لال
ہوتا ہے فرطِ غم سے عجب عورتوں کا حال		ماتم میں کھول دیتی ہیں اپنے سروں کے بال
ہر تعزیہ کے سامنے یوں بین ہوتے ہیں
جیسے کسی عزیز کی میت پہ روے ہیں

روتی ہیں بیبیاں جو گھروں میں بہ شور و شین		اس وقت یاد آتے ہیں زینبؑ کے مجھ کو بین
چلاّتی ہیں جو لڑکیاں ہے ہے مرے حسینؑ		یاد آتی ہے سکینہؑ مجھے اپنی نور عین
ان کی بکا سے تیر الم دل پہ چلتے ہیں
غربت پہ اپنی خود مرے آنسو نکلتے ہیں

کیوں شاہِ دیں کے تعزیہ دارو سنا یہ حال		کرتا ہے خود تمھاری ثنا فاطمہؑ کا لال
کیا روز ہے نصیب خوشا حشمت و جلال		کس مرتبہ خوشی ہیں شہنشاہِ خوشخصال
سجدہ کرو کہ نذر تمھاری قبول ہے
رونا قبول تعزیہ داری قبول ہے

۱۴۰۰ برس پہلے کربلا کے ریتیلے میدان میں نہرِفرات کے کنارے حق وباطل کی جولڑائی ہوئی تھی اس میں ایک طرف حضرت امام حسینؑ اپنے ۷۲۔۔مسافر ساتھیوں کے ساتھ تھے اور دوسری طرف یزید کے لاکھوں سپاہی تھے جو حضرت امام حسینؑ اوران کے ساتھیوں کواس وجہ سے قتل کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے کہ امام حسینؑ نے یزید کی ظالم حکومت کو ماننے سے انکار کردیا تھا جوزبان سے کہنے کے لیے مسلمانوں کی حکومت تھی لیکن اس کا چلن حضرت امام حسینؑ کے نانا رسولِؐ خدا کے بتائے ہوئے اورسکھائے ہوئے طریقوں سے بالکل الگ تھا۔غریب آدمی تلوار کی حکومت اورظلم وبربریت کی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں بہت بری طرح پس رہے تھے۔حضرت امام حسینؑ غریب عوام کی دکھ درد سے بھری چیخ پکار سن کر ان کے بار بار کے بلاوے سے مجبور ہوکر گرمی اوردھوپ کی شدّت کی پرواہ کیے بغیر گھر سے اپنے بھائی، بھتیجوں، بھانجوں، بیٹوں، بیٹیوں، بہنوں، زوجہ وغیرہ کے ساتھ نکلے تھے۔اور مسلسل کئی مہینوں کے سفر کے بعد کربلا پہنچے دریا کے کنارے خیمہ لگایا لیکن یزیدی لشکر نے آکر چاروں طرف سے گھیرلیااور حسینؑ مظلوم کا خیمہ دریا کے کنارے سے ہٹادیا۔حضرت امام حسینؑ لڑائی لڑنا اورخون بہانا نہیں چاہتے تھے انھوں نے دریا سے بہت دور خیمے لگالئے۔حضرت امام حسینؑ کے ساتھ عورتیں اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے جن کی وجہ سے حضرت امام حسینؑ کے بہادر ساتھی لڑنے کے لیے آمادہ ہوگئے لیکن امام حسینؑ نے ان کو سمجھا بجھا کرلڑائی سے روک دیا ورنہ جولڑائی چھ سات دن بعد ہوئی وہ اسی وقت پانی کے لیے شروع ہوجاتی ان دنوں میں امام حسینؑ نے کئی مرتبہ یزیدی لشکر کے سپہ سالار سے بات چیت کی مگر کوئی سمجھوتا نہ ہوسکا۔

جب حضرت امام حسینؑ گھر سے نکلتے ہیں تو ان کے ساتھ بھی بہت سے آدمی تھے لیکن ان کے بار بار یہ کہنے سے کہ ''میں حکومت کی خواہش اور لالچ میں نہیں جارہا ہوں میرے ساتھ رہنے والوں کے لیے موت کا سامنا ہے'' آپ کے اس بیان سے بہت سے لوگوں نے

آپ کا ساتھ چھوڑ دیا صرف ۷۲ جیالے جو آپ سے سچی محبت کرتے تھے وہ آپ کے ساتھ رہے۔

حضرت امام حسینؑ نے اپنے دشمنوں سے کہا کہ تم لوگوں میں بہت ایسے آدمی ہیں جنھوں نے مجھے چٹھیاں لکھ کر بلایا تھا اور اب تم لوگ انجان ہو گئے ہو تو مجھے مدینہ واپس جانے دو میں لڑائی جھگڑا کرنا اور خون بہانا نہیں چاہتا مگر جب کسی نے ان کی باتیں نہیں سنیں تو اس وقت حضرت امام حسینؑ نے آخری بات یہ کہی کہ ''اچھا مجھے راستہ دو کہ میں ہندوستان چلا جاؤں''۔

میدان کربلا میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے جس بے مثال شجاعت، صبر و تحمل اور قربانی کا مظاہرہ کیا وہ آنے والے وقتوں میں بھی عالم انسانیت کے لئے مشعل راہ بنی رہے گی۔

مرثیہ کی میراث انیسؔ کو اجداد سے منتقل ہوئی تھی مگر ان کی طبعِ رواں، ذاتی لیاقت، کربلا سے ایمانی وابستگی نے میر انیسؔ کو مرثیہ نویسی اور مرثیہ خوانی کے فن میں طاق بنا دیا۔ میر انیسؔ کا معمول تھا کہ شب بھر جاگتے مطالعہ و تصنیف میں مصروف رہتے۔ ان کے پاس دو ہزار سے زائد قیمتی اور نایاب کتب کا ذخیرہ موجود تھا۔ میر انیسؔ نے مرثیے کو ترقی کے اعلیٰ درجہ تک پہنچا دیا۔ ان کے مرثیے اب تک کروڑوں آنکھوں، زبانوں اور سماعتوں کو اپنے ملکوتی خصائل کا گواہ بنا چکے ہیں۔ میر انیسؔ کے کہے ہوئے مرثیوں میں آیات و روایات، تاریخ و تخیل، ماحول، سراپا، رجز، مظلومیت، آہ و بکا، مکالمات، اعداد و شمار، منطق و فلسفہ کی ایسی متوازن آمیزش ملتی ہے کہ میر انیسؔ کے علم و فضل کی وسعتیں بیکراں محسوس ہونے لگتی ہیں۔

❁❁❁❁

رباعی

ملکِ سخن کے لوح و قلم کے رئیس تھے　　کیسے عدیق کہ سارے مضامیں سلیس تھے
کرتی تھی روز فکرِ رسا عرش کا طواف　　پیغمبرِ سخن بھی جنابِ انیسؔ تھے

اشفاق نجمیؔ

میر انیسؔ شعرا کی نظر میں

علی عرفانؔ

انیسؔ کے لیے دیگر شعرا کے دل میں جتنی عقیدت ہے اُتنی کسی اور شاعر کے نصیب میں نہیں آئی۔ جب میں نے منظوم نذرانے جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کے باوجود میرے سامنے تقریباً ستّر شعرا کے نام آئے جن میں سے پچاس نام میں نے شمولیت کے لیے منتخب کیے۔

اس ذیل میں نہ جانے کتنے اور شعرا ہونگے جن کے نام بھی میرے سامنے نہ آسکے۔ میری دلی خواہش بلکہ دعا ہے کہ اب اور مرتّبین سامنے آئیں اور ایک ''مستدرک'' ترتیب دیں جس میں انیسؔ کے لیے کہے گئے وہ منظوم نذرانے شامل ہوں جو یہاں چھوٹ گئے ہیں۔

اجملؔ، اجملی:

اللہ رے یہ معجزۂ فنِّ متحیر　　ہر بیت بے پناہ ہے شہکار ہر سطر
آہنگ پر نگاہ تھی اصوات پر نظر　　ترتیب حرف میں نہیں نا جنس کا گذر
جو لفظ جس جگہ ہے ہلایا نہ جائے گا　　ایسا زباں شناس تو پایا نہ جائے گا

کیا قدرتِ بیان ہے کیا حسنِ کار ہے　　موضوعِ شعر ایک ہے صورت ہزار ہے
ہر بیت واقعات کی آئینہ دار ہے　　مقصود ہو غلو تو ثریا شکار ہے
تخئیل و تجربے کی کڑی ٹوٹتی نہیں　　اُڑتا ہے آسماں پہ زمیں چھوٹتی نہیں

ہیرو سبھی عظیم مگر حسنِ ذات اور　　سِن مختلف مزاج الگ تجربات اور
موصوف ایک سے ہیں بیانِ صفات اور　　زینبؑ کی شان اور ہے اکبرؑ کی بات اور
تشکیک و شائبے کا سخن درمیاں نہ ہو　　عباسؑ بولتے ہوں تو حُرؑ کا گماں نہ ہو

امجد علی اشہریؔ:

ملا انیسؔ سے میں لکھنؤ میں ہوں دوبار　　انیسؔ وہ جو خدائے سخن تھے بے تکرار

گوپی ناتھ امنؔ:

انیسؔ شاعرِ یکتا زبانِ اردو کا　　عجیب اس کے ہر ایک شعر میں اثر دیکھا

کلام اس کا بصیرت فروزِ عالم ہے　　نہ اور ایسا کوئی صاحبِ نظر دیکھا
ہر ایک شعر ہے گویا کہ سَلکِ مروارید　　ہر ایک نظم کو گنجینۂ گہر دیکھا
یہی بہت ہے کہ اشعار انیسؔ کے دیکھے　　نہ یوں تو ہم نے کوئی خلد کا ثمر دیکھا
یہ دل میں تھا کہ کہوں اس کو میں خدائے سخن　　میں چپ رہا جو میاں شیخ نے اِدھر دیکھا

آرزوؔ لکھنوی:

کشورِ نظم میں گذرا ہے یہ بے مثل رئیس　　ہاں خدا چاہے تو پیدا ہو کوئی اور انیسؔ

باقرؔ امانت خانی:

مردِ میدانِ سخن تھے فن کے ماہر تھے انیسؔ　　جس کو فطرت نے سنوارا تھا وہ شاعر تھے انیسؔ
ان کے جوہر نے کیا احساں سخن کے تاج پر　　مرثیہ گوئی کو پہنچایا حدِ معراج پر
مدحتِ عباسؑ کی آب بقا میں ڈوب کر　　لکھّے کیا کیا مرثیے رنگِ وفا میں ڈوب کر
چشمِ حق آگاہ میں ان کا بڑا معیار ہے　　ان کا ہر اک مرثیہ اردو کا اک شہکار ہے
رکھتے ہیں خاکِ زمینِ شعر یہ چھانی ہوئی　　ان کے گھر کی ہے زباں آفاق میں مانی ہوئی
آئینہ اقسامِ صنعت کا بنا ان کا کلام　　جانتے تھے وہ صنائع اور بدائع کا مقام
دلربائی کا سلیقہ ہے ادائے پند میں　　روزمرّہ کی مثالیں ملتی ہیں ہر بند میں
نظم میں تشریح کر دی صنعتوں کے نام کی　　شعر میں تصویر کھینچی صنعتِ ایہام کی
ان کو حاصل تھی بلاغت صرف کرنے کی تمیز　　کہتے ہیں جس کو فصاحت ان کے گھر کی تھی کنیز
کیا سنوارا صنعتِ تفصیل کی تسبیح کو　　ہوں عرب حیراں جو دیکھیں صنعتِ تلمیح کو
سینکڑوں الفاظ سے دامن زباں کا بھر دیا　　یعنی اردو کے خزانے میں اضافہ کردیا
لفظیں ڈھلتی ہیں جہاں وہ ہے دبستانِ انیسؔ　　کیوں نہ ہو اُردو زباں پر بارِ احسانِ انیسؔ
درد کی دنیا میں احساسات کو پالا کیے　　قلب کے جذبات کو اشعار میں ڈھالا کیے
عالمِ غم کا اثر اشعار میں یوں بھر دیا　　مرثیوں میں ان کے کھنچ کر آگئی ہے کربلا
کیا قیامت کا اثر ہے بین کے آہنگ میں　　ڈھل گئی ہیں مجلسیں ان مرثیوں کے رنگ میں
بات جو ان میں تھی وہ اب تک کسی میں بھی نہیں　　سینکڑوں آئے نظر ان کے سخن کے خوشہ چیں
ختم ہوتی ہے کہاں جاکر کمالِ فن کی حد　　مرثیہ ان کا لغت ہے ان کا فرمانا سند
قول ہے باقرؔ دبیرِ خوش بیاں کا کیا نفیس　　''طورِ سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیسؔ''

اے انیسؔ سخن آرا ہے زباں تیری کنیز　　نطق ہے عبدِ تکلّم کی ہے جاں تیری کنیز
بندہ غلمانِ سخن حورِ بیاں تیری کنیز　　بہتے دریا کی قسم طبعِ رواں تیری کنیز

لفظیں تیار ہی رہتی ہیں اطاعت کے لیے　　دست بستہ ہے فصاحت تیری خدمت کے لیے

قصرِ ایجادِ سخن میں نئے در لگتے ہیں　　باغ میں تیرے سلاست کے شجر لگتے ہیں
ان میں تیرے ہی تصرّف سے ثمر لگتے ہیں　　تیرے مضمون کو جبریلؑ کے پر لگتے ہیں
قوّتِ ذہنِ رسا بن گئی دمساز تری　　سدرۂ اوجِ سخن منزلِ پرواز تری

اہلِ دل مرثیوں سے قلب کو پگھلانے لگے　　نالے اتنے بڑھے تا چرخِ کہن جانے لگے
اشک آنکھوں سے غمِ شاہؑ میں ٹپکانے لگے　　مرثیہ پڑھ کے زیارت کا شرف پانے لگے
تیرے اشعار کی تاثیر جگہ پانے لگی　　کربلا مرثیوں میں تیرے نظر آنے لگی

اے انیسؔ سخن آرا ہے بڑا تیرا وقار　　قلب کی لوح پہ لکھنے کے ہیں قابل اشعار
شکلیں اشعار کی ہیں پھول تو مضمون بہار　　تیرا مرقد ہے حقیقت میں فصاحت کا مزار
کفِ افسوس بلاغت بھی یہاں ملتی ہے　　تیری تربت ہی پہ تو شمعِ زباں جلتی ہے

تیری تحریر میں عرفان نظر آتا ہے　　قلبِ افکار میں ایمان نظر آتا ہے
رزم کے بند میں میدان نظر آتا ہے　　مرثیہ نوحؑ کا طوفان نظر آتا ہے
لیکن افکار کا معیار کہیں گر نہ سکا　　تیرے مضمون پہ پانی تو کبھی پھر نہ سکا

باقرؔ زیدی:

مرثیہ رشکِ دبستانِ ادب ہے کہ نہیں　　مرثیہ حسنِ فراوانِ ادب ہے کہ نہیں
مرثیہ یوسفؑ کنعانِ ادب ہے کہ نہیں　　مرثیہ فکرِ حسینانِ ادب ہے کہ نہیں
لے گئی اوجِ ثریا پہ اسے فکرِ انیسؔ　　مرثیے کا ہے جہاں ذکر وہاں ذکرِ انیسؔ

اب بھی اورنگِ سخن زیرِ نگیں ہے وہ انیسؔ　　ہر سخنور ہے سخن جس کا حسیں ہے وہ انیسؔ
جس کا ثانی کوئی عالم میں نہیں ہے وہ انیسؔ　　برسرِ فرشِ سخن عرش نشیں ہے وہ انیسؔ
وادیٔ شعر میں کیا راہ نمائی کی ہے　　ایک اللہ کے بندے نے خدائی کی ہے

وہ مفکر کہ جدا سب سے جس کی تفکیر　　وہ مدبر کہ تدبر سے بدل دے تقدیر
وہ مفسر کہ ہر اک لفظ ہے گویا تفسیر　　وہ مصور کہ جو لفظوں میں دکھا دے تصویر

بزم آئینۂ فردوس بریں کی صورت　　رزم غارت گری دشمنِ دیں کی صورت

وہ سخنور کہ سخن جس کا ہے بے مثل و عدیل　　نہ کوئی اس کی نظیر اور نہ کوئی اس کا مثیل
تھا گراں جس کی طبیعت پہ سوا حرفِ ثقیل　　آبِ دریائے سخن علم کے پیاسوں کی سبیل
افقِ نظم کے روشن مہ و اختر دیکھو　　اس کے لفظوں میں جو پوشیدہ ہیں جوہر دیکھو

لب کی تشبیہ سے دے پھول کی پتی کو زباں　　استعارہ لکھے قامت کا تو ہو سروِ رواں
حسنِ تعلیل سے ذرّوں پہ ہو تاروں کا گماں　　جیسے محرابِ سخن میں کوئی دیتا ہو اذاں
آج تک تو نہ چمک مہر کے پرتو سے گئی　　اور نہ اقلیمِ سخن اس کی قلم رو سے گئی

خُسروِ کشورِ اردو تو انیسؔ آج بھی ہیں　　سب ہیں انّیس مگر یہ ہیں کہ بیس آج بھی ہیں

گوہرِ نطق برستا ہوا آبِ نیساں　　وہ سلاست وہ روانی کہ ہو دریا کا گماں
آبِ کوثر سے وہ دھوئی ہوئی پاکیزہ زباں　　دین ہے اس کی فصاحت تو بلاغت ایماں
ادب و شعر میں قرآن کی صورت ہیں انیسؔ　　مذہبِ مرثیہ گوئی کی شریعت ہیں انیسؔ

منوہرلال بہارؔ:

اے فدائے آلِ احمدؐ اے پرستارِ حُسینؑ　　اے غلامِ حیدرِ کرّار غم خوار حُسینؑ
ماتمِ شبیرؑ میں ایسا چلا تیرا قلم　　اشکِ خونیں سے کیا حالات کو تو نے رقم
تو نے اپنے مرثیے میں بھر دیا سوزِ حیات　　کانپتی ہے آج نوحے سے ترے یہ کائنات
مجتہدِ عالم مفکر ماہرِ علم و ہنر　　منفرد ذاکر معلم صاف دل بالغ نظر
زندۂ جاوید ہے تو اے انیسِؔ ذی وقار　　تیرے مداحوں میں شامل ہے بہارؔ خاکسار

تصویرؔ فاطمہ:

نہیں شمار اگرچہ بلند بینوں میں　　کہ میں بھی ہوں ترے خرمن کے خوشہ چینوں میں
یہ تیری شاخِ ثمربار یہ ترے خوشے　　انہیں سے مجھ کو ملے ہیں نئے نئے گوشے
ہیں ہر طرف جو مضامینِ نو کے یہ انبار　　ہر ایک شاخِ سخن پر سجی ہوئی ہے بہار
ترے خیال سے اپنے خیال بنتی ہوں　　میں جب بھی مرثیہ لکھتی ہوں پھول چنتی ہوں
تھے خاندان میں میرے کئی اہم شعرا　　انیسؔ جن کے سخن کے لیے تھے راہ نما
جمیلؔ مظہری سے ہے مرا نسب نامہ　　کہ جن کی فکرِ سخن نے مرا قلم تھاما

ہوئی ہے جن کی زیارت سے اب نظر محروم　　تھے سائباں مرے حرفوں کا ثاقبؔ مرحوم
خیال یہ جو حسین و نفیس رکھتے تھے　　یہ اپنے ذہن میں طرزِ انیسؔ رکھتے تھے
انیسؔ نام ترا آگہی کا منبر ہے　　سخن وروں میں نہ تجھ سا کوئی سخن ور ہے
ترے کلام میں وہ روشنی نظر آئی　　ہجومِ وقت میں اک زندگی نظر آئی
ترا خیال ترا فن ہی کہکشاں ٹھہرا　　ہمارے واسطے تو میرِ کارواں ٹھہرا
جو رہنمائی ہمیشہ ترا کلام کرے　　تو میری مرثیہ گوئی تجھے سلام کرے
جو تیری بادِ بہاری کو پا رہا ہے دماغ　　ترے چراغ سے میں بھی جلا رہی ہوں چراغ
ہزار رنج ہیں لیکن یہ اہتمام تو ہے　　نہ مظہریؔ ہیں نہ ثاقبؔ ترا کلام تو ہے
ترے اثر میں تری ضو میں آنا چاہتی ہوں　　کہ میں بھی تیری قلمرو میں آنا چاہتی ہوں
مرے سخن مری تحریر کو زباں دے دے　　یہی دعا ہے کہ تصویرؔ کو زباں دے دے

میرزا تعشقؔ:

اگرچہ اور تعشقؔ تھے کہنے کو ہم عصر　　مگر انیسؔ سا کوئی نہ خوش بیاں دیکھا

ثاقبؔ لکھنوی:

جانِ وطن انیسؔ بہارِ چمن انیسؔ　　دنیائے شاعری میں خدائے سخن انیسؔ
ہر واقعے میں فکر و تخیل کے ربط سے　　ترتیب دے گئے ہیں عجب طرزِ فن انیسؔ

راگھویندر راو جذبؔ عالمپوری

القصہ بڑھی ہوئی ہے ان کی تقدیس　　جو چھوڑ گئے ہیں لاکھوں اشعارِ نفیس
ایسے شاعر کا بھولنا سہل نہیں　　بھولے گا نہ حشر تک کوئی نامِ انیسؔ

جمیلؔ مظہری:

گرچہ دعوت دے رہا ہے بحرِ ذخّارِ انیسؔ　　اپنی غوّاصی کا بیڑا میں ڈبو سکتا نہیں
اس کی موجیں یم بہ یم اور اس کی وسعت بے کراں　　اس سمندر کو قلم میرا بلو سکتا نہیں
گرمیِ گفتار کو حرکات کو رفتار کو　　اے مصور تو لکیروں میں سمو سکتا نہیں
یہ تو ہے اک ساحرِ شامِ اودھ کا معجزہ　　مانیؔ و بہزادؔ سے یہ کام ہوسکتا نہیں
دھل گئی اُردو مثالِ چادرِ حورانِ خلد　　کون کہتا ہے زباں کو کوئی دھو سکتا نہیں
معدنِ فن میں ہیں اب لعل و گہر کے اتنے ڈھیر　　دامنِ تنقید جن کا بوجھ ڈھو سکتا نہیں
مرثیہ اک آنسوؤں کا کھیت ہے اس کھیت میں　　اس طرح موتی کوئی فنکار بو سکتا نہیں

جوشؔ ملیح آبادی:

اے دیارِ لفظ و معنی کے رئیس ابنِ رئیس　　اے امینِ کربلا ، باطل فگار و حق نویس
ناظمِ کرسی نشین و شاعرِ یزداں جلیس　　عظمتِ آلِ محمدؐ کے مورخ ، اے انیسؔ
تیری ہر موجِ نفس روحِ الامیں کی جان ہے　　تو مری اردو زباں کا بولتا قرآن ہے

تجھ میں اندازِ جنوں بھی طرزِ دانائی بھی ہے　　لکھنؤ کا ناز بھی دلّی کی برنائی بھی ہے
آتشِ موسیٰؑ بھی ہے آبِ مسیحائی بھی ہے　　قیس کی بھی کروٹیں لیلیٰ کی انگڑائی بھی ہے
تجھ میں ذوقِ گریہ بھی شوقِ غزل خوانی بھی ہے　　آگ بھی ہے تیرے احساسات میں پانی بھی ہے

اے دبیرِ ملکِ و معنیٰ اے انیسؔ محترم　　اے شہنشاہِ سخن اے خسروِ سیف و قلم
دوش پر تیرے حسینؑ ابنِ علیؑ کا ہے علم　　اے شہِ گیتی وقار و شاعرِ گردوں حشم
رزم کے میداں میں تو چلتی ہوئی تلوار ہے　　بزم کی محرابِ زر میں کلکِ گوہر دار ہے

تیرے شہرِ جاں میں ہے آب و ہوائے کربلا　　چرخ زن تیری صدا میں ہے بکائے کربلا
ثبت ہے تیری جبیں پر ماجرائے کربلا　　نصب ہیں تیری زمیں پر خیمہ ہائے کربلا
خطبۂ زینبؑ کا زیر و بم ہے تیرے ساز میں　　شہپرِ جبریلؑ جنباں ہیں تری آواز میں

ہر تارِ نگاہ ذوالفقارے کر دی　　واللہ اے انیسؔ کارے کردی

حالیؔ:

اُردو گو راج چار سو تیرا ہے　　شہروں میں رواج کو بہ کو تیرا ہے
پر جب تک انیسؔ کا سخن ہے باقی　　تو لکھنؤ کی ہے اور لکھنؤ تیرا ہے

دلّی کی زبان کا سہارا تھا انیسؔ　　اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیسؔ
دلی جڑ تھی تو لکھنؤ اس کی بہار　　دونوں کو ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیسؔ

حلمیؔ آفندی

ہے گلشنِ ادب میں جو خوشبو انیسؔ کی　　شہرت ہے باغِ ہند میں ہر سو انیسؔ کی
حلمیؔ ہیں دونوں لازم و ملزوم بالیقیں　　اُردو کے ہیں انیسؔ ، ہے اُردو انیسؔ کی

کیوں فزوں تر نہ ہو مقامِ انیسؔ　　جب ہے جانِ ادب کلامِ انیسؔ
تا قیامت رہے گا وابستہ　　نامِ اردو کے ساتھ نامِ انیسؔ

شاہنشۂ اردوئے معلّٰی تھے انیسؔ　　گویا کہ سخن دانوں میں یکتا تھے انیسؔ
تھا علم کا لاریب خزینہ سینہ　　دُرہائے مضامین کا دریا تھے انیسؔ

مرزا دبیرؔ:

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں　　طورِ سینا بے کلیمؑ اللہ منبر بے انیسؔ

زائرؔ امروہوی:

فطرتِ انسانیت کا معتبر محضر انیسؔ　　واقعاتِ کربلا کا مستند دفتر انیسؔ
منتخب گلدستۂ شعر و سخن ہر مرثیہ　　رکھ گئے لفظوں کے کیا کیا پھول چُن چُن کر انیسؔ
نذرِ مولا کے لیے اعلیٰ تبرک چاہئے　　یوں لٹاتے ہیں مضامیں کے دُر و گوہر انیسؔ
ہے زباں دانی کی زائر ان کی یہ ادنیٰ ثنا　　شعر کی جنّت انیسؔ اور نظم کا کوثر انیسؔ

اخترؔ آصف زیدی:

اے انیسؔ شاہِ والا ، نازنینِ لکھنؤ　　تجھ سے قائم ہے عزا میں شہ نشینِ لکھنؤ
خَم نہ ہو کیوں تیرے قدموں پر جبینِ لکھنؤ　　کربلا میں تُو نے رکھ دی ہے زمینِ لکھنؤ
کِلک سے تیرے چمکتے ہیں نگینِ لکھنؤ　　شاعروں نے تھام لی حبل اُلمتینِ لکھنؤ
تیرے پہلو میں درخشاں ہے ثمینِ لکھنؤ　　ارضِ خاکِ لکھنؤ کے بہترینِ لکھنؤ
اِس قدر شاداب ٹھہری سرزمینِ لکھنؤ　　اک دبیرِ آسماں ، اک تُو متینِ لکھنؤ
تُو تعارف کا ذریعہ کربلا کے واسطے　　محرمِ ذِکرِ عزا ہیں محرمینِ لکھنؤ
تیرے لفظوں کی کشش ، تیری متاعِ فکر سے　　کربلا اعراق سے آئی قرینِ لکھنؤ
تُو مُہاجر ہو کے بھی لوگوں میں کب تھا اجنبی　　صادقینِ لکھنؤ میں ، تُو امینِ لکھنؤ
اِس کو بھی لاریب کے زُمرے میں رکّھا چاہیے　　دامِ وہم و ریب سے باہر یقینِ لکھنؤ
راستہ تحقیق کا اِصرار کرتا ہے ، کہو　　مرثیے کا قدّ و قامت ہے رہینِ لکھنؤ
اِن میں شامل ہیں نفیس و مُونسِ کرب و بلا　　کر دیئے تُو نے مقرّر جانشینِ لکھنؤ

کیا موڈّب ، کیا مہذّب ، کیا تعشّق ، کیا رَوِش　　کس کو ، کس کو مَیں لکھوں گا عارفینِ لکھنؤ
واقفِ اَوج و عروج و فائز و فاخر تو ہو　　وہ مورّخ جس نے دیکھے ہوں سِنینِ لکھنؤ
مَیں خداوندِ سخن تجھ کو نہیں کہتا ، مگر　　دل سے تجھ کو مانتا ہُوں قائدینِ لکھنؤ
عہدِ حاضر میں ، تجمّل ، سالک و ماہر ، مِلے　　مَیں بھی آصِف ہوگیا ہُوں واقفینِ لکھنؤ

ساجدؔ رضوی:

اے عظمتِ کلام کی روح رواں انیسؔ　　باقی ہے تیرے نام سے اُردو زباں انیسؔ
سچ تو یہ ہے کہ تیری گراں مایہ شاعری　　تاریخِ معتبر ہے اک اُردو زبان کی

سمجھایا رازِ سوزِ دروں کائنات کو　　روشن کیا ہے تو نے چراغِ حیات کو
حق کا سبق سنا بھی ہے تو نے دیا بھی ہے　　شبیرؑ کے جہاد میں حصہ ترا بھی ہے

ساجدؔ علی:

ملبوسِ سخن پر جو ستارے ہیں انیسیؔ　　لگتا ہے کہ ٹانکے گئے ہیں تارِ وحی سے
مخمل پہ ہے ساجدؔ کا لکھا ٹاٹ کا پیوند　　مخمل بھی انیسیؔ کہ جو سنبھلا نہ کسی سے

سبطِ جعفر زیدی:

کیا بتائیں کہ کیا ہیں میر انیسؔ　　فکر کی انتہا ہیں میر انیسؔ
آسمانِ ادب کی کاہکشاں　　آپ کے نقشِ پا ہیں میر انیسؔ
نازشِ شیعیانِ پاک و ہند　　میرؔ و غالبؔ ہیں یا ہیں میر انیسؔ
مرثیے کا ہے میرِ قافلہ کون　　ہر کسی نے کہا ، ہیں میر انیسؔ
جس کو مشکل ہو مدحِ حیدرؑ میں　　اس کے مشکل کشا ہیں میرانیسؔ
ماضی و حال اور مستقبل　　علم و تہذیب کا ہیں میر انیسؔ

سخنؔ فتح پوری:

انیسؔ اب بھی تو زینتِ انجمن ہے　　انیسؔ اب بھی تو شمعِ بزمِ سخن ہے
جسے فکرِ نو آج کہتی ہے دنیا　　نگارش کا تیرے وہ نقشِ کہن ہے

سردارؔ نقوی:

رہے تابہ حشر جو ضوفگن وہ مہِ دوام انیسؔ ہیں　　جو دے مجلسوں کو حیاتِ نو وہ نیا نظام انیسؔ ہیں

سیّد جاوید حسن:

یہ آج جو رثا کے چمن میں بہار ہے　　سب دامنِ انیسؔ کا گرد و غبار ہے

سیّد ہاشم رضا:

انیسؔ تیرا دبستاں کھلا ہے چار طرف　　ریاضِ مدحتِ شبیرؑ کا ثمر دیکھا
سند ہیں شعر ترے مستند زباں تیری　　ترے ہنر کا ہے پرتو جدھر جدھر دیکھا

شاہدؔ نقوی:

کمالِ اوج زباں کا اشاریہ ہیں انیسؔ　　اگر انیسؔ نہیں ہے تو کچھ نہیں اردو

مرید حسین شائق:

ہزار انیسؔ کی شاعر کیا کریں تقلید　　مگر انیسؔ کی منزل رسائی سے ہے بعید
انیسؔ آج بھی ہے میرِ کاروانِ ادب　　وہی ہے راہبرِ جادۂ قدیم و جدید

شہابؔ کاظمی:

پھر مرثیہ نگاری کا یاور ہوا نصیب　　اس فن کو ایک ایسا سخنور ہوا نصیب
گلزارِ لکھنؤ کو گُلِ تر ہوا نصیب　　آئینۂ یقین کو جوہر ہوا نصیب
آغوشِ میرانیسؔ میں پلنے کے واسطے　　لے آیا تخت پھولنے پھلنے کے واسطے

مرزا محمد اشفاق شوقؔ:

اُردو تری حیات کا عنواں انیسؔ تھے　　بزمِ ادب کی شمعِ فروزاں انیسؔ تھے
چرخِ سخن کے مہرِ درخشاں انیسؔ تھے　　اقلیمِ شعر و نظم کے سلطاں انیسؔ تھے
ہے آج تک زبان پہ قبضہ انیسؔ کا　　ملکِ سخن میں چلتا ہے سِکّہ انیسؔ کا

اصغر حسین طالبؔ

تجھ پر انیسؔ مرحمتِ ذوالجلال ہے　　بس فنِ شاعری میں تجھی کو کمال ہے

طاہرؔ جرولی:

ہے بیچ و بیچ بہشتِ بریں کے قصرِ حسین　　اِدھر مکانِ انیسؔ و اُدھر مکانِ دبیرؔ

عابدؔ حشری

محترم یوں تو ہے جو بھی مرثیہ گو ہے مگر　　ہے انیسؔ اپنی جگہ پروردگارِ مرثیہ

عرشؔ ملسیانی:

بہت ہوئے ہیں یہاں ماہرانِ گلشنِ راز　　دکھا سکا نہ کوئی تہہ نشیں خزینوں کو
ذرا انیسؔ کی جدّت طرازیاں دیکھو　　بلند جس نے کیا شعر کی زمینوں کو

علیؔ عرفان:

سرورؑ سے جو وفائے انیسؔ و دبیرؔ ہے　　قدموں میں شہؑ کے جائے انیسؔ و دبیرؔ ہے
ملکِ سخن پہ راج کسی اور کا نہیں　　یہ مملکت برائے انیسؔ و دبیرؔ ہے
مٹ جاتا اس زباں کا نشاں بھی جہان سے　　اُردو تو بر بنائے انیسؔ و دبیرؔ ہے
احساس اپنا رہتا ہے جس کربلا میں آج　　وہ صاف کربلائے انیسؔ و دبیرؔ ہے
مداحوں میں حسینؑ کے اپنا شمار ہو　　یہ التجا خدائے انیسؔ و دبیرؔ ہے
کس منہ سے خود کو کہہ دے وہ سرورؑ کی خاکِ پا　　عرفاںؔ تو خاکِ پائے انیسؔ و دبیرؔ ہے

عزّتؔ لکھنوی

مرثیے کا دُرِ شہوار و مجلّیٰ ہیں انیسؔ　　موجۂ فکر میں مضمون کے دریا ہیں انیسؔ
ذوقِ شعری ہے زمیں عرشِ معلّیٰ ہیں انیسؔ　　مدحتِ شاہؑ کا وعدہ ہے کہ یکتا ہیں انیسؔ
برتر از دعبلؔ و فردوسی و مقبلؔ ہیں انیسؔ　　نظمِ شیرازی و حنانؔ کا حاصل ہیں انیسؔ

جوشؔ و اقبالؔ ہوں یا آرزوؔ و شادؔ و وزیرؔ　　مونسؔ و انسؔ ہوں عارفؔ ہوں کہ ہوں اوجؔ وخبیرؔ
محشرؔ و رشکؔ و صفیؔ بحرؔ و نظرؔ داغؔ و امیرؔ　　سب کا ادراک اسی زمزمہ دانی کا اسیر
شبلیؔ و حالیؔ و آزادؔ کی منزل ہیں انیسؔ　　جستجو نام ہے اردو کا تو حاصل ہیں انیسؔ

عمرؔ انصاری:

گنجینۂ افکار و معانی ہیں انیسؔ　　کوثر ہیں انیسؔ اس کی روانی ہیں انیسؔ
کہتی ہی رہے گی جس کو دنیا تا حشر　　دنیائے ادب کی وہ کہانی ہیں انیسؔ

فضلؔ نقوی:

دلوں کو درد دیا ذہن کو سکون دیا　　انیسؔ تُو نے زبان و ادب کو خون دیا

فیضؔ بھرت پوری:

مرثیہ گوئی میں کرتا ہوں میں تقلیدِ انیسؔ　　جو بہ ہر زاویہ اقلیمِ سخن کا ہے رئیس
ہے زباں جس کی سلیس اور بیاں بھی ہے نفیس　　ہو نہ ہم پلّہ کبھی ، مل کے کہیں گر دس بیس
غیر کی طرزِ بیاں میں یہ روانی ہی نہیں　　یہ وہ شاعر ہے کہ جس کا کوئی ثانی ہی نہیں

سیّد فیضیؔ:

وہ آسمانِ شعر یہ ہر سو ہے ضوفگن　　فکر و نظر سے اس کی منور ہیں اہلِ فن
لہجہ ہو اس کا طرز ہو تیور ہو یا پھبن　　ہر بات میں انیسؔ کی ہے قدرتِ سخن
معیارِ فن جو اس نے بنایا ، نہ رد ہوا　　جو لفظ جیسے باندھ دیا مستند ہوا

قسیمؔ امروہوی:

آج بھی مرثیہ گویوں کو ہے درکار قلم　　روشِ فکرِ انیسؔ کا طرح دار قلم

قمرؔ حسنین:

سب کا انیسؔ ہے وہ قمرؔ اس یقین پر　　ہوں گامزن خدائے سخن کی زمین پر

قیصرؔ بارہوی:

کیا گھٹا سکتی ہے دنیا عظمت و شانِ انیسؔ　　ہم عزاداروں کے سینے ہیں خیابانِ انیسؔ
جوشؔ نجمؔ آلِ رضا قیصرؔ نسیمؔ امروہوی　　یہ عنادل آج بھی ہیں نغمہ سنجانِ انیسؔ

مصورؔ سبزواری:

فن میں ہوجاؤں مصورؔ میں بھی ہم رنگِ انیسؔ　　معجزہ مجھ سے کبھی سرزد یہ ہوسکتا نہیں

میکشؔ اکبرآبادی:

بُھلائے کیسے جنابِ انیسؔ کو وہ شخص　　کرے جو ذکرِ امامِ حسینؑ عرش مقام
امیرِ لفظ و معانی فصیح سحر بیاں　　زباں کنیز مضامین اس کے گھر کے غلام
کسی سے نقل بھی اس کے کلام کی نہ بنی　　وہ بے مثال سخنور وہ مرثیے کا امام

نجمؔ آفندی

جو اہلِ دل ہیں سمجھتے ہیں وہ مقامِ انیسؔ　　یہ فنِ مرثیہ گوئی میں اہتمامِ انیسؔ
حسینیتؑ کی جو خدمت انیسؔ نے کی ہے　　رہے گا تا بہ قیامت بلند نامِ انیسؔ

نسیمؔ امروہوی:

انیسؔ چہرہ نویسِ نگارِ شعر و سخن　　کمالِ فکر کا اک معجزہ انیسؔ کا فن

دماغِ شعر ہے طبعِ انیسؔ سے روشن　　کہ صدق و حق ہے تخیّل میں اس کے جلوہ فگن
شفق ہے رنگِ سخن رفعتِ نظر مطلع　　جوابِ مطلعِ خورشید اس کا ہر مطلع

انیسؔ محرمِ اسرارِ سیرت و کردار　　انیسؔ زورِ بیان و جلالتِ افکار
انیسؔ فطرتِ آدم کا آئینہ بردار　　انیسؔ منبرِ شعر و سخن پر عرش وقار
فرازِ فن پہ کسی سے بھی زیردست نہیں　　جہاں نشیبِ سخن ہے وہاں بھی پست نہیں

انیسؔ عقدہ کشائے تصوراتِ بشر　　انیسؔ قافلہ سالارِ کاروانِ ہنر
خیال و ذہن کی پیچیدگی سے جس کا گذر　　نفس نفس کی نظر نفسیاتِ انساں پر
سخن میں جذبۂ احساس کو رواج دیا　　ہر ایک نفس کو بالکل نیا مزاج دیا

انیسؔ ماہرِ رمزِ حیاتِ انسانی　　کتاب غم کا مرقع نگارِ لاثانی
مذاقِ شعر میں خلّاقِ ذوقِ ایمانی　　بیانِ واقعہ میں طرزِ فکر کا بانی
فقط تفننِ شعری سے جس کو کام نہیں　　دل و دماغ کا ہے آئینہ کلام نہیں

ملا انیسؔ کے در سے بہ فیضِ مدحتِ آلؑ　　زباں کو نطق بیاں کو عروج فن کو کمال
اسی کی شمعِ تجدّد کا نور ہیں فی الحال　　نسیمؔ و نجمؔ و رضاؔ جوشؔ و حالیؔ و اقبالؔ
اس انقلاب سے کیا کیا سبق ادب نے لیے　　بقدرِ ظرف و بقدرِ مذاق سب نے لیے

نشورؔ واحدی

جانِ وطن انیسؔ بہارِ چمن انیسؔ　　دنیائے شاعری میں خدائے سخن انیسؔ
ہر واقعے میں فکر و تخیل کے ربط سے　　ترتیب دے گئے ہیں عجب طرزِ فن انیسؔ
اپنا زمانہ اپنے قلم سے سنوار کر　　تنہا رہے ہیں مالکِ ہر انجمن انیسؔ

نیسانؔ اکبرآبادی:

قدرت بیاں کی ایسی کسی کو ملی نہیں　　جیسی انیسؔ کی ہے کوئی شاعری نہیں

نتھونی لال وحشیؔ:

کی فکرِ انیسؔ رہنمائی تُو نے　　اُردو کو نئی راہ دکھائی تُو نے
سنتے تھے جو چوڑیوں کا نغمہ ان کو　　تلوار کی جھنکار سنائی تُو نے

سَو راہیں انیسؔ نے دکھائیں ہم کو　　قسمیں جذبات کی بتائیں ہم کو
انسان کے سازِ دل پہ اُنگلی رکھ کر　　سَو طرح کی دھڑکنیں سنائیں مہم کو

ہلالؔ نقوی:

عروجِ فکر و تخیل کی انتہا ہیں انیسؔ　　پیمبرِ سخن و دینِ مرثیہ ہیں انیسؔ

میرانیسؔ کے حوالے سے کہے گئے کلام کی تدوین کا سلسلہ نامِ خدا ۲۱ جنوری ۲۰۲۴ء کو شروع ہوا تھا اور ۳۰ ستمبر ۲۰۲۴ء کو اختتام پذیر ہوا۔ گویا اشعار کے پھول چننے میں اور اُن کا ہار گوندھنے میں نَو (۹) مہینے لگ گئے۔

اس کاوش میں ایک حقیقت صریحی طور پر سامنے آ گئی۔ وہ یہ کہ انیسؔ پر جتنا کلام کہا گیا ہے، جتنا منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے اس کی مثال اُردو ادب کیا، عالمی ادب میں بھی نہیں مل سکتی۔

اس مجموعے کا بیشتر کلام مختلف کتابوں سے لیا گیا ہے جن کی فہرست آگے آئے گی۔ اختر آصفؔ زیدی اور ساجدؔ علی کا کلام میری درخواست پر بالراست وصول ہوا ہے اور جناب سبطِ جعفر مرحوم کا کلام رضیؔ جعفری کے توسط سے مجھ تک پہنچا ہے۔ ان تینوں حضرات کا ممنون ہوں۔ اس تدوین کے سلسلے میں مجھے جناب شہابؔ کاظمی، ڈاکٹر ہلال نقوی اور اصغر مہدی اشعر سے جو حوصلہ افزائی ملی اس کے لیے ان سب کی خدمت میں بھی ہدیۂ تشکر پیش ہے۔

کتابیات:

۱۔ ماہنامہ ''آج کل''، انیس نمبر۔ مہدی عباس حسینی، ایڈیٹر
۲۔ ''اک سلسلہ سخن کا''، مرتبہ باقر زیدی
۳۔ ''بوستانِ عقیدت''، مرتبہ نور احمد میرٹھی
۴۔ جائزہ انیسؔ، ڈاکٹر عسکری صفدر
۵۔ ''رثائی ادب'' انیسؔ نمبر، ڈاکٹر ہلال نقوی، ایڈیٹر
۶۔ ''زندہ نشانات'' مجموعۂ مراثی، باقر امانت خانی
۷۔ ''ساونیر یومِ انیسؔ، ۱۹۶۳ء'' مرتبہ سیّد فرحت حسین موسوی
۸۔ ''فروغِ مرثیہ۔ ۱۳'' اصغر مہدی اشعر ایڈیٹر
۹۔ ''کلامِ انیسؔ'' مرتبہ فاروق ارگلی
۱۰۔ ''مہر کے پرتو سے'' مجموعۂ مراثی، شہاب کاظمی
۱۱۔ ''میرانیسؔ، ہر صدی کا شاعرِ اعظم''، مرتبہ ضمیر اختر نقوی
۱۲۔ ''نذرِ انیسؔ''، اصغر نقوی، ایڈیٹر

❁❁❁❁

اشاریۂ انیسؔ
(زیرِ طبع)

اشاریۂ دبیرؔ
(زیرِ طبع)

انیسؔ کی زبان پر اعتراض
کم علمی یا انیسؔ شناسی کا فقدان

صفدرؔ ہمدانی

ادب کو اردو کے رکھے جواں زبانِ انیسؔ　　کہاں خطیب کی باتیں کہاں زبانِ انیسؔ
خدا گواہ یہ اک معجزہ ہے دنیا میں　　ہے مرثیے کے لیے آسماں زبانِ انیسؔ
شعور چاہیئے ایسی زباں سمجھنے کو　　ہے جیسے نور کا دریا رواں زبانِ انیسؔ
ادب کے سر کے لیے تاج ہیں انیسؔ و دبیرؔ　　ہے دشت کرب و بلا میں اذاں زبانِ انیسؔ
یہ فرش والے نہیں آشنا ابھی صفدرؔ　　زباں ہے عرش کی ہاں بے گماں زبانِ انیسؔ

محرم الحرام ۲۰۲۴ء کے ایام عزا کی کراچی میں ہونے والی مجالس اور دیگر ادبی محافل میں انیسؔ و دبیرؔ اور مرثیے کا خوب خوب ذکر رہا اور یہ ذکر اس لیے بھی پاکستان بھارت اور دنیا کے دیگر ممالک میں عام ہوا کہ کراچی کی ایک ادبی محفل میں عہدِ موجود میں عوام میں مقبول ایک منبر نشین نے انیسؔ و دبیرؔ پر بہت بے درد تنقید کی، ان سے اس بات کی توقع اس لیے بہت کم کی جارہی تھی کہ وہ مرثیے کی ترویج اور انیسؔ و دبیرؔ سے محبت کا دعویٰ کرتے رہتے ہیں۔لیکن اس دعوے کے پردے میں انہوں نے خدایانِ سخن انیسؔ و دبیرؔ کے زبان و بیان اور عشق کربلا کی جیسے بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

مثال کے طور پر خطیب کا مجتہدِ مرثیہ مرزا دبیرؔ کے بارے میں یہ کہنا کہ انہوں نے توہینِ اہلِ بیتؑ کی ہے شاید اپنے قد اور دعویٰ علمیت سے بہت بلند بات ہے جس سے خود نقاد کی اپنی علمیت اور مرثیے سے بنیادی واقفیت کا پردہ چاک ہوجاتا ہے اور پھر خدائے سخن میر انیسؔ کے بارے میں انکا یہ فقرہ دنیا بھر میں عشّاقِ مرثیہ اور عاشقانِ انیسؔ کے دلوں پر خنجر کی طرح چلا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انیسؔ کی زبان۔۔۔۔۔۔۔۔انیسؔ کی زبان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کیا ہے انیسؔ کی زبان؟۔خطیب کے بولنے میں جو انیسؔ کی تضحیک اور تمسخر نمایاں ہوا وہ لکھے ہوئے اس فقرے میں شاید آپ محسوس نہ کرسکیں۔انیسؔ کی زبان کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے علّامہ کو انیسؔ کے سارے کلام میں ایک لفظ رانڈ ملا جو بقول انکے غیر مناسب لفظ ہے اور اسکی جگہ انیسؔ کو کوئی اور لفظ استعمال کرنا چاہیئے تھا۔وہ یہ بھول گئے جس عہد میں انیسؔ نے یہ لفظ استعمال کیا اسوقت اُس ماحول میں رانڈ، رنڈ سالا اور رنڈاپا عام اور مستعمل الفاظ تھے۔میں تو یہاں تک عرض کروں کہ یہ تینوں لفظ آج بھی متروک یا معیوب نہیں بلکہ پاک و ہند کے معاشرے میں استعمال ہوتے ہیں۔بات یہاں تک ہی نہیں رہی موصوف

نے یہ بھی فرمایا کہ اگر انیسؔ آج زندہ ہوتے اور میں اس سُقم کی جانب اشارہ کرتا تو وہ اسے تبدیل بھی کر لیتے اور مجھے گلے بھی لگاتے۔ بات صرف انیسؔ تک ہی محدود نہیں رہی، تہورِ علمی میں منبر نشین نے دبیرؔ پر بھی توہینِ اہلِ بیتؑ کا الزام لگا دیا اور مرثیے کی توہین کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ مرثیہ نگار مصائب میں غلط روایات پیش کر کے لوگوں کو رُلا رُلا کر بے ہوش کرنے کو کامیاب مرثیہ نگاری سمجھتا ہے۔

ستاون برس سے مرثیہ نگاری کرنے والا مجھ جیسا طالب علم یہ فقرہ سننے کے بعد ورطۂ حیرت میں پڑ گیا کیا منبر نشین نے یہ اعتراض کر کے عزاداری اور گریے کی بنیاد میں بارود نہیں لگا دیا؟ عزاداری تو ہے ہی ماتم، نوحہ اور گریہ کا مجموعہ۔ اور پھر یہ ہی خطیب خود رونے کے حوالے سے برسوں سے تسلسل سے یہ منبر سے اس بات کو کہتے چلے آ رہے ہیں کہ مجلس عزا میں بنتِ رسولؐ مادرِ حسنینؑ تشریف لاتی ہیں اور گریہ کرنے والوں کے آنسو اپنے رومال میں لیتی ہیں کہ یہی آنسو شفاعت کی کلید ہیں۔

میرے نزدیک انیسؔ شناسی یا انیسؔ فہمی بالکل قرآن فہمی کی طرح ایک دقیق کام ہے۔ حافظِ قرآن ہونا اور قرآن فہم ہونا دونوں الگ الگ باتیں ہیں، اسی طرح مرثیے کی ترویج اور مرثیے سے محبت کا دعویٰ کرنا الگ بات ہے اور مرثیہ شناسی اور انیسؔ فہمی بالکل الگ بات۔

میر انیسؔ کا عہد زبان کے اعتبار سے کلاسیکی اقدار یا کلاسیکی قوتِ عصر کا عہد تھا، جس میں زبان و بیان کی باریکیاں، الفاظ، محاوروں کی صحت، رعایتِ لفظی و معنوی پر زور، صنعتوں کا التزام اور فصاحت و بلاغت کے سخت اصول تھے، جن سے انحراف ممکن نہیں تھا۔ میر انیسؔ نے اپنے کلام کو ایک مرصع ساز کی طرح ان محاسن سے آراستہ کیا۔ ان کی زبان اس عہد کی مثالی، شستہ و پاکیزہ زبان تھی۔ انیسؔ نے ان اقدار کا اپنے مرثیوں میں ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس پر فخر بھی کیا ہے اور مرثیہ نگاری کے جو بنیادی اصول یا پیرامیٹر صدیوں پہلے بتا دیئے تھے ان سے آج بھی انحراف تمام تر جدت پسندی کے باوجود ناممکن ہے۔

خدائے سخن میر انیسؔ نے مرثیہ نگاری کے آفاقی اصولوں کو کس سادگی سے اور کیسے اختصار سے خود ان چند مصرعوں میں مقید کر دیا ہے کہ اس موضوع پر کتابوں کی کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ مرثیے کے تاج محل کی بنیاد انیسؔ نے یوں رکھی ہے

طبع ہر ایک کی موزوں قدِ زیبا موزوں　　صورت سرو ازل سے ہیں سراپا موزوں
نثر بے سجع نہیں، نظمِ معلّیٰ موزوں　　کہیں سکتہ نہیں آ سکتا کجا ناموزوں
تول لے عقل کی میزاں میں جو فہمیدہ ہے
بات جو منھ سے نکلتی ہے وہ سنجیدہ ہے

یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال
معجزہ گر نہ اسے کہیے تو ہے سحرِ حلال

روز مرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی　　لب ولہجہ وہی سارا ہو فصاحت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی　　یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہوئے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہوئے

روزمرہ شرفا کا ہوسلاست ہووہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کون نقاد ہے جو یہ کہنے کی جرآت کرے کہ انیس نے اس بنیادی اصول کی پاسداری نہیں کی اوررانڈ جیسے الفاظ استعمال کیے جوشرفا کے نہیں۔

مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہوئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مرثیے کی بنیاد کا یہ پہلا اورواجبی ستون ہے کہ مرثیہ عربی کے لفظ رثا سے ہی تو نکلا ہے اوراب اگر کسی کو رثا کے معنی ہی معلوم نہ ہوں تو وہ یہی اعتراض کرے گا کہ مرثیہ نگار لوگوں کو رُلا رُلا کے بے ہوش کروانا چاہتا ہے کہ وہ اسی کو اپنی کامیابی سمجھتا ہے۔

خدائے سخن انیسؔ کے مرثیوں کی تعداد بارہ سو کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ پاکستان پنجاب لاہور کے معروف ومقبول ادبی مجلّہ نقوش کے انیسؔ نمبر میں میرانیس کے ۲۶ نایاب اورغیر مطبوعہ مراثی طبع کیے گئے تھے اور یہ ادبی نمبر میری ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔ محققین کے مطابق ان کے کئی مرثیے ابھی تک غیر مطبوعہ حالت میں مختلف بیاضوں کے اندر موجود ہیں۔ میرانیسؔ نے روایتی مرثیہ کے علاوہ سلام، قصائد، نوحہ اور رباعیات کا بھی کثیر ذخیرہ چھوڑا ہے۔ رباعیاتِ انیسؔ کی تعداد محققین کے مطابق چھ سو کے برابر ہے۔

مرثیے کا نقاد ہونا یا پھر مرثیے پر پی ایچ ڈی کر لینا، مرثیے کے موضوع پر درجنوں کتابیں شائع کروالینا، مرثیے کی ترویج وترقی کا دعویٰ کرنا، مرثیہ تحت اللفظ پڑھنا، یہ سب اوصاف ایک طرف اور مرثیہ کہنا یعنی مرثیہ لکھنا ایک طرف۔ کوئی بھی شاعر اللہ کی اجازت کے بغیر حمد کہہ سکتا ہے، پھر نعت کہنے کے لیے بھی صرف عشقِ رسولؐ ہی کافی ہے اللہ کے رسولؐ کا اجازہ ضروری نہیں لیکن مرثیہ کہنے کے لیے آلِ رسول بالخصوص امامؑ مظلوم اور والدہ حسنینؑ کی اجازت ضروری ہے اور یہی وہ مقام ہے کہ جہاں مرثیہ کہنا لکھنا ایک معجزاتی عمل ہے۔ غالبؔ ہر عہد ہر دور کا شاعر ہے بلا مبالغہ، لیکن تاریخِ ادب گواہ ہے کہ تین بند کہنے کے بعد غالبؔ نے مرثیہ نہ کہہ سکنے کا اعتراف کرلیا جبکہ صرف پانچ سو الفاظ کی جگالی کرنے والا نقاد کیسی بے دردی سے انیسؔ کی زبان پر سوقیانہ جملہ کس دے اور اسکے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے درباری مزاج نام نہاد ادیب شاعر گونگے بہرے ہوں۔

میں نے ابھی مرثیہ نگاری کے معجزاتی پہلو کا تذکرہ کیا اس کے لیے یہ طالب علم اپنی ذاتی مثالیں دے سکتا ہے لیکن مستند مثال خدائے سخن کے ایک نواسے میر عارفؔ کی تحریری یادداشت سے ملی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے اواخر میں میرانیسؔ نے ایک سو چورانوے بند یعنی ایک ہزار ایک سو چونسٹھ مصرعوں کا یہ شاہکار مرثیہ جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے ایک ہی شب میں لکھا اور اپنے خاندان کے عشرۂ مجالس میں پڑھا۔

آج صدیوں بعد بھی یہ مرثیہ تاریخ مراثی کا سرتاج ہے اور تحت اللفظ پڑھنے والے اس مرثیہ کو پڑھنا ایک امتحان سمجھتے ہیں

میرانیسؔ کے مقامِ سخن پر اُردو کا کوئی شاعر آج تک نہیں پہنچ سکا۔ انیسویں صدی میں مرثیے کو عروج تک لے جانے اور اُس کے مقامات کو نظم کرنے میں انیسؔ کا کردار بہت زیادہ ہے۔ یہ بھی اکثر احباب جانتے ہیں کہ میرانیسؔ ابتدا میں غزل کہتے تھے مگر والد کی نصیحت پر صرف سلام اور مرثیہ کہنے لگے اور پھر ایسے منہمک ہوئے کہ کبھی غزل کہنے پر توجہ ہی نہیں دی۔ شمس العلما مولانا محمد حسین آزادؔ نے انیسؔ کے اس وصف کو کیسی خوبصورتی سے کہا ہے کہ انیسؔ نے والد کی فرماں برداری میں غزل کو ایسا چھوڑا کہ بس غزل کو سلام کر دیا۔

انیسؔ کی زبان صرف انیسؔ کی زبان ہے کسی کا چربہ نہیں اور اسی زبان کا دبدبہ انکی غزل میں بھی موجود ہے، اگر میں اپنی حد سے تجاوز نہ

کروں تو انیس کی غزل کا اس جیسا شعر غالبؔ بھی نہیں کہہ سکے، حیاتِ انسان کو دو مصرعوں میں مقید کر دیا

انیسؔ دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

مرثیے کی میراث انیسؔ کو اجداد سے منتقل ہوئی تھی اور انیسؔ نے سلاستِ زبان، ادائیگی اور حسنِ بیان میں اپنے عہد کے راسخ البیان مرثیہ گو استاد جناب میر زا سلامت علی دبیرؔ اور دیگر اساتذۂ فن کو بھی مقبولیت میں قدرے پیچھے چھوڑ دیا۔

یہ سچ ہے کہ مرثیے کا آغاز عرب کی سرزمین پر ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ عربی شاعری کا آغاز ہی مرثیے سے ہوا تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ دور جہالت میں عربی مرثیہ خاصی ترقی کر چکا تھا۔ فارسی سے ہوتا ہوا مرثیہ اردو میں داخل ہوا۔ مرثیہ دراصل اردو شاعری کی تقریباً تمام اصناف بلکہ اردو ادب کی بھی کئی اصناف کا احاطہ کرتا ہے اور مرثیہ میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ادب کی دیگر اصناف میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً واقعہ، کردار نگاری، منظر کشی، کشمکش، مکالمہ، حالات و ماحول کی عکاسی۔ جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے تو مختلف ادوار میں مرثیہ کی ہیئت تبدیل ہوتی رہی ہے ابتدا میں مثنوی تو کبھی چومصرع کبھی مخمس اور پھر مسدس کی شکل میں مرثیہ لکھا گیا اور یہ اعزاز اردو زبان کو حاصل ہے کہ مسدس کی شکل میں مرثیہ خالص طور پر اردو کی ایجاد ہے اور اس میں انیسؔ و دبیرؔ کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

انیسؔ نے صنفِ مرثیہ کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ میر انیسؔ کے زمانے تک اردو خاصی نکھر اور سنور چکی تھی۔ میر انیسؔ کے کلام میں فصاحت و بلاغت کا بطور خاص ذکر کیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے علاوہ بھی دوسرے شاعرانہ لوازمات کے برمحل استعمال نے کلام انیسؔ کو عجیب حسن و شہرت عطا کی جس کی اب تک کوئی مثال پیش نہ کر سکا۔ انیسؔ نے مرثیہ کو اردو شاعری کی ایک مقدس و معتبر صنف کے طور پر پیش کیا۔ انیسؔ کے مرثیے کیونکہ واقعات کربلا، امام حسینؑ اور ان کے رفقا کی شہادت اور ان کے پس منظر و پیش منظر لکھے گئے ہیں اس لیے ان کی شہرت و مقبولیت کے باعث اب اردو ادب میں لفظ ''مرثیہ'' واقعات کربلا کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔

کسی بھی فن پارے کے متعلق فیصلہ کرنے کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں جن کے مکمل یا نامکمل ہونے پر فن پارے یا تحریر کو اعلیٰ و ادنیٰ قرار دیا جاتا ہے۔ نقادانِ فن اس سلسلے میں دو چیزوں کو اہم قرار دیتے ہیں ایک تو اس کا مقصد دوسرا انداز بیاں جس میں زبان کو اولیں حیثیت حاصل ہے۔ جب میر انیسؔ کے کلام کو ان اصولوں پر پرکھا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے ان کا کلام اعلیٰ معیاری ہی نہیں بلکہ مرثیہ نگاری اور اردو شاعری میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔

انیسؔ و دبیرؔ اور دیگر قدآور مرثیہ نگاروں کا یہ معجزاتی وصف کسی خطیب ذاکر یا منبر نشین سے سند کا طلبگار نہیں کہ جو بات مرثیہ نگار ایک بیت یا ایک مصرعے میں کہتا ہے وہی بات خطیب عشرے بھر کی مجالس میں کرتا ہے۔ یہی تو زبان اور بلاغت کا معجزہ ہے

انیسؔ و دبیرؔ تو خدایانِ سخن ہیں۔ انکی خاکِ پا تک پہنچنا بھی کارِ دارد۔ میں آپکی خدمت میں اس نصف صدی کی بڑے مرثیہ نگار حضرت قیصر بارہوی کے مرثیے کے دو مصرعے پیش کرتا ہوں کہ خطیب کو کتنے عشرے درکار ہیں عزاداری کے حق میں اس صداقت کو بیان کرنے کے لیے۔

مسجد کے سامنے تجھے ماتم ہے ناگوار　　دیتے نہ سر حسین تو پڑھتا نماز کون؟

انیسؔ کی زبان کی عظمت کی ذیلی پیداوار ہی انیسؔ کی بلاغت ہے اور سچ کہوں تو بلاغت ہے ہی سمندر کو کوزے میں بند کرنا۔ امام عالی مقام

سے لشکرِ یزید کے کسی فرد نے جب آپ کا نام ونسب پوچھا تو جوابِ امام نے دیا اس کو انیسؔ نے کس بلاغت سے ادا کیا:

یہ تو نہ کہہ سکے کہ شہِؑ مشرقین ہوں　　مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

انیسؔ کی زبان کو چیلنج کرنے والے اس سے صرفِ نظر نہ کریں کہ انیسؔ کے مرثیے کروڑوں اربوں آنکھوں کو رزقِ اشک عطا کر چکے ہیں۔ انیسؔ کے کہے ہوئے مرثیوں میں آیات وروایات، تاریخ، تخیل، ماحول، سراپا، رَجَز، مظلومیت، آہ وبکا، مکالمات، اعداد وشمار، منطق وفلسفہ، علومِ جہانی اور اصول وعقائد کے مفاہیم کی ایسی متوازن آمیزش ملتی ہے کہ انیسؔ کے علم وفضل کی وسعتیں بیکراں محسوس ہونے لگتی ہیں۔ انیسؔ کی زبان پر معترض ان بے شمار نقادوں کو کیا جواب دیں گے کہ جنھوں نے بار بار یہ کہا کہ انیسؔ کے مراثی کی مقبولیت کا پہلا ستون انیسؔ کی زبان ہے اور آپ پوچھتے ہیں کہ کیا ہے زبان انیس؟۔

اردو ادب کے محققین کے مطابق طویل تاریخ میں تراکیب وفرہنگ کا سب سے عظیم ذخیرۂ الفاظ میر انیس کے کلام میں ملتا ہے۔ عروض و قوافی، صرف ونحو، تراکیب، صنائع وبدائع، محاکات، محاورات اور بندشیں ان کے یہاں دست بستہ نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عمومی لُغات جب عاجز نظر آئیں تو ان خدایانِ سخن کے لسانی معجزات کو محفوظ کرنے کے لیے فرہنگِ انیسؔ اور فرہنگ دبیرؔ اختراع کرنا پڑیں۔

مجھے برملا کہنے دیجیے کہ عالمی ادب کے مقابل اردو میں اگر کوئی چیز آج بھی ہم پیش کر سکتے ہیں تو وہ میر انیسؔ کے مرثیے ہیں مگر افسوس کہ ہم نے ان مراثی کے دیگر زبانوں میں تراجم کی جانب توجہ ہی نہیں دی۔ رواں صدی کے مرثیہ نگار شاعر جوش ملیح آبادی نے میر انیسؔ کے لیے کہا:

اے دیار لفظ و معنی کے رئیس ابنِ رئیس　　اے امینِ کربلا ، باطل فگار و حق نویس
ناظمِ کرسی نشین و شاعرِ یزداں جلیس　　عظمتِ آلِ محمدؐ کے مورّخ اے انیسؔ

تیری ہر موج نفس روح الامیں کی جان ہے
تو مری اردو زباں کا بولتا قرآن ہے

بات کو مزید طول دیے بغیر صرف اتنا عرض کروں کہ تضحیکِ انیسؔ ودبیرؔ سے ان خدایانِ سخن کے مرتبے پر کوئی فرق نہیں پڑتا البتہ معترض کی اس میدان میں علمی سطح کا اندازہ ہو جاتا ہے

روئے زمیں پہ خالقِ اکبر کے ہیں سفیر　　لاریب ان کا کرب و بلا سے اٹھا خمیر
صفدرؔ عطا حسینؑ کی ہیں دو ہی معجزے　　اک معجزہ انیسؔ ہے اک معجزہ دبیرؔ

صفدر ہمدانی

خاندانِ میر انیسؔ کے مرثیہ گو شعراء

گوہرؔ لکھنوی

میرؔ ضاحک:-(میر انیسؔ کے پردادا)

(۱) میر غلام حسین تخلّص ضاحکؔ کے والد کا نام میر عزیز اللہ مخلصؔ دہلوی تھا ضاحک کی ولادت کی تاریخ اور سن نہ معلوم ہے۔ میر ضاحکؔ کے بیٹے میر حسنؔ تھے ضاحک کی وفات ۱۱۹۶ھ میں ہوئی اُس وقت اُنکی عمر ۶۰/ برس تھی اُنکی قبر فیض آباد میں ہے۔ میر ضاحکؔ کی ادبی خدمات میں۔ مرثیے، قصائد، غزلیں رباعیات اور ہجو یہ منظومات ہیں۔

میر حسنؔ:۔(میر انیسؔ کے دادا)

میر حسنؔ کا نام میر غلام حسن ہے اور انکے والد کا نام میر غلام حسین ضاحکؔ دہلوی ہے۔ میر حسنؔ کی ولادت ۱۱۴۰ھ مطابق ۱۷۲۳ء دہلوی میں ہوئی میر حسنؔ کی اولاد میں چار بیٹے، خلقؔ، خلیقؔ، مخلوقؔ اور محسنؔ تھے اُنکی وفات یکم محرمؔ ۱۲۰۱ھ مطابق ۲۴/اکتوبر ۱۷۸۶ء لکھنؤ کے ایک محلہ مفتی گنج میں ۶۱ برس کی عمر میں ہوئی ادبی خدمات میں مرثیے قصائد، سلام، رباعیات اور غزلیات ہیں۔

میر خلیقؔ:۔(میر انیسؔ کے والد)

میر انیس کے والد کا نام میر مستحسن اور تخلّص خلیقؔ تھا اُنکی ولادت ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۶ء فیض آباد میں ہوئی انکی اولاد میں تین بیٹے میر انیسؔ، میر اُنسؔ، میر مونسؔ تھے اور چار بیٹیاں، پیاری بیگم، بندی بیگم آبادی بیگم، ہرمزی بیگم تھیں۔ میر خلیقؔ کی وفات بروز اتوار ۸/جمادی الاوّل ۱۲۶۰ھ مطابق ۲۶/مئی ۱۸۴۴ء لکھنؤ میں ہوئی وفات کے وقت اُنکی عمر ۸۰ برس تھی اُنکی قبر نزد ریلوے پُل گومتی کے کنارے بھیم کا اکھاڑا لکھنؤ میں تھی۔ اب انکی قبر کا کوئی نشان وہاں موجود نہیں ہے۔ میر خلیقؔ کی ادبی خدمات میں دوسو(۲۰۰) مرثیے سو ۱۰۰ سلام، غزلیں اور رباعیات ہیں۔

میر اُنسؔ:۔ (میر انیسؔ کے منجھلے بھائی)

میر اُنسؔ کا نام میر مہر علی اور تخلّص اُنس تھا انکے والد کا نام ہر مُستحسن اور تخلّص خلیقؔ تھا، والدہ کا نام ہینگا بیگم تھا۔ اُنکی ولادت دوشنبہ ۲۰/اپریل ۱۸۰۷ء ۱۱ صفر ۱۲۲۳ھ محلہ گلاب باڑی فیض آباد میں ہوئی۔ اُنکی اولاد میں پانچ بیٹے۔ میر وحیدؔ، میر مہدیؔ، میر حسن خلیلؔ میر حسین سعیدؔ میر مرتضیٰ اور ایک دختر تھیں۔ میر اُنسؔ کی وفات ۶/محرّم ۱۳۱۰ھ جولائی ۱۸۹۲ء دوشنبہ کو ہوئی اُس وقت انکی عمر ۸۵ برس تھی اُنکی قبر مقبرۂ حکیم مہدی لکھنؤ میں ہے۔ ادبی خدمات میں ۴۴ مرثیے، ۵۰ سلام اور رباعیات، تضمین وغیرہ ہیں۔

میر مونسؔ:۔(میر انیسؔ کے چھوٹے بھائی)

میر مونسؔ کا نام میر محمد نواب اور والد میر خلیقؔ تھے والدہ کا نام ہنگا بیگم تھا میر مونسؔ کی ولادت ۵/محرم ۱۲۲۶ھ مطابق ۳۰/جنوری ۱۸۱۱ء

جمعرات کو ہوئی اہلیہ کا نام حاجی بیگم تھا۔ میر مونسؔ لاولد تھے۔ میر مونسؔ کی وفات ۱۹ رشوّال ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۷ رنومبر ۱۸۷۵ء جمعہ کے دن ۶۴ برس کی عمر میں ہوئی۔ اُنکی قبر مقبرۂ میر انیسؔ لکھنؤ میں ہے ادبی خدمات میں مرثیوں کی چھ ۶ جلدیں، مجموعۂ سلام، ''دیوانِ فصاحت''، رباعیات، دیوانِ غزلیات وغیرہ ہیں۔

میر نفیسؔ:۔(میر انیسؔ کے فرزندِ اکبر)

میر نفیسؔ کا نام میر خورشید علی اور تخلّص نفیسؔ تھا آپ میر انیسؔ کے فرزند اکبر تھے۔ والدہ کا نام فاطمہ بیگم تھا۔ نفیسؔ کی ولادت ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۶ء کو ہوئی اُنکی اولاد میں ایک بیٹا خورشید حسن عروجؔ اور دو بیٹیاں تھیں۔ میر نفیسؔ کی وفات ۱۳ رذیعقد ۱۳۱۸ھ مطابق ۲ رمارچ ۱۹۰۱ء بروز منگل ۸۵ ربرس کی عمر میں ہوئی اور اُنکی قبر مقبرۂ میر انیسؔ لکھنؤ میں ہے۔ ادبی خدمات میں ۱۰۰ مرثیے، مجموعۂ سلام ''ہدیۂ بیش بہا'' رباعیات، نوحہ جات ومناجات ہیں۔

میر رئیسؔ:۔(میر انیسؔ کے منجھلے بیٹے)

میر رئیس کا نام میر محمد عسکری اور تخلص رئیسؔ تھا رئیس میر انیسؔ کے منجھلے بیٹے تھے۔ والدہ کا نام فاطمہ بیگم تھا۔ رئیسؔ کی ولادت ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۰ء گلاب باڑی فیض آباد میں ہوئی۔ اولاد میں ایک فرزند احمد حسین سلیمؔ اور دو بیٹیاں تھیں۔ رئیسؔ کی وفات ۳۰ رربیع الثانی ۱۳۰۹ھ مطابق ۲ دسمبر ۱۸۹۱ء ۷۳ برس کی عمر میں ہوئی۔ اُنکی قبر مقبرۂ میر انیسؔ میں ہے۔ ادبی خدمات میں ۲۲ رمرثیے، غزلیات، سلام۔ رباعیات اور مخمّس وغیرہ ہیں۔

میر سلیسؔ:۔(میر انیسؔ کے چھوٹے بیٹے)

میر سلیسؔ کا نام میر محمد اور تخلّص سلیسؔ تھا آپ میر انیسؔ کے چھوٹے بیٹے تھے آپکی والدہ کا نام فاطمہ بیگم تھا۔ سلیسؔ کی ولادت ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء گلاب باڑی فیض آباد میں ہوئی۔ آپکے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھیں بیٹوں کے نام جلیسؔ۔ غیور۔ قدیم لکھنوی تھے آپکی وفات ۱۹ رربیع الاول ۱۳۰۸ھ مطابق ۲ رنومبر ۱۸۹۰ء کو ۶۳ برس کی عمر میں ہوئی آپکی قبر مقبرۂ میر انیسؔ لکھنؤ میں ہے۔

ادبی خدمات میں ۱۶ رمرثیے۔ دیوانِ غزلیات۔ سلام اور قصائد وغیرہ ہیں

میر وحیدؔ:۔(میر انیسؔ کے بھتیجے)

میر وحید کا نام میر محمد ہادی اور تخلص وحیدؔ تھا آپ میر انیسؔ کے بھتیجے تھے۔ آپکے والد کا نام میر مہر علی اُنسؔ تھا۔ وحیدؔ کی ولادت ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں ہوئی۔ آپکی اولاد میں ایک دختر اور دو فرزند سید تقی اور سید نقی تھے۔ وحیدؔ کی وفات ۲۳ رمحرم ۱۳۰۸ھ مطابق ۸ رستمبر ۱۸۸۶ء بروز دوشنبہ ۴۵ ربرس کی عمر میں ہوئی اور مقبرہ حکیم مہدی لکھنؤ میں تدفین ہوئی۔

ادبی خدمات میں ۲۷ مرثیے۔ ۲۵ سلام۔ رباعیات اور نوحہ جات ہیں۔

میر جلیسؔ:۔(میر انیسؔ کے پوتے)

جلیسؔ کا نام میر ابو محمد اور تخلّص جلیسؔ تھا آپ میر انیسؔ کے پوتے تھے آپکی ولادت ۱۸۵۸ء لکھنؤ میں ہوئی۔ آپکے والد کا نام میر سلیسؔ

تھا۔جلیسؔ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

(بتولی بیگم) دختر پیارے صاحب رشید جلیسؔ کی اہلیہ تھیں آپکی وفات ۲۴ر جمادی الاول ۱۳۲۵ھ مطابق ۵ر جولائی ۱۹۰۷ء ۴۹ برس کی عمر میں ہوئی۔جلیسؔ کی تدفین مقبرۂ میر انیسؔ لکھنؤ میں ہوئی۔

میر غیورؔ:۔(میر انیسؔ کے پوتے)

میر غیورؔ کا نام سید محمد نواب اور تخلّص غیورؔ تھا آپکے والد میر سلیسؔ تھے غیورؔ کی ولادت ۱۸۷۸ء لکھنؤ میں ہوئی آپکی اولاد میں ایک بیٹا جنکا نام ہاشم حسین اور تخلص حزیںؔ تھا اور دو بیٹیاں تھیں۔آپکی وفات ۱۳ر جولائی ۱۹۵۰ء لکھنؤ ۷۲ر برس کی عمر میں ہوئی۔مقبرۂ میر انیسؔ لکھنؤ میں تدفین ہوئی آپکی ادبی خدمات میں مرثیے۔سلام اور رباعیات ہیں۔

میر قدیمؔ:۔(میر انیسؔ کے پوتے)

قدیمؔ کا نام سید علی نواب اور تخلّص قدیمؔ تھا قدیمؔ سے پہلے سحرؔ تخلّص تھا قدیمؔ کے والد کا نام میر سلیسؔ تھا (قدیمؔ میر انیسؔ کے پوتے تھے) آپکی ولادت ۱۸۷۵ء فیض آباد میں ہوئی۔آپ لاولد تھے۔قدیمؔ کی وفات ۱۷ر رجب ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۴ر اپریل ۱۹۵۱ء منگل کے روز ۷۶ برس کی عمر میں لکھنؤ میں ہوئی اور مقبرۂ میر انیسؔ لکھنؤ میں تدفین ہوئی۔ادبی خدمات میں ۳۰ر مرثیے۔سلام۔نظمیں اور غزلوں کا ایک دیوان ہے۔

عروجؔ:۔(میر انیسؔ کے پوتے)

عروجؔ کا نام سید خورشید حسن اور تخلّص عروجؔ تھا آپ میر انیسؔ کے پوتے تھے۔آپکی عرفیت دولہا صاحب تھی۔عروجؔ کے والد میر نفیسؔ تھے۔آپکی ولادت ۴ر رجب ۱۲۸۲ھ لکھنؤ میں ہوئی آپکی اولاد میں ایک بیٹا لدّن صاحب فائز لکھنوی ہوئے۔عروج کی وفات ۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۴ر مئی ۱۹۳۰ء چہارشنبہ کو ۷۷ برس کی عمر میں ہوئی مقبرۂ میر انیسؔ میں تدفین ہوئی۔ادبی خدمات میں ۲۵ر مرثیے۔سلام۔رباعیات وغیرہ ہیں۔

جلیلؔ:۔ (میر اُنسؔ کے پوتے)

جلیلؔ کا نام سید فرزند حسین اور تخلص جلیلؔ تھا آپ میر انیسؔ کے بھائی میر اُنسؔ کے پوتے تھے آپکے والد کا نام سید حسن خلیلؔ تھا۔جلیلؔ کی ولادت ۱۵ر رجب ۱۲۷۴ھ مطابق یکم مارچ ۱۸۵۸ء دوشنبہ کے روز لکھنؤ میں ہوئی۔آپکے کوئی اولاد نہ ہوئی۔۵ر مئی ۱۹۲۲ء کو کٹرہ بزن بیگ چوپٹیاں اثناءعشری مسجد سے متّصل مکان میں انتقال ہوا۔کربلا امداد حسین خاں لکھنؤ میں دفن ہوئے۔وقتِ وفات عمر ۶۴ برس کی تھی ادبی خدمات میں چار مرثیے۔سلام اور رباعیات ہیں۔

میر مانوسؔ:۔(میر انیسؔ کے نواسے)

میر مانوسؔ کا نام سید علی اور تخلّص مانوسؔ تھا آپکے والد میر ثامن علی تھے آپکی والدہ عبّاسی بیگم میر انیسؔ کی منجھلی بیٹی تھیں۔مانوسؔ کی ولادت ۳۰ر ربیع الاوّل ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۹ر اپریل ۱۸۴۴ء جمعہ کے روز لکھنؤ میں ہوئی۔آپکی اولاد میں تین بیٹے (۱) علی احمد واصفؔ۔نواب

حسین واقفؔ اور بنّے صاحب عاکفؔ تھے۔ مانوسؔ کی وفات ۲۷/اپریل ۱۹۴۱ء میں (۱۰۳) ایک سو تین برس کی عمر میں ہوئی اور اُنکی تدفین مقبرۂ میر انیسؔ لکھنؤ میں ہوئی۔ خدماتِ ادب میں مرثیے۔ سلام۔ رباعیات۔ قصائد۔ نوحے۔ مزاحیہ نظمیں وغیرہ ہیں۔

میر عارفؔ :۔ (میر نفیسؔ کے نواسے)

میر عارف کا نام سید علی محمد اور تخلّص عارفؔ تھا آپکے والد کا نام سید محمد حیدر زیدی جلیس تھا۔ آپکی ولادت ۳/جمادی الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۲۸/نومبر ۱۸۵۹ء لکھنؤ میں ہوا۔ زوجہ اولیٰ سے دو فرزند فائق اور لائق اور ایک بیٹی کنیز شبّیر عرف بیا بیگم ہوئیں۔ زوجۂ ثانی سے ایک فرزند یوسف حسین شائق اور تین بیٹیاں کنیز فاطمہ۔ ثریّا بیگم۔ عالیہ بیگم تھیں۔ میر عارف کی وفات ۱۳/ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۱/اکتوبر ۱۹۱۶ء بروز جمعرات ۵۸ برس کی عمر میں ہوئی۔ مقبرہ میر انیسؔ میں تدفین ہوئی۔ ادبی خدمات میں ۲۴/ چوبیس مرثیے۔ دیوانِ غزلیات مجموعۂ سلام ''جواہرِ بے بہا'' کے نام سے ہیں۔

میر فائزؔ (لڈّن صاحب) (میر انیسؔ کے پروتے)

فائز کا نام سید محمد حسن اور تخلّص فائز اور (حسنؔ) تھا آپکی عرفیت لڈّن صاحب تھی۔ فائز کے والد کا نام دولھا صاحب عروج تھا آپکی ولادت ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء لکھنؤ میں ہوئی۔ میر فائز لاولد تھے۔ اہلیہ کا نام گوہر بیگم تھا۔ آپکی وفات ۱۴/رمضان ۱۳۶۶ھ مطابق یکم اگست ۱۹۴۶ء بروز جمعہ ۶۳ برس کی عمر میں ہوئی تدفین مقبرۂ میر انیسؔ لکھنؤ میں ہوئی۔ ادبی خدمات میں ۱۴/مرثیے۔ سلام۔ رباعیات وغیرہ ہیں۔

فرید لکھنویؔ :۔ (میر اُنسؔ کے پروتے)

فریدؔ لکھنوی کا نام سید رضی حیدر تخلّص فریدؔ تھا اور آپکی عرفیت سلطان صاحب تھی آپکے والد کا نام سید عابد مجید تھا۔ فریدؔ کی ولادت ۱۸۸۲ء لکھنؤ میں ہوئی۔ فریدؔ کی وفات ۲۶/اگست ۱۹۶۸ء ۸۷ برس کی عمر میں ہوئی اور کربلائے امداد حسین خاں میں تدفین ہوئی۔ آپکی ادبی خدمات میں ۲۲/مرثیے۔ سلام اور رباعیات ہیں۔

رشیدؔ :۔ (میر انیسؔ کے نواسے)

رشید کا نام سید مصطفی مرزا اور رشید تخلّص تھا، آپکی عرفیت پیارے صاحب تھی آپکے والد کا نام سید احمد میرزا صابر تھا۔ احمد میرزا میر عشقؔ کے منجھلے بھائی تھے سید احمد میرزا میر عشق کے منجھلے بھائی تھے سید احمد میرزا صابرؔ کی شادی میر انیسؔ کی دختر سے ہوئی تھی انہیں سے رشیدؔ پیدا ہوئے۔ اور رشیدؔ کی شادی میر انیسؔ کے بیٹے میر عسکری رئیس کی بیٹی سے ہوئی اس طرح رشیدؔ کی والدہ انیسؔ کی بیٹی تھیں اور زوجہ میر انیسؔ کی پوتی تھیں۔ رشیدؔ کی ولادت محلہ راجہ بازار لکھنؤ میں ۵/مارچ ۱۸۴۶ء مطابق ۱۷/ربیع الاوّل ۱۲۶۳ھ کو ہوئی تھی۔

رشیدؔ لکھنوی کی اولادوں میں سات (۷) بیٹیاں تھیں۔ جنکے نام اس طرح ہیں (۱) عابدہ بیگم (۲) امامی بیگم (۳) عسکری بیگم (۴) زینب بیگم (۵) کلثوم بیگم (۶) چُنّی بیگم (۷) شموبیگم۔ رشیدؔ کی وفات ۷۴ سال کی عمر میں دوشنبہ ۲/ستمبر ۱۹۱۷ء مطابق ۲۷/ذی القعد ۱۳۳۶ھ کو لکھنؤ میں ہوئی اور اُنکی تدفین اُنکے آبائی قبرستان باغِ میر عشقؔ۔ رکاب گنج کنڈری لکھنؤ (جو اب شاستری نگر کہلاتا ہے) میں مسجد عابد میرزا کے تہ خانہ میں ہوئی عابد میرزا رشیدؔ کے حقیقی بھائی تھے۔ ادبی خدمات میں ۳۴ مرثیے۔ سلام۔ قصائد۔ ۱۶۳ غزلیات۔ ۱۶۰ رباعیات وغیرہ ہیں۔

زکیؔ لکھنوی :۔ (منّے صاحب) (میر انیسؔ کے پرنواسے)

زکیؔ لکھنوی کا نام سید محمد تھا اور تخلّص زکیؔ تھا آپکی عرفیت منّے صاحب تھی آپکے والد کا نام سید محمد نقی رضوی تھا اور والدہ کا نام شہزادی بیگم (

میرانیسؔ کی نواسی تھیں) آپکی ولادت ۱۸/اکتوبر ۱۸۶۲ء شاہ گنج لکھنؤ میں ہوئی۔آپکی اولاد میں ۳ بیٹے۔محمد حیدر وحشیؔ۔سید محمد رضی اور سید محمد وصی تھے۔ذکیؔ کی وفات ۱۵/جون ۱۹۴۳ء یوم شنبہ ۸۱ برس کی عمر میں ہوئی اور مقبرۂ میرانیسؔ میں تدفین ہوئی۔ادبی خدمات میں ۸۷ مرثیے۔سلام۔قصائد۔رباعیات وغزلیات وغیرہ ہیں۔

شدیدؔ لکھنوی:۔(میرانیسؔ کے پرنواسے)

سیّد سجاد حسین نام اور شدیدؔ تخلص تھا۔اُنکے والد کا نام فرزند حسین تھا۔شدیدؔ کے دادا سید حیدر حسین خلدؔ میرانیسؔ کے شاگرد تھے۔سید سجاد حسین شدیدؔ پیارے صاحب رشیدؔ کے حقیقی نواسے تھے۔شدیدؔ کی ولادت ۱۴/ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۵ء لکھنؤ میں ہوئی پیارے صاحب رشیدؔ نے شدیدؔ کا تاریخی نام (منظور حسن) رکھا تھا جس سے اُنکا سن ولادت ۱۳۱۴ھ نکلتا ہے۔شدیدؔ کی وفات ۳/جولائی ۱۹۷۸ء مطابق ۱۳۹۸ھ ۸۴ سال کی عمر میں ہوئی اُنکی تدفین وصیت کے مطابق کربلائے تال کٹورہ میں زنجیری پھاٹک کے اندر داہنے ہاتھ پر ہوئی۔

شدیدؔ نے ۱۹۳۰ء میں رشیدؔ لکھنوی کے مراثی اور اپنا ایک مرثیہ کتابی شکل میں پیش کیا اور اس کا تاریخی نام خم خانۂ رکھا۔۱۹۴۹ء میں انتخابِ رباعیات رشیدؔ وشدیدؔ شائع کیں۔۱۹۶۷ء میں شاگردِ شدیدؔ مرزا صادق حسین شہیدؔ لکھنوی نے شدیدؔ لکھنوی کے آٹھ مراثی ریاضِ شدیدؔ کے عنوان سے تین حصوں میں شائع کئے ہیں ۱۹۷۹ء میں شدیدؔ لکھنوی کے بھانجے سید سبط حسین نقوی نے شدیدؔ کے (۳۰) مرثیے انیسؔ الشعراء کے عنوان سے شائع کئے اسکے علاوہ ۱۹۸۲ء میں سید سبطِ حسین نقوی نے رزم نامہ شدیدؔ شائع کیا۔اس طرح سے شدیدؔ کے ۴۰ مراثی۔۶۰ سلام۔اور قریب ۱۰۰ رباعیات وغیرہ خدمات ادب ہیں۔۲۵/رجب کی قدیم مجلسِ مرثیہ خوانی میں شدیدؔ ہر سال نوتصنیف مرثیہ پیش کرتے تھے۔وہ مجلس آج بھی ہر سال ۲۵/رجب کو امام باڑہ ناظم صاحب مین منعقد ہوتی ہے جس میں ڈاکٹر سید علی امام گوہرؔ نوتصنیف مرثیہ پیش کرتے ہیں۔

حزیںؔ:۔(میرانیسؔ کے پرپوتے)''شاگردِ شدیدؔ''

حزیںؔ کا نام میر ہاشم حسین اور تخلص حزیںؔ تھا اُنکے والد میر محمد نواب غیورؔ تھے۔حزیںؔ کی ولادت ۹/جون ۱۹۳۳ء لکھنؤ میں ہوئی۔حزیںؔ لاولد تھے۔حزیںؔ کی وفات ۲۳/ستمبر ۱۹۴۴ء ۴۳ برس کی عمر میں ہوئی۔انکی تدفین مقبرۂ میرانیسؔ لکھنؤ میں ہوئی۔ادبی خدمات میں چند مرثیے۔سلام۔رباعیات وغیرہ ہیں۔

میر فائق:۔(میر عارفؔ کے فرزند اکبر)

میر فائق کا نام سید ظفر حسین اور تخلّص فائق تھا آپکی عرفیت بابو صاحب تھی۔آپکے والد میر عارف تھے۔فائق کی ولادت ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء لکھنؤ میں ہوئی۔آپکی اولاد میں دو فرزند سید اختر حسین اور سید اصغر حسین اور تین بیٹیاں تھیں انکے نام مجتبیٰ بیگم۔سیدہ بیگم۔زاہدہ بیگم تھے فائق کی وفات ۵۸ برس کی عمر میں ۲۱/شعبان ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۱/اگست ۱۹۴۴ء بروز جمعرات ہوئی اور تدفین مقبرۂ میرانیسؔ لکھنؤ میں ہوئی۔ادبی خدمات میں مرثیے۔سلام۔رباعیات اور دیوانِ غزلیات ہیں۔

گوہرؔ لکھنوی:۔(شدیدؔ لکھنوی کے نواسے)

گوہرؔ لکھنوی کا نام سید علی امام زیدی اور تخلّص گوہرؔ ہے۔گوہرؔ کے والد کا نام سید داور حسین زیدی تھا۔گوہرؔ کی ولادت ۲۲/اپریل ۱۹۵۵ء لکھنؤ میں ہوئی۔گوہرؔ کی اولاد میں ایک بیٹا سید علی عمران زیدی اور دو بیٹیاں وصیہ زیدی اور صدف زیدی ہیں۔گوہرؔ کی تصانیف میں

(۱) ''سرمایۂ گوہرؔ'' (مراثی۔مسدّس۔مخمّس۔سلام ونوحے۔قصائد۔قطعات ورُباعیات نظمیں وقطعہ تاریخ کا مجموعہ جس میں ۱۲ رمرثیے۔ ۳۱رمسدس۔ایک مخمس۔۴۷سلام۔۷نوحے۔۶ قصائد۔۱۲۵ رُباعیات وقطعات۔۶ نظمیں شامل ہیں۔

(۲) تاریخِ اسلام از قرآن (مثنوی) اُردو (۳) غُسل سے دفن تک (اُردو) (۴) کربلا (مُنشی پریم چند) (اُردو) ترجمہ (۵) سی۔ایس۔آئی۔آر۔ کا پروگرام سائنس میں نوجوانوں کی نمائندگی کے لئے (انگلش سے اُردو) ترجمہ (۶) حسینؑ کا بلیدان (ہندی) (۷) گوہرِ عزا (ہندی) (۸) قرآنِ مجید (ہندی) (۹) نہج البلاغہ (ہندی) (۱۰) تحفتاً العوام (ہندی) (۱۱) وظائف الابرار (ہندی) (۱۲) چودہ ستارے (ہندی) (۱۳) تفسیر کربلا (ہندی) (۱۴) حیات بعد از موت (ہندی) (۱۵) ایلیا (ہندی) (۱۶) نجم العزا (ہندی) (۱۷) ارتباطِ نبوت وامامت (ہندی) (۱۸) قرآن اور سائنس (ہندی) (۱۹) زیرِ تالیف:۔(۱) عندلیب گوہرؔ (مجموعہ غزلیات) (اُردو)

میر انیسؔ کے ہم عصر مرثیہ گو

خلیقؔ: (۱۸۴۴۔۱۷۶۶) میر مستحسن نام خلیق تخلّص تھا۔اردو کے شہرۂ آفاق مثنوی نگار میر حسن کے صاحب زادے اور میر انیسؔ کے والد تھے۔قادرالکلام شاعر تھے۔خلیقؔ کی زبان صاف سلیس اور رواں ہے۔روز مرّہ کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔میر انیسؔ نے اُنکی فصاحت اور روز مرّہ کا ذکر فخریہ انداز میں کیا ہے۔

خلق میں میر خلیقؔ اور تھا خوش گو کوئی کب
نام سے دھوئے زباں کوثر و تسنیم سے جب

فصیحؔ (۱۸۵۲۔۱۷۸۳) میر جعفر علی نام تخلّص فصیحؔ تھا۔فصیحؔ کا شمار اُس وقت کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے۔انھوں نے بھی اپنے ہم عصروں کی طرح مرثیہ کو گونا گوں مضامین سے نوازا۔فصیحؔ کا ایک امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے روایتوں کو منظوم کرنے میں تلاش اور چھان بین سے کام لیا اور مرثیہ کو اعلیٰ اخلاقی تعلیمات،جذبات کی مصوّری اور محاکاۃ نگاری اور ندرتِ بیان سے ممتاز کیا۔فصیحؔ کا طرزِ ادا جدید ہے زبان بھی وہی ہے جو انیسؔ و دبیرؔ کے یہاں ملتی ہے۔

ضمیرؔ:۔(۱۸۵۵۔۱۷۸۶) مظفر حسین نام تھا۔ضمیر تخلّص۔میر ضمیرؔ کے نام سے مشہور ہوئے۔مصحفیؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا وہ ایک قادرالکلام اور پُرگو شاعر تھے۔مرثیہ کو وسعت اور ترقّی عطا کرنے میں ضمیرؔ نے اہم کردار ادا کیا۔مرزا دبیرؔ جیسے باکمال شاعر میر ضمیر کے شاگرد تھے۔

دلگیرؔ:۔(۱۸۴۸۔۱۷۸۰) لالہ چھنّو لال نام تھا۔پہلے طربؔ تخلّص کرتے تھے بعد میں دلگیرؔ لکھنے لگے اور اسی تخلّص سے شہرت پائی۔غزل میں ناسخؔ کے شاگرد تھے۔ بعد میں غزل کو چھوڑ دیا اور صرف مرثیے ہی کہتے تھے دلگیر نے حدیث، مجالس اور دوسری کتابوں سے روایتیں اور واقعات لے کر مرثیہ کے موضوعات کو وسعت دی۔

مرزا دبیرؔ:۔(۱۸۷۵۔۱۸۰۳) میر انیسؔ کے معاصرین میں سب سے اہم نام مرزا دبیرؔ کا ہے۔مرزا دبیرؔ دہلی میں پیدا ہوئے تقریباً

سات برس کی عمر میں لکھنؤ آ گئے۔ یہاں کے جیّد علماء سے تحصیلِ علم کیا اور ساتھ ساتھ مشقِ سُخن بھی کرتے رہے مرزا دبیرؔ اپنی ذہانت سے بہت جلد ممتاز مرثیہ گویوں میں شمار ہونے لگے۔

میرزا عشقؔ:۔ سید حسین میرزا نام تھا۔ عشق تخلّص۔ نسبی اعتبار سے امام علی رضاؑ کی اولاد میں تھے اُن کے مورثوں میں سید ذوالفقار علی ایران سے ہندوستان تشریف لائے۔ اس خاندان کے لوگ بارگاہ شاہی میں بھی فیضیاب ہوئے اور لکھنؤ میں عزّت وشہرت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ میر عشقؔ کے والد سید محمد میرزا اُنسؔ بادشاہِ اودھ محمد علی شاہ کی ملکہ نواب ملکہ جہاں کے معتمد خاص تھے۔ میر اُنسؔ اپنے دور کے مشہور شاعر تھے اور شیخ ناسخؔ کے شاگرد تھے۔

حسین میرزا عشقؔ کی پیدائش ۱۸۱۷ء میں لکھنؤ میں ہوئی اور وفات ۲۷ مئی ۱۸۸۶ء کو لکھنؤ میں ہوئی وفات کے وقت اُنکی عمر تقریباً ۶۸ سال تھی اپنے آبائی مکان واقع رکاب گنج کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

سفر عراق:۔ سفرِ عراق کے سلسلہ میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کا بیان ہے۔ میر عشق نے عراق کے علاوہ کہیں اور کا سفر نہیں کیا۔ کوئی پچاس برس کی عمر ہوگئی کہ نواب اشرف انساعرف نیا محل کے ساتھ کربلا گئے وہاں امام حسینؑ کے روضے کے بڑے دروازے پر چاندی چڑھوائی۔ جس میں کوئی پانچ ہزار روپئے صرف ہوئے وہاں کے عالموں، کلید برادروں، مجاوروں وغیرہ کو بہت کچھ دیا اور مجلسوں میں بہت خرچ کیا۔ تیرہ مہینے عراق میں قیام رہا۔ وہاں کے کُل عتبات عالیہ کی زیارت سے مشرّف ہوکر واپس آئے۔ اس سفر میں تقریباً پچاس ہزار روپیہ صرف ہوا۔

لکھنؤ کی ایک بیگم نواب اشرف انّساء عرف نیا محل میں ایک امام باڑا تعمیر کرایا اور اُس میں مجلسِ عزا برپا کرنا چاہی کسی نے میر عشقؔ کی ذاکری کے لیے رائے دی۔ میر عشقؔ سے وعدہ لیا گیا۔ میر عشقؔ نے اپنا مرثیہ ''عروج ائے مرے پروردگار دے مجھکو'' پڑھا۔ اس مخصوص مجلس میں لکھنؤ کے رؤسا شرفا اور شعرائے کرام کے علاوہ خدایان سخن میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ بھی شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ میر عشقؔ کا یہ مرثیہ بہت پسند کیا گیا۔ اور داد اور تحسین کے ساتھ مآلِ مجلس بھی خوب ہوا۔ میر انیسؔ نے میر عشقؔ کی تعریف کرتے ہوئے کہا بھئی سید میرزا۔ یہ مرثیہ اپنے ساتھ اپنی قبر میں لے جانا۔ تمھاری بخشش کے لیے یہی ایک مرثیہ کافی ہے اسی مرثیہ کے متعلق پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے لکھا ہے ''مرزا دبیرؔ مغفور تشریف فرما تھے کہ اس حال (زعفرِ جن کے حال) کا ایسا مرثیہ نہ مجھ سے ہوا نہ میر انیسؔ سے۔'' (نگارشاتِ ادیب ۱۳۸)

اس مجلس کے بعد سے میر عشق کی مرثیہ کی شہرت عام ہوگئی۔

میر ببر علی انیسؔ اور میر محمد میرزا اُنسؔ کے گھرانوں کے مابین ازدواجی تعلقات بھی قائم ہوئے تھے۔ میر انیسؔ کی ایک بیٹی کا عقد میر اُنسؔ کے بیٹے احمد میرزا صابرؔ یانی میر عشقؔ کے بھائی سے ہوا تھا جنکے بیٹے سید مصطفی میرزا عرف پیارے صاحب رشیدؔ ہوئے۔ اس طرح سے رشیدؔ میر انیسؔ کے حقیقی نواسے ہوئے۔ دوسری طرف میر عسکری رئیس جو انیسؔ کے چھوٹے بیٹے تھے اُنکی بیٹی یعنی میر انیسؔ کی پوتی سے پیارے صاحب رشیدؔ کا عقد ہوا اس طرح رشیدؔ کی والدہ انیسؔ کی بیٹی تھیں اور زوجہ انیسؔ کی پوتی تھیں۔

سید میرزا تعشقؔ:۔ تعشقؔ کی پیدائش ۱۸۳۳ء اور وفات ۱۸۹۱ء کو ہوئی۔ تعشقؔ اپنے والد اُنس کے شاگرد تھے۔ میر انیسؔ تعشقؔ کی بہت عزّت کرتے تھے۔ تعشقؔ میر عشقؔ کے برادرِ خورد تھے اور انیسؔ کے دور میں ممتاز مرثیہ گو کے طور پر معروف تھے۔ تعشقؔ ایسے مرثیہ گو ہیں جنھیں

غزل اور مرثیہ دونوں میں یکساں مقبولیت حاصل ہوئی۔لکھنؤ کی تعریف میں میر انیسؔ کے چند بند پیشِ خدمت ہیں:-

مجلس کا انتظام اسی شہر پر ہے ختم　　رونے کا اہتمام اسی شہر پر ہے ختم
یہ آبرو یہ نام اسی شہر پر ہے ختم　　بس ماتمِ امامؑ اسی شہر پر ہے ختم
پوچھو جو پھر کے آئے ہیں یاں ہر دیار میں
دیکھا نہ ہوگا ایک گل ایسا ہزار میں

ہر دل ہے عندلیبِ گلستاں لکھنؤ　　گلزارِ مومنیں ہے زہے شانِ لکھنؤ
نعرے علیؑ علیؑ کے ہیں قربانِ لکھنؤ　　رضواں بھی ہے ارم میں ثنا خوانِ لکھنؤ
کیوں سرخرو نہ ہو یہ چمن سبزوار ہے
دیکھو تو اس خزاں پہ بھی ایسی بہار ہے

سب عارفِ حق خلفِ بوترابؑ ہیں　　شیدائے نامِ سبطِ رسالتؐ مآب ہیں
سر گرمِ کارِ خیر و شریکِ ثواب ہیں　　بے شک یہ کوٹری ہیں کہ آنکھیں پرآب ہیں
روتے ہیں ذِکر قتلِ شہؑ خوشخصال پر
موتی نثار کرتے ہیں زہراؑ کے لال پر

کہتے ہیں ان کو دیکھ کے قدسی بہ احترام　　وہ گل ہیں یہ کہ باغِ اِرم جن کا ہے مقام
ناجی ہیں اِن کو نارِ جہنم سے کیا ہے کام　　لکّھے ہوئے ہیں مصحفِ زہراؑ میں سب کے نام
سب ہیں غلامِ خاص شہؑ مشرقین کے
جنت میں ساتھ ہوں گے یہ غنچے حسینؑ کے

ذی علم ، نکتہ فہم ، سخن سنج ، ذی شعور　　ذی قدر ، ذی وقار ، فروتن سخی ، غیور
نخوت نہ خود سری، نہ تکبُر نہ مکر و زور　　وضیں درست ، قلب صفا اور رخوں پہ نور
کیوں کر نہ فرش و عرش پر یہ نیک نام ہوں
آقا حسینؑ سا ہو تو ایسے غلام ہوں

(نذرانۂ عقیدت گوہرؔ لکھنوی)

انیسؔ کر گئے پُرنور آفتابِ سُخن
اُنھیں کے دم سے ہوئے لاکھ انقلابِ سُخن
انیسؔ ہی نے تو اُردو کو کردیا اُردو
اُنہیں کی فکر سے کامل ہوئی کتابِ سُخن

امکانات اور مراثیِ انیسؔ

اکبر حسین جعفری

اور کیا کام ان کے شاعر کا؟
نظم کر کے دکھائے امکانات
عارفؔ امام

میرے نزدیک دو الگ الگ کربلا ہیں۔ایک تاریخ کی کربلا ہے جو ہمیں مقاتل اور دیگر کتبِ تواریخ سے ملی ہے۔مورخوں کا کام ہے کہ اصولِ تاریخ کی مدد سے ہمیں حقیقی کربلا سے روشناس کرائیں۔وقت کے ساتھ جب علمِ تاریخ اور اس کے اصول بدلتے رہیں گے،تو کربلا فہمی بھی برابر بدلتی رہے گی۔علامہ نجمؔ آفندی اکبرآبادی فرماتے ہیں:

گزر جاتی ہیں عمریں کربلا کا غم سمجھنے میں
یہ آب و گل کا پیکر آدمی بنتا ہے مشکل سے

دوسری کربلا اردو ادب کی کربلا ہے،اور اس کربلا میں خدا جانے کتنی اور کربلائیں ہیں۔اِس کربلا کی بنیاد تاریخی کربلا ہی ہے،مگر اِس میں تاریخیت (historicity) اتنی اہم نہیں ہے۔اس کربلا کی سیر کی کیفیت سید مرتضیٰ حسین صاحب فاضلؔ لکھنوی نے بیان کی ہے۔۲۵ جولائی سنہ ۱۹۷۲ء کو انہوں نے قبلہ ضمیر اختر نقوی صاحب مرحوم کے نام ایک خط میں لکھا تھا:

"واقعاتِ مراثی کی سند؟ میرے نزدیک غیر اہم سوال ہے۔شعر و تاریخ دو الگ الگ فن ہیں۔اگر کسی شاعر کا موضوع تاریخ ہو تو وہ شاعر نہیں مورّخ ہے۔اس پر تاریخی جرح ہونا چاہئے لیکن فردوسیؔ،نظامیؔ،خسروؔ،جامیؔ شاعر ہیں۔ان کا کلام براہِ راست تاریخ نہیں بلکہ وہ تاریخ سے شعری استفادہ کرتے ہیں۔وہ تاریخ کا تجریدی اور فنی خیال سامنے رکھتے ہیں۔شعری استعارہ،شعری استنباط،واقعہ کے اسباب،وقوع، اور نتائج کے سیاق و سباق،اس کے تسلسل،واقعیت اور جرح و تعدیل مورخ کا کام ہے اور ان سب باتوں کا مجموعی تاثر تاریخی سائنس و فلسفہ بھی ہوسکتا ہے۔جیسے ابن خلدون اور ٹائن بی کی تالیفات میں ہے اور جذبہ و عقیدہ و تخیل بھی جیسے ملا باذلؔ کی "حملۂ حیدری" جامیؔ کی "یوسف زلیخا" یا فردوسیؔ کا "شاہ نامہ" وغیرہ۔

انیسؔ مورخ نہیں ہیں،وہ شاعر ہیں۔ان کا موضوع تاریخِ کربلا نہیں۔المیۂ کربلا کا تاثراتی اور جذباتی شعور انیسؔ کا موضوع ہے۔اس تاثر کو وہ حکایتی پیرایہ نہیں دیتے جس کے جزئیات کی صحت و عدم صحت استناد و عدم استناد پر بحث کی جائے۔ان کا مقصد المیۂ کربلا کے رزمیہ و بزمیہ والمیہ تاثرات کا اظہار ہے جس کے ذریعے وہ واقعہ کے تار و پود سے صرف خاصیت اور معین کرداروں کو خاص زاویے سے دیکھتے

ہیں۔جیسے کوئی مبصر کسی گھمسان کی جنگ کو بہت دور کھڑے ہو کر دوربین سے دیکھے اور اس سے جوش وجذبہ پیدا کرنے کے لئے اپنے لفظوں میں بیان کرے۔انیسؔ وقائع نگار نہیں ہیں وہ تاثرات کے مصور ہیں۔آپ نے ''کربل کتھا'' کا ہندوستانی ایڈیشن دیکھا ہوگا۔مختار الدین احمد صاحب نے ملا فضلیؔ کی تحریروں کے مصادر ومراجع دریافت کیے ہیں اور واقعات پر جرح کی ہے۔میں نے ان کو محنت کی داد دیتے ہوئے لکھا تھا کہ بھائی ادب میں تاریخ کی جزئیاتی بحث مناظرہ کا کام ہے،ادب کا تقاضا نہیں۔آپ اس پر لسانی اسلوب کی بحث کریں یہ کیا ہوا کہ حدیث ''انا مدینۃ العلم و علی بابہا'' بیہقی نے لکھی ہے اور بیہقی غیر محقق محدث ہیں۔اعتراض و بحث کا دائرہ بہت وسیع ہے۔مدتوں سے یہ مطالبہ ہے کہ انیسؔ کے تذکرۂ عونؑ ومحمدؑ کے مقابلے وامید واریٔ علم کا کوئی ماخذ بتایئے اب اس کا ماخذ تلاش کیجیے پھر مطالبہ ہوتا ہے کہ یہ تو کوئی ماخذ نہیں۔پورا واقعہ غلط ہے۔لیجیے دوسری بحث شروع ہوگئی خلاصہ یہ ہے کہ تاریخی استناد،واقعاتی وتاریخی خشک مثنوی وقصیدہ وغیرہ میں تو شاید موزوں ہو۔رزمیہ وبزمیہ خالص شعری ذخیرے کے لیے موزوں نظر نہیں آتا۔خیر یہ میری ذاتی رائے ہے اور تحقیقی نقطۂ نظر۔''

اس کربلا میں تاریخی کربلا کے رزمیہ اور المیہ تاثرات کا اظہار مقصود ہے۔ان تاثرات اور جذبات کو نظم کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ایک اچھا مرثیہ نگار صرف ایک اچھا شاعر نہیں ہوتا بلکہ وہ جذبات جیسی غیر مادی شے سے بدرجۂ اتم واقف ہوتا ہے۔بقول شبلیؔ نعمانی کے،''شاعری درحقیقت مصوری ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مادیات اور محسوسات کی تصویر کھینچنا اس قدر دشوار نہیں جس قدر غیر محسوسات اور غیر مادی اشیاء کا نقشہ اتارنا مشکل ہے۔''

اک نگاہ جذبات کے غیر مادی عالم سے ہٹ کر ارادوں کے غیر مادی عالم پر ڈالتے ہیں۔سید آلِ رضاؔ نے اپنے شاہکار مرثیے ''صاحبِ احسنِ تخلیق کی قدرت پہ سلام'' میں اُن روایات کا ذکر کیا ہے جن میں آیا ہے کہ امامِ حسینؑ نے شام جانے کا بھی ارادہ کیا تھا۔اگرچہ ایامِ عزا کے دوران جگہ جگہ امامِ حسینؑ کے مقصد پر گفتگو ہوتی ہے،سنجیدہ علماء مانتے ہیں کہ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ امامِ حسینؑ کے کیا ارادے تھے۔یہ تو معلومؑ ہے کہ امام اصلاح چاہتے تھے مگر ان کے مخصوص ارادے کہ وہ کس طرح اصلاح کرنا چاہتے تھے،وہ کیا نتیجہ لانا چاہتے تھے، عمرِ سعد سے مذاکرات کے کیا احوال تھے وغیرہ،ان سب چیزوں کی حقیقت صرف امامِ حسینؑ کو اور خدائے بزرگ و برتر کو معلوم ہے۔ایسی صورت میں بہت امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔سید صاحب فرماتے ہیں:

جو ارادے بھی شہِؑ دیں کے تھے حسبِ مقصد　　ان کی تصدیق کو تھی فہمِ امامت کی سند
پھر بھی ہم ایسوں میں جتنی ہے سمجھ سکنے کی حد　　ہو جو بیدار عقیدت تو کرے عقل مدد
ہیں بڑی غور طلب جتنی بھی تصویریں ہیں
کربلا والے مدبر کی یہ تدبیریں ہیں

اگر سید صاحب مورخ ہوتے تو وہ جرح وتعدیل کرتے،مگر ہماری خوش نصیبی ہے کہ وہ شاعر تھے۔انہوں نے امامِ حسینؑ کے ارادے کے امکانات سے شعری استفادہ کیا اور دکھایا کہ تاریخیت کی بحث سے نکل کر بھی تمام امکانات غور طلب ہیں۔

جس طرح امامِ حسین کے تمام ممکن ارادے غور طلب ہیں،کربلا میں ہر ممکن جذبہ اور ان کے تاثرات بھی غور طلب ہیں۔

جرمن فلسفی اور نقاد والٹر بینجمن رزمیہ (epic) اور وقائع نگاری کے ربط کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تاریخ سفید روشنی کے مانند ہے جو مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے۔ جب تاریخ کی سفید روشنی کسی پرزم (prism) کے ذریعے سے منعطف (refracted) ہوتی ہے تو علیحدہ دکھائی دینے والے رنگ رزمیہ کی مختلف شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ متعدد تاثرات ہیں جن پر غور کیا جا سکتا ہے۔

یہاں تاریخی کربلا کی سفید روشنی جب مرثیے کے پرزم سے منعطف ہوتی ہے تو المیۂ کربلا کے متعدد تاثرات دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی ایک شہید کی باری پہلے آتی ہے تو کبھی بعد میں، ایک جگہ ان کی رخصت کا منظر ایک طریقے سے پیش کیا جاتا ہے تو دوسری جگہ بالکل الگ انداز میں۔ منظر ایک ہی ہوتا ہے مگر ان تبدیلیوں سے کیفیت میں فرق آتا ہے۔ غم اور دیگر جذبات محسوس کرنے کے لیے نیا سامان فراہم کرتے ہیں۔ نئے نشتر اتارے جاتے ہیں۔

امکانات بے شمار ہیں، نظم کرنے کے طریقے انگنت، اور جذبات محسوس کرنے کی گنجائش لامتناہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ نگار تاریخی امکانات کو ٹٹول ٹٹول کر غالبؔ کی طرح پوچھتا رہتا ہے "کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟"

میر انیسؔ سے بڑھ کر کسی اور شاعر نے ان جذبات کی دنیا کی سیر نہیں کرائی۔ مسعود حسن رضوی ادیبؔ صاحب ان جذبات اور انیسؔ کے ان جذبات کو طرح طرح سے ٹٹولنے کا ذکر کرتے ہیں:

"جذبات کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ کوئی محل انتہا کی خوشی، غم، حیرت، غصے وغیرہ کا ہوتا ہے۔ کسی محل پر یہی جذبات بالکل خفیف سے پیدا ہوتے ہیں۔ انتہائی شدت اور انتہائی خفت کے درمیان بے شمار درجے ہوتے ہیں۔ جذبات کے ان مدارج کو ملحوظ رکھنا اور ان کا اظہار کر لینا انیسؔ کا وہ امتیاز ہے جس میں شاید ہی کوئی اردو کا دوسرا شاعر ان کا شریک ہو سکے۔ جن حالات میں جو جذبات پیدا ہونا چاہیے اور جس حد تک پیدا ہونا چاہیے، انیسؔ انہیں جذبات کو اسی حد کے اندر دکھاتے ہیں۔ انہوں نے مختلف مرثیوں میں ایک ہی موقعے پر ایک ہی شخص کے جذبات مختلف بلکہ متضاد دکھائے ہیں۔ مگر ہر جگہ حالات میں کچھ ایسا ضمنی تغیر کر دیا ہے کہ جذبات فطرت کے مطابق ہی رہے۔

بعض اوقات کئی طرح کے جذبات کے ملحوظ ہونے سے ایک خاص کیفیت انسان کے دل میں طاری ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان کے دل میں دو طرح کے جذبات یکے بعد دیگرے کچھ دیر تک برابر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح نہ معلوم کتنی عجیب عجیب کیفیتیں انسان کے دل میں گزرتی رہتی ہیں۔ انیسؔ ایسے نازک موقعوں پر جذبات کی فطری حالت کو محسوس کر سکتے ہیں اور ان کے اظہار کے لیے طرح طرح کے موثر پیرائے اختیار کرتے ہیں۔ وہ جذبات کا بیان اکثر صراحت سے نہیں کرتے بلکہ ایسے علامات کا ذکر کر دیتے ہیں جن سے وہ جذبات خود بخود سمجھ میں آ جاتے ہیں۔"

یہ میر انیسؔ کا کمال ہے۔ انہوں نے کیسے کیسے جذبات نظم کیے ہیں۔ صرف چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

فرزندانِ مسلمؑ میں خوف۔ بیت ملاحظہ کیجئے:

ہر ناکے پہ تھا حکم یہ ان دونوں کی خاطر　　دربار میں غل تھا کہ کرو جلد انہیں حاضر
اور پھرتے تھے حیراں وہ مدینے کے مسافر　　کوئی نہ مددگار تھا نہ حافظ و ناصر

پھرتی تھی اجل ساتھ جدھر جاتے تھے دونوں
پتا بھی کھڑکتا تھا تو ڈر جاتے تھے دونوں

(از ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں۔ میر انیس نے یہ مرثیہ ۱۸۳۹ء تک کہا تھا۔)

شبِ شہادتِ امام حسنؑ کو امامِ حسینؑ کی بے قراری۔ دوسرے بند کا دوسرا مصرع ملاحظہ کیجئے:

وہ سبطِ مصطفیٰؐ کی شہادت کی رات تھی　　آفت کی رات تھی وہ مصیبت کی رات تھی
عالم کے بادشاہ کی رحلت کی رات تھی　　زہراؑ و مرتضیٰؑ پہ قیامت کی رات تھی
گذری قلق میں فاطمہؑ کے نورِ عین کو
ہجرِ حسن میں نیند نہ آئی حسینؑ کو

بستر پہ جلوہ گر جو ہوا وہ فلک جناب　　تا نصفِ شب نہ چشم ہوئی آشنائے خواب
زیرِ زمیں تھا خاک بسر قرصِ آفتاب　　داغِ جگر دکھاتا تھا جھک جھک کے ماہتاب
تارے زمیں پہ ٹوٹ کے پیہم گرا کئے
چشمِ فلک سے قطرۂ شبنم گرا کئے

(از: مسجد میں قتل جب شہِ خیبر شکن ہوئے)

حوروں میں شوق۔ آخری مصرع ملاحظہ کیجیے:-

اس کی خوشی جو تھی کہ ملا رایتِ رسولؐ　　رخسار تھے کھلے ہوئے دو ارغواں کے پھول
قد سروِ باغِ حسن نہ پستی فزوں نہ طول　　وہ لب کہ جب سے روح کو ہو تازگی حصول
یہ شور تھا نمک کا جہاں کے رواق میں
حوریں بھی ہونٹ چاٹتی تھیں اشتیاق میں

(از: جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج)

امامِ حسینؑ کا تحمل، بلکہ کئی جذبات کے امکانات ہیں۔ آخری مصرع ملاحظہ کیجیے جس میں محبت اور افسوس کی جھلک بھی ہے:

حضرتؑ کا تو یہ حال تھا وہ مارتے تھے تیر　　لگتا تھا جہاں تیر وہیں پڑتی تھی شمشیر
شمشیر کے زخموں پہ لگے خنجرِ بے پیر　　بہتا تھا لہو حال ہوا جاتا تھا تغییر
کیا رحم تھا کچھ منھ سے نہ فرماتے تھے حضرت
قبضے کی طرف دیکھ کے رہ جاتے تھے حضرت

(از: اے مومنو مصروف رہو یادِ خدا میں)

زبانِ انیسؔ کے محاسن بھی دیکھیے تو امکانات ہی امکانات ہیں۔ عظیم نقاد اور محقق شمس الرحمن فاروقی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں

میر انیسؔ کے دو بند کا تجزیہ کیا ہے۔ فاروقی صاحب نے مصرع مصرع دونوں بندوں کو اٹھایا۔ آٹھ مصرعوں کی رعایتیں کھولنے کے لیے انہوں نے چھ صفحات لکھ ڈالے۔ اس تجزیے کے بعد فاروقی صاحب لکھتے ہیں، "ایسا نہیں ہے کہ یہ بند میں نے تلاش کے بعد برآمد کیے ہوں۔ یہ انیسؔ کا عام انداز ہے۔ وہ لفظ کے ہر ممکن امکان کو گرفت میں لاتے ہیں۔"

گویا میر انیسؔ کے مرثیوں میں کم از کم دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح پر وہ جذبات کا ہر ممکن امکان گرفت میں لاتے ہیں۔ دوسری سطح پر وہ انہیں جذبات کے امکانات کو باندھنے کی خاطر الفاظ کا ہر ممکن امکان پیش کرتے ہیں۔ ان سطحوں کے امتزاج اور ان پر میر انیسؔ کا قابو ان کے خدائے سخن ہونے کا سبب ہے۔

پس فاضل صاحب مرحوم کا کہنا بالکل درست ہے، مگر اس خیال کو extreme کی طرف لے جانے میں بھی خطرہ ہے، ایک اچھے مرثیہ نگار کے ایک اور ہنر کو فراموش کر دینے کا خطرہ۔ مرثیہ سے لطف اندوز ہونے کا ایک موقع ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ تاریخی استناد پر بحث یہاں مناسب نہیں ہے، تو کوئی اس سے یہ نتیجہ بھی نکال سکتا ہے کہ تاریخِ کربلا کے ماخذ سے واقفیت بھی ضروری نہیں ہے۔

بعض مرثیہ نگاروں نے روایتوں کے منظوم ترجمے پیش کئے ہیں۔ اگر کوئی روایت سے واقف نہ ہو تو وہ محاسنِ کلام سے لطف ضرور اٹھا سکتا ہے، مگر جب روایت سے بھی واقف ہو تو وہ دیکھ سکتا ہے کہ شاعر کس طرح ایک ساکن خبر کو متحرک تصویر بناتا ہے۔

ابومخنف اپنے مقتل میں روایت نقل کرتے ہیں:

"آپ کا قافلہ کوفے کی سمت روانہ تھا کہ راستے میں ایک منزل پر جا کر ٹھہرا جس کا نام شراف ہے۔ جب صبح نمودار ہوئی تو آپ نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ پانی بھر لیں۔ ان لوگوں نے کافی مقدار میں پانی بھرا اور صبح سویرے سفر شروع کیا تاکہ دن کی گرمی سے محفوظ رہ سکیں۔ ظہر کے قریب سفر جاری تھا کہ ایک شخص نے بلند آواز میں تکبیر کہی۔ امامؑ نے بھی تکبیر کہی اور پھر پوچھا کہ تم نے تکبیر کیوں کہی؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے کھجوروں کے درخت دیکھے ہیں۔ بنی اسد کے دو افراد (عبداللہ ابن سلیم اور مذری ابن مشمعل) نے کہا کہ اس علاقے میں کھجوروں کے درخت نہیں ہیں۔ امامؑ نے پوچھا پھر تمھارے خیال میں یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ دشمن کی فوج کے سپاہی اور ان کے گھوڑوں کی گردنیں نظر آ رہی ہیں۔"

اب دیکھیے میر انیسؔ نے کس طرح نظم کیا ہے:

حضرت بھی چلے جاتے تھے افسردہ و دلگیر　　جو ایک دلاور نے کہی گھوڑے پہ تکبیر
اُس شخص سے فرمانے لگے حضرتِ شبیر　　بتلا سبب اس ذکر کا اے صاحبِ توقیر
کی عرض قریب آ کے شہِؑ عرش نشیں کے
وہ نخل نظر آتے ہیں کوفے کی زمیں کے

اوروں نے یہ کی عرض کہ اے دلبرِ زہراؑ　　خرمے کے یہاں نخل تو دیکھے نہیں اصلا
عباسِؑ علمدار نے جب غور سے دیکھا　　کی عرض شہِؑ دیں سے کہ فوج آتی ہے مولا

کیا جانیے انبوہ ہے یا چند نفس ہیں
نوکیں یہ سنانوں کی ہیں یا گوشِ فرس ہیں

(از: کنعانِ محمد کے حسینوں کا سفر ہے)

اس روایت کے منظوم ترجمے سے صرف میر انیسؔ کا ہنر نہیں کھلتا مگر ان کے مرثیہ کہنے کی ایک ممکن تصویر بھی تصور میں پھرنے لگتی ہے۔ بقول نیر مسعود صاحب کے، میر انیسؔ اور ان کے استاد شیخ ناسخؔ کے مزاجوں میں کئی مماثلتیں تھیں۔ دونوں کو کسی کا خلافِ وقت گھر تشریف لانا سخت ناگوار ہوتا تھا۔ ناسخؔ سے متعلق یہ بھی لکھا گیا ہے کہ وہ دن بھر گھر کا دروازہ بند رکھتے تھے اور شام کے وقت شاگردوں اور دوسروں کو تشریف لانے کی اجازت دیتے تھے۔ ناسخؔ کا شعر ہے:

شام سے تا صبح ہے مجھ کو جو اب سیرِ لغات
سامنے رکھتا ہوں اپنے نسخۂ فرہنگ و شمع

استاد کے اس شعر میں شاگرد کی ایک ممکن تصویر مجھے مل گئی۔ شاید میر انیسؔ شام سے تا صبح نسخۂ مقتل اور شمع رکھ کر کربلا کی سیر کرتے ہوں۔

❁❁❁❁

انیسِ مرثیہ

زیرِ طبع

اصغر مہدی اشعر

دبیرِ مرثیہ

زیرِ طبع

اصغر مہدی اشعر

انیسؔ کا رثائی احساس

عادل مختار

اکثر اوقات شفافیت یا سادگی کا ادراک ہی شعر کے حوالے سے فریب دیتا ہے۔ ہم جس شعر یا نظم کو بہت ہی سادہ اور شفاف سمجھ رہے ہوتے ہیں، یا کسی کلام میں میں برتے گئے صنائع بدائع اور تلازمہ کاری کا ادراک کرتے ہیں اور کلام کے معنی کا فہم قبول کرتے ہوئے یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ ہم اس شعر یا نظم کے معنی کو وصول کر رہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ دعوی بھی رکھتے ہیں کہ ہم موضوع سے احساس کی بنیاد پر واقفیت حاصل کر رہے ہیں، جبکہ ایسا نہ ہو تو، اصل خطرہ اسی مقام پر کہیں گھات لگائے ہوئے ہوتا ہے۔

شاعری کا اولین تقاضا کچھ جاننا، ماننا یا سیکھنا ہرگز نہیں بلکہ شاعری کا اوّلین تقاضا احساس ہے۔ شاعری کے ذریعے پہلے خود شاعر معنی و مفہوم اور موضوع سے وابستگی کو محسوس کرتا ہے اور پھر اپنے احساس کو اس انداز سے تخلیق کے بعد ترتیب دیتا ہے کہ وہی احساس مکمّل طور پر یا اس کا بیشتر حصّہ اُس کا قاری اور سامع بھی محسوس کر سکے۔

اب اگر کوئی مفہوم پیچیدہ ہے اور خود شاعر کا احساس بھی اسی پیچیدگی سے عبارت ہے تو کیا سادہ اور شفاف مصرعوں کو موزوں کرنے سے، کہ جنھیں سامع سماعت کے بعد فوراً سمجھ بھی لے اور داد کا شور بھی اٹھے، اس ''احساس'' کا ابلاغ ہو سکے گا کہ جس کا تقاضا موضوع نے پہلے شاعر سے کیا تھا۔ اسی طرح وہ احساس کہ جو کسی سچائی کی طرح تاب ناک ہو کیا اس کا ابلاغ کسی پیچیدہ ذریعۂ اظہار سے کیا جا سکتا ہے؟ لہٰذا اظہار اور ابلاغ کے ذرائع کی نوعیت کا تعیّن کہ جو احساس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بنیاد ہو ایک شاعر کے لیے مہم ترین مسئلہ ہے۔

مطالعہ انیسؔ کے دوران ہمیں بار بار اس بات کا احساس ہوگا کہ شاعری کے مذکورہ مہم ترین مسئلے سے میر انیس شعوری طور پر آگاہ بھی تھے اور اس مسئلے کو حل کرنے میں وہ مہارت بھی رکھتے تھے۔

انیسؔ کے مرثیوں کے مطالعے دوران اب ہم اگر مقاتل، سیرت اور تاریخ کے علاوہ بھی ایک کربلا کو محسوس کرتے ہیں تو یہ کربلا انیس کے اپنے احساس کی آئینہ دار ہے۔ وہ احساس کہ جو انیس کا بطورِ تخلیق کار کربلا کے حوالے سے ایک انتہائی ذاتی احساس ہے اور یہی ذاتی احساس جہاں ایک تخلیق کار کا بنیادی حق ہے وہیں، جیسا کہ عرض کیا گیا، خود شاعری کا اوّلین تقاضا بھی ہے۔

وہ لمحات کہ جس میں ایک شاعر کسی احساس کی گرفت میں ہوتا ہے اور وہ جس مفہوم یا معنی کو محسوس کرتے ہوئے اس سے ایک ذاتی تعلق استوار کرتا ہے یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے کہ جہاں شاعر پر انکشافِ ذات کا باب کُھلتا ہے یعنی شاعر اسی قسم کے لمحے میں محسوس کرتا کہ وہ اپنے سوا کوئی ''دوسرا'' نہیں ہے۔ یہ جو اکثر سننے میں اور پڑھنے میں آتا ہے، ''انیس، انیس ہی ہے'' تو ایسا اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کربلا کے حوالے سے انیس کا انکشافِ ذات کہ جس کی بنیاد پر ''کربلائے انیس'' مرثیے میں وجود میں آئی اس کربلا کی تخلیق ادب میں میر انیس کا امتیاز ہونے کے

ساتھ خود قارئینِ انیس کی تطہیرِ احساس کا نصاب ہے۔

عموماً کہا جاتا ہے، ''شاعر وہ ہوتا ہے جو محسوس کرتا ہے، اور اپنے جذبات کا اظہار الفاظ کے ذریعے کرتا ہے۔''

یہ کہنا اور سننا جس قدر سہل ہے یہ معاملہ اس قدر آسان نہیں ہے۔ بہت سے لوگ سوچتے ہیں یا یقین کرتے ہیں یا جانتے ہیں کہ وہ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک خیال ہوسکتا ہے، ایک حد تک عقیدہ ہوسکتا ہے یا محض ادراک ہوسکتا ہے مگر احساس نہیں ہوسکتا اور شاعری احساس ہے۔ نہ کہ جاننا، ماننا یا سوچنا۔ تقریباً کوئی بھی سوچنے، ماننے یا جاننے کا فن سیکھ سکتا ہے، لیکن کسی ایک انسان کو محسوس کرنا نہیں سکھایا جاسکتا۔ کیونکہ بقولِ کمنگز جب بھی آپ سوچتے ہیں یا آپ یقین کرتے ہیں یا آپ جانتے ہیں، آپ بہت سے دوسرے لوگ تو ہوسکتے ہیں آپ خود نہیں ہوتے۔

لہٰذا انیس نے بھی محض علوم وفنون اور ان کے اظہار کی راہ نہیں اپنائی بلکہ اپنے موضوع کے حوالے سے احساس کے ابلاغ کا سامان کیا ہے جس سے رثائیات میں ایک جینوئن ادب کا اضافہ ہوا۔ انیس کے تخلیق کردہ اسی ادب سے کربلا کے حوالے سے احساس کے نئے ابعاد روشن ہوتے ہیں کہ جس کے بعد قارئینِ انیس کے احساسات میں بالعموم اس حوالے سے نمایاں رنگوں کا اضافہ نظر آتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ انیسؔ نے کربلا کو کس طرح محسوس کیا؟

مطالعۂ انیسؔ کے دوران ہمیں اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسے انسان کے افکار اور احساسات کے جہانِ اظہار سے گزر رہے ہیں جو حوادثِ زمانہ کا واقف ہے، تاریخ کے نتائج سے آگاہ ہے اور دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ ساتھ اس عالمِ رنگ و بو کے رنگوں کی طاقت ور کشش کو بھی جانتا ہے اور اس کائناتِ آدم و عالم میں انسانوں کی ایک دوسرے سے وابستہ آرزوؤں اور دیگر مسائل اور اس سے بڑھ کر انسانی حقوق وفرائض سے بھی آشنا ہے۔ انیسؔ کا احساس ایک بیدار حواس رکھنے والے انسان کا احساس ہے۔ ایک ایسا انسان کہ کہ جو معاشرے کی شیرازہ بندی بھی دیکھ چکا ہے اور، سماجی، سیاسی اور مذہبی شیرازے کو بکھرتا ہوا بھی دیکھ رہا ہے۔ انیس کربلا کا شاعر ہے مگر وہ اپنے خالصتاً انسانی مزاج اور نظر کی بدولت کربلا اور اس سے متعلق کرداروں کو مذہب کی عینک سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ اپنے موضوع سے شانِ عمومی سے معمور جذبات کی بدولت ایک بسیط دائرۂ احساس سے وابستگی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انیس کے مرثیوں کی کربلا اور اس کے کردار مقاتل اور تاریخ کی کتب میں موجود کرداروں کے واقعات انیس کے احساس کے فلٹر سے گزر کر نئی تشکیلات پاتے ہیں اور انسانی سماج کے شعور کی متحرک سطح پر ابھرتے ہیں۔

وہ انیس کہ جس پر عالم رنگ و بُو کی بے ثباتی کا انکشاف ہو چکا ہے اور اس کا احساس خارج کے انقلابات کے باعث اور بھی شدید ہو چکا ہے تو وہ اس احساس سے نہ صرف مضمونِ تازہ ترتیب دیتا ہے بلکہ اس مستقل احساس، جو انیسیت کا امتیاز ہے، کو اپنے قارئین میں بھی منتقل کرتا ہے کہ جس سے کربلا سے متعلق ایک آفاقی باب کھلتا ہے

حُر کے اصرار کو دیکھتے ہوئے، امام حُسینؑ خیموں کی جگہ تبدیل کرنے کا ارادہ فرماتے ہوئے حضرتِ عباسؑ کو جو تسلّی دیتے ہیں وہ انیسؔ کے اسی احساس سے عبارت ہے۔

تھوڑے سے بستروں کی ہے درکار ہم کو جا　　جنگل ہوا تو کیا جو ترائی ہوئی تو کیا

ہے عمر بے ثبات زمانہ ہے بے وفا　　آرام کا محل نہیں یہ عاریت سرا
اب وہ کہاں ہیں شہر جنھوں نے بسائے ہیں
سب اس زمیں پہ خاک میں ملنے کو آئے ہیں

انیسؔ کے سلاموں اور مرثیوں میں اس احساس کے آئینہ دار مضامین جا بجا ملیں گے۔شکست و ریخت کی زد پر معاشرے میں انسانی رشتوں کے حوالے سے بھی انیس کا احساس اور اس کی ترتیب ایک نمایاں رثائی پہلو ہے۔ یہ پہلو اس قدر روشن ہے کہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ انیس کی شاعری انسانی رشتوں کی شاعری ہے۔اُس دور میں رشتوں کا نظام مضبوط ہوتے ہوئے بھی انیسؔ کی فکر نے اس انسانی بُعد کو جمالیاتی جِلا بخش کر اس کی اہمیت کو واضح کیا تھا۔آج اکیسویں صدی میں تو باقاعدہ اس امر کی ضرورت محسوس کی جارہی کہ انسانی قدروں اور انسانی رشتوں کا احساس معاشرے میں پروان چڑھایا جائے۔ایسے میں انیسؔ کے ادراک اور احساس دونوں سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔ انسانی رشتوں کے حوالے سے احساس پر مبنی شاعری انیس کے ہاں اس وقت اپنے کمال پر ہوتی ہے جب شہادت سے قبل رخصت اور بعدِ شہادت کسی شہید کے متعلقین لاش پر آتے ہیں۔

خیمے میں مسافر کا وہ آنا تھا قیامت　　اک ایک کو چھاتی سے لگانا تھا قیامت
آنا تو غنیمت تھا پہ جانا تھا قیامت　　تھوڑا سا وہ رخصت کا زمانا تھا قیامت
واں بین، ادھر صبر و شکیبائی کی باتیں
افسانۂ ماتم تھیں بہن بھائی کی باتیں

زینب کی وہ زاری ، وہ سکینہ کا بلکنا　　وہ ننھی سی چھاتی میں کلیجے کا دھڑکنا
وہ چاند سا منھ اور وہ بُندے کا چمکنا　　حضرت کا وہ بیٹی کی طرف یاس سے تکنا

اسی مقام پر زوجۂ امام حُسینؑ جناب رباب ع کا سخن ملاحظہ فرمائیں

چھبیس برس تک نہ چھُٹا آپ کا پہلو　　اب ہجر ہے تقدیر میں یا سیّدِ خوش خو
ہر شب رہے تکیہ سرِ اقدس کا جو بازو　　ہے ہے اسے اب رسّی سے باندھیں گے جفا جو
سر پر نہ ردا ہو گی تو مر جاؤں گی صاحب
چھپنے کو میں جنگل میں کدھر جاؤں گی صاحب

اگر عقیدت، کلام اور روایات کو دیکھیں تو اس قسم کی تفصیل یا تو عنقا نظر آئے گی یا غیر موزوں ،مگر انسانی احساس جو انیس کے ذریعے مرتب ہوا ہے وہ سامع کے احساس سے ہم آہنگ ہونے کے بعد اپنی صداقت اور ثبوت کے لیے کسی دوسرے حوالے کا محتاج نہیں رہتا۔

اسی مقام پر انیس کے جمالیاتی احساس کی مثالیں بھی اپنے مقام پر معتبر محسوس ہوتی ہیں۔اگرچہ اس حوالے سے مثالوں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہوسکتا ہے مگر یہاں اختصار پیشِ نظر ہے اور حسبِ سابق تبرکاً اور اشارتاً عرض ہے۔

کربلا میں قافلۂ حُسینی کے ورود پر انیس اپنے جمالیاتی احساس اور ادراک کے تمام رنگوں کو کھپاتے ہیں:

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور　　دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور　　وہ جا بہ جا درختوں پہ تسبیح خواں طیور

اس حوالے سے انیس کے کئی بند معروف ہیں مگر ان کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل بند اس احساس کو جس طرح قارئین کی طرف منتقل کرتا ہے اس سے کربلا کے ساتھ ایک اہل وعیال رکھنے والے قاری کی جمالیاتی سے بڑھ کر جذباتی وابستگی پیدا ہوتی ہے:

تکنے لگے پہاڑوں کو مسلم کے دونو لال　　پھولوں سے کھیلنے لگے زینب کے نو نہال
سبزے سے واں کے ابنِ حسن خوش ہوئے کمال　　کی عرض اس زمین کا ہر گُل ہے بے مثال
اے خسروِ زمیں یہ جگہ ہے جلوس کی
خوشبو ہے یاں کی خاک میں عطرِ عروس کی

انیس کی اپنے موضوع اور ہنر سے یہی وفا ہے جو آئندہ مرثیہ کہنے والے شعرا کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اس بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مرثیے کے نئے شعرا انیس کا طرز اپنائیں یا ان کے تتبع کے باعث اسی طرز کی زبان، مضمون آفرینی، خیال آفرینی اور معنی آفرینی کی تخلیق میں کوشش کریں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انیس نے جس طرح اپنے احساس کی بدولت کشفِ ذات کو حاصل کیا ہے اسی طرح ہر مرثیے کا شاعر اپنا الگ علاقۂ فکری اور نظریۂ حیات رکھتے ہوئے اپنے منفرد احساس کی بنیاد پر مرثیے کے میدان میں وارد ہوسکتا اور مرثیے کے افقی پھیلاؤ میں اضافہ کرسکتا ہے۔ آج ایک مرثیہ نگار کے لیے اس سطح کے نظریۂ فکر وفن کا جاننا اور اس کی طرف متوجہ ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ یہ دور فوری اثر کرنے والے عوامل کا دور ہے۔ اس میں نظام، معاشرہ، حالات، رجحانات اور واقعات ہر وقت ایک فرد کو اس کے حقیقی وجود کے علاوہ کوئی دوسرا انسان بنانے کے درپے ہیں۔ ایسے میں ایک مرثیہ نگار کا اپنے منفرد احساس کی بدولت مرثیہ نگاری کو انجام دینا ایک جہاد کی سی کیفیت رکھتا ہے کہ جس سے اس صنف کا وقار قائم رہ سکتا ہے ورنہ یکسانیت اور غیریت سے اس صنف کو دیگر اصنافِ ادب کہیں زیادہ خطرات لاحق ہوسکتے ہیں۔ شاعری میں احساس کی بنیاد پر زبان و بیان تخلیق کس قدر اہم ہے اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کسی بھی قوم سے اس کی زبان کا تلفّظ اور اس کے بسیط متون تک چھینے جاسکتے ہیں اور ایسا معلوم تاریخ میں کئی بار دیکھنے کو ملا ہے، اینگلو سیکسنز کی مثال تو اس حوالے سے بلا تأمل پیش کی جاسکتی ہے، اس کے علاوہ ایک قوم کی بیخ کنی بھی کی جاسکتی ہے، اس قوم کے اداروں میں آمرانہ اور جابرانہ طریقے سے کسی دوسری زبان کو رواج دینے کی کوشش بھی کی جاسکتی ہے مگر بقول ٹی ایس ایلیٹ جب تک وہ زبان کہ جس زبان میں ایک قوم اپنے آپ کو اور معنی و مفاہیم کو محسوس کرتی ہے، اس کے ساتھ احساس کی بنیاد پر اس قوم کا رشتہ قائم رہتا ہے اس زبان میں شعری تخلیقات منظر پر ابھرتی رہتی ہیں اور اس طرح احساس کی بنیاد پر کی گئی شاعری اس قوم کے تشخّص کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ اس مقام پر اگر ایلیٹ کی اس بات پر میں اپنے تمام قارئین کو متفق فرض کروں تو انیس اپنے رثائی احساس اور اس کی بنیاد پر تخلیق کرنے والی زبان کے سبب ایک قومی شاعر کے منصب پر بھی فائز نظر آئیں گے۔ یعنی ایک ایسا شاعری جس نے نہ صرف اپنے احساس کو زبان دی بلکہ اپنے معاشرے کے احساسِ مجموعی کی بھی ترجمانی کی اور ثقافتِ احساس میں نئے رنگوں کا اضافہ کیا جو بعد میں ان لوگوں پر بھی اثر انداز ہوئے جو مرثیہ تو دور خود شاعری سے بھی حقیقی طور پر واقف نہیں۔

❁❁❁❁

انیسؔ کی خلّاقیت

علی عرفانؔ

اردو ادب میں صرف دو شخصیتیں ایسی گزری ہیں جنھیں ''خدائے سخن'' کے لقب سے یاد کیا گیا: ایک میر تقی میرؔ اور دوسرے میر ببر علی انیسؔ۔ خدائی سے خلّاقیت کا پہلا واسطہ ربط ہے۔ اس حوالے سے میرؔ کی خلاقیت پر کوئی اور گفتگو کرے۔ میرا موضوعِ گفتگو انیسؔ کی خلّاقیت ہے۔ خلاقیت کی کچھ صفات ہوتی ہیں جن میں حسبِ ذیل صفات شامل ہیں۔

۱۔ کسی غیر موجود کو وجود عطا کرنا

۲۔ جب چاہے موجود کی تاثیر کو بدل دینا

۳۔ جب چاہے موجود کے فعل کو بدل دینا

۴۔ موجود کو اس کے مانوس پس منظر سے اٹھا کر بالکل غیر مانوس پس منظر میں اس طرح رکھ دینا کہ غیر مانوس پس منظر ہی درست پس منظر ثابت ہو جائے۔

یعنی خلقت، اور پر مخلوق کی صفت فصل اور مقام پر مکمل اختیار، یہی خلاقیت کے مظاہر ہیں۔ اب اگر کوئی اقلیم سخن میں یہ اختیار رکھتا ہے تو اسے خدائے سخن نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔

یہ نتیجہ طے ہو گیا تو اب درجِ بالا فہرست کے عناصر کو یکے بعد دیگرے کلامِ انیسؔ میں تلاش کیا جائے۔

ایک لفظ کا ذکر کرتے ہیں جو انیسؔ سے پہلے اردو زبان میں نہیں تھا۔ انیسؔ سے پہلے وہ صرف ایک موت تھا۔ انیسؔ نے اسے لفظی وجود عطا کیا اور اس لفظ میں احساس کی عجیب کیفیت پیدا کر دی۔ مرثیہ ہے ''جاتی ہے کس شکوہ سے ان میں خدا کی فوج'' حضرت عباسؑ کو علمِ فوج عطا ہوا۔ زینبؑ کے لاڈلوں نے علمبرداری کے حوالے سے اپنی دیرینہ تمنا کا ماں سے اظہار کیا تو: ''انگشت رکھ کے دانتوں میں ماں نے کہا کہ ہا'' اس ''ہا'' کی بلاغت پر ہزاروں الفاظ قربان۔

اب ایک نظر تبدیلیٔ تاثیر پر ڈالتے ہیں۔ تبدیلیٔ تاثیر معجز نما ہوتی ہے، جیسے نارِ نمرود کا۔۔۔ ہو جانا۔ اور تاثیر میں تبدیلی کا اختیار وہی رکھتا ہے جس میں صفتِ خلاقیت ہو۔ اردو زبان میں کچھ حرف ہیں جو کسی لفظ میں آ جائیں تو صوتی کرختگی پیدا کر دیتے ہیں جیسے ''ٹ''، ''ڈ'' اور ''ڑ''، صوتی کرختگی والے وہ لفظ اگر ایک ساتھ کسی مصرعے میں آ جائیں تو اس مصرعے کا بوجھل ہو جانا لازمی ہے۔ ایسے الفاظ کی یہ تاثیر ہوتی۔ اور اگر وہ لفظ اگر نسبتاً غیر مانوس ہوں تو یہ تاثیر اور شدید ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی دو لفظ ملاحظہ کیجیے۔ ایک لفظ ہے ''اساڑھ'' یعنی ہندی حساب سے برسات کا پہلا مہینہ (فرہنگ انیسؔ)۔ دوسرا لفظ ہے ڈونگڑا' موسم گرما کے پہلے روز کی بارش (فرہنگِ انیسؔ)۔

انیسؔ نے اپنے مرثیے ''حضرت سے جب برادرِ خوشخو جدا ہوا'' کے ایک مصرعے میں یہ دونوں لفظ رکھ دیے ہیں بلکہ ان الفاظ کے ساتھ قافیہ بھی ایسا لیا ہے جس میں ''ڑ'' کی آواز ہے مگر نہ مصرعے بوجھل ہوا ہے نہ روانی میں فرق آیا ہے۔ انیسؔ کی بیت ہے۔

اس زور و شور سے کوئی لڑتا نہیں کبھی
یوں ڈونگڑا اساڑھ میں پڑتا نہیں کبھی

اب چلتے ہیں تبدیلیٔ فعل کی طرف، غذا کے طور پر استعمال کی جانے والی اشیاء یا تو ٹھوس ہوتی ہیں یا سیّال۔ جو ٹھوس اشیاء ہوتی ہیں انھیں کھایا جاتا ہے اور جو سیّال ہوتی ہیں انہیں پیا جاتا ہے۔ اب اگر پینے والی شے کو کھایا کھایا جائے یہ بات یقیناً تبدیلیٔ فعل کے زمرے میں آئے گی۔ اوس سیال ہے اور اگر بطور غذا استعمال کی جائے تو اسے پیا جانا چاہیے، مگر انیسؔ جب مصرع دیتے ہیں تو کہتے ہیں:

'' کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا ''

(از: مرثیہ پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح)

فعلِ عام کے اعتبار سے، بغیر مصرعے کے وزن میں فرق کیے، انیسؔ بڑے آرام سے ''پی پی کے اس۔۔۔'' کہہ سکتے تھے مگر پھر مصرعے میں وہ بات نہ رہتی۔ اور یہ بات کوئی خدائے سخن ہی جان سکتا تھا۔

کچھ اشیاء اور کچھ وجود ہوتے ہیں جن کا ایک عمومی پس منظر ہوتا ہے۔ مثلاً ''جانور'' کا عمومی پس منظر ہے۔ ''جنگل'' جانور کے بغیر جنگل کا تصور محال ہے اور جنگل کے بغیر جانور کا تصور مشکل ہے۔ نظم ہو، نثر ہو یا عام بول چال ہو، جنگل اور جانور تقریباً لازم و ملزوم ہیں۔

اپنے مرثیے ''حضرت سے جب برادرِ خوشخو جدا ہوا'' کے بند ۴۷ میں انیسؔ فوجِ یزید کے ایک سپاہی کا سراپا بیان کرتے ہیں جو شہزادۂ علی اکبرؑ سے لڑنے کے لیے آیا ہے!

ٹکڑے کرے پہاڑ کو وہ گرزِ گاوِ سر　　پہنے ہوئے زرہ پہ زرہ بر میں بد سیر
زنجیر آہنی سے کسے جنگ پر کمر　　منھ پھیر کے جس سے تیغ وہ فولاد کی سپر
دستانے دونوں دست تعدی پسند پر
پاکھ بھی آہنی تھی شَفق کے سمند پر

اگلے بند میں انیسؔ نے حضرت علی اکبرؑ کا ردِ عمل نظم کیا ہے:

اکبرؑ بھی مسکرائے ستم گر کو دیکھ کر
فرمایا آدمی ہے کہ ۔۔۔۔ کا جانور

بالکل سامنے کی بات تھی کہ مصرعے میں جہاں میں نے خالی جگہ چھوڑی ہے وہاں ''جنگل'' کا لفظ آجائے مگر انیسؔ نے وہاں دوسرا ہی لفظ رکھ دیا ہے۔ اور ''جانور'' کا پس منظر ہی بدل دیا ہے:

فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور

جنگل کے لفظ کے ساتھ کچھ مثبت تصورات بھی ہوتے ہیں۔ جنگل میں آب بھی ہوتا ہے گیاہ بھی ہوتی ہے اور سایہ بھی ہوتا ہے۔ دوسری طرف صحرا وہ جگہ ہے جہاں نہ آب ہے نہ گیاہ نہ سایہ۔ بس تپش ریت کا سماں ہے۔ ''صحرا کا جانور'' کہنے میں جو ایک وحشت کا تاثر ہے وہ ''جنگل کا جانور'' کہنے میں نہیں ہے۔ ''خدائے سخن'' کا تاج انیسؔ ہی کے سر کے لیے بنا ہے یہ ثابت کرنے کے لیے ہم نے جو شواہد پیش کیے ہیں وہ کافی ہیں مگر جی چاہتا ہے کہ انیسؔ کی خلّاقیت پر کچھ اور گفتگو ہو۔ شواہد دو طرح کے ہوتے ہیں: بالراست شواہد (Direct Evidence) اور واقعاتی شواہد

(Circumstandial Evidence)۔بالراست شواہداو پر پیش کیئے جا چکے ہیں۔اب آیئے کچھ واقعاتی شواہد پر نظر ڈالیں۔

خلاقیت کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ مخلوق خالق کے ارادے کی طابع ہو۔خدائے سخن کے تعلق سے مسعود حسن رضوی ادیبؔ جیسے صاحب علم وحکمت رقم طراز ہیں کہ:''کلام کا اثر انیسؔ کے ارادے کے طابع ہے۔''(روحِ انیسؔ)''

خالق موجد بھی ہوتا ہے۔''روحِ انیسؔ کے مقدمے میں مسعود حسن رضوی ادیبؔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ:''کچھ صفتیں ایسی ایسی بھی ہیں جو انہیں کی طبیعت نے ایجاد کی ہیں اور جن کا کوئی نام اب تک مقرر نہیں ہوا۔''

ایک جگہ ڈاکٹر اعجاز حسین اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ''انیسؔ کو زبان پر وہ قدرت حاصل ہے جو خالق کو مخلوق پر۔جن الفاظ سے جس موقع پر جو کام لینا چاہتے ہیں وہ خادمانہ اطاعت کے ساتھ حکم بجالاتے ہیں۔''(حدیثِ دل میر انیسؔ نمبر)۔

انیسؔ نے الفاظ وصفتیں ہی نہیں خلق کی محاورے بھی خلق کیے۔رام بابو سکسینہ کا یہ دعویٰ ہے کہ''اردو میں سیکڑوں نئے محاورے ان کے دم سے آئے ہیں۔''(حدیثِ دل، میر انیسؔ نمبر)انیسؔ کی خلاّقیت کی مظہر یہ حقیقت بھی ہے کہ انیسؔ نے مرثیے کے کینواس (Canvas) کو اتنا وسیع کر دیا کہ یہ وسعت کائنات پر محیط ہوگئی ہے۔صاحبانِ نظر انصاف سے بتائیں کہ انیسؔ سے پہلے مرثیے کے موضوعات کیا تھے اور بعد انیسؔ حیات اور کائنات کا کون سا موضوع ہے جو مرثیے کے دامن میں نہیں سما سکتا؟ مسعود حسن رضوی جیسے عظیم محقق کا بیان ہے کہ:

''انیسؔ نے جہاں مرثیے کے مضامین میں تنوع اور زبان میں وسعت پیدا کی ہے وہاں اس کے اثر کا دائرہ بھی بہت وسیع کر دیا ہے۔''

(ماہ نامہ''آج کل''میر انیسؔ نمبر)

مقبول ابنِ سعید، انیسؔ کی خلاّقیت نے ادب کے ایک نئے دور کو خلق کیا ہے۔''انتخاب انیسؔ''حصہ اول (قمر پاکٹ بک سیریز) کے پیش لفظ میں وہ رقم طراز ہیں کہ:''ادب کی تاریخ میں ایسی شخصیتیں تو بہت ملیں گی جنہوں نے اپنے دور کی ترجمانی کے فرائض انجام دیے ہوں اور اپنے ماحول''مذاق اور عام ادبی فضا کے مطابق اپنی تخلیقات پیش کی ہوں لیکن ایسی شخصیتیں بہت کم ملیں گی جنہوں نے نہ صرف اپنے دور کی نمائندگی کی ہو بلکہ رہنمائی بھی کی ہو اور اپنے عظیم کارناموں سے بھی ایک نئے دور کے خالق بن گئے ہوں اور اپنی تخلیقات سے ادب کی تاریخ کا رخ موڑ دیا ہو۔میر انیسؔ بھی اردو ادب میں ایسی ہی ایک اہم شخصیت کے مالک ہیں۔''

اب آیئے، انیسؔ کے خدائے سخن ہونے کی بابت دنیائے ادب کی کچھ قدآور ہستیوں کی گواہی لیتے ہیں۔

صادق علی دلاوری:''مرثیہ نگاری ایک خاکہ تھی جسے انیسؔ کے موئے قلم نے ایک جیتی جاگتی بولتی تصویر بنا دیا۔ایک جسدِ بے روح تھا جس میں خدائے سخن نے روح پھونک دی۔''(از''جواہرِ انیسؔ'')

صفدر ہمدانی:''خدائے سخن میر ببر علی انیسؔ ہر عہد کا شاعر(عالمی اخبار گیارہ دسمبر ۲۰۱۳ء)۔

نشور واحدی:

جانِ وطن انیسؔ بہار چمن انیسؔ　　دنیائے شاعری میں خدائے سخن انیسؔ

(از''آج کل''میر انیسؔ نمبر)

نسیمؔ امروہوی:

انیسؔ کون خدیو سخن خدائے سخن

(ازمرثیہ ''چراغِ خونِ حسینی مدام روشن ہے'')

قمرؔ حسنین:

سب کا انیسؔ ہے وہ قمرؔ اس یقین پر　　ہوں گامزن خدائے سخن کی زمین پر

واقعاتی شواہد کے سلسلے کو اپنے ایک مشاہدے پر ختم کرتا ہوں کہ انیسؔ کی خلاقیت کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ انیسؔ نے منظر کو، جو ایک بے جان تصویر تھا، جان دی ہے اور متحرک کر دیا ہے۔ بطورِ مثال ایک مرثیے (''بخدا فارسِ میدانِ تہور تھا حرؑ'') سے ایک بند پیش کرتا ہوں۔ سیاق وسباق یہ ہے کہ حرؑ زخمی ہو کر گھوڑے سے زمین پر آچکا ہے۔ امام حسینؑ میدان میں پہنچے اور حرؑ کے سر کو اپنے زانو پر لے لیا ہے۔ اس بند میں انیسؔ جو منظر پیش کرتے ہیں اس میں زاویۂ نظر حُر کا ہے۔ اب جدھر جدھر حرؑ کی نظر جائے گی قاری کی نظر بھی تعاقت کرے گی۔

''نیم وا چشم سے حُر نے رخِ مولا دیکھا''

حُر کا سر حسینؑ کے زانو پر ہے تو اس مصرعے کے اعتبار سے حُر کا زاویۂ نظر نیچے سے اوپر کی طرف جا رہا ہے۔ مگر فوراً ہی قاری دیکھتا ہے کہ حُر نے اپنے سر کو جنبش دی اور زاویۂ نظر بدلا: ''زیرِ سر زانو شبیرؑ کا تکیہ دیکھا'' مصرعے میں حُر کے سر کی جنبش کا بالراست کوئی ذکر نہیں ہے مگر زاویۂ نظر کی تبدیلی سے قاری کو یہ جنبش میں دکھا دی۔ زاویۂ نظر پھر بدلا:

''مسکرا کر طرفِ عالمِ بالا دیکھا''

اب ایک منظر متحرک تو تھا مگر خاموش تھا۔ اگلے مصرعے سے منظر بدلنے بھی لگا۔

''شہ نے فرمایا کہ اے حُر جری کیا دیکھا'' اور بند ختم ہوتا ہے۔

عرض کی حسنِ رخِ حور نظر آتا ہے　　فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے

آخری مصرعے بھی انیسؔ کا ایک ساتھ ذکر ہوتا ہے، عموماً جب عرش اور فرش کا ایک ساتھ ذکر ہوتا ہے چاہے نظم میں ہو یا نثر میں، تو عرش کو اولیت دی جاتی ہے اور ''عرش وفرش'' کہا جاتا ہے۔ نورانیت کا تصور بھی فرش کی بانسبت عرش کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے۔ اگر انیسؔ کے علاوہ کوئی اور شاعر ہوتا تو اغلب ہے کہ یہ مصرع ہوتا:

عرش سے فرش تلک نور نظر آتا ہے

مگر انیسؔ کے مصرعے میں نور کا انعکاس فرش سے عرش کی جانب ہے، اور کیوں نہ ہو کہ فرش پر حسینؑ ہیں۔

انیسؔ کو خدائے سخن کہنے کی اور بھی کئی دلیلیں ہو سکتی ہیں مگر میں سمجھتا ہوں جو دلیلیں اوپر دے دی گئی ہیں وہ اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے کافی ہیں کہ ''خدائے سخن'' کا تاج انیسؔ ہی کے سر پر زیب دیتا ہے۔

آخر میں ایک سوال رہ جاتا ہے کہ انیسؔ کو خدائے سخن سب سے پہلے کب کہا گیا۔ اس ذیل میں ڈاکٹر عسکری صفدر صاحبہ اپنی دلچسپ کتاب ''جائزۂ انیسؔ'' میں یوں رقم طراز ہیں: ''۱۸۹۸ء میں ہی انیسؔ کو خدائے سخن کہا گیا جس کا ثبوت اس بات سے عیاں ہے کہ امجد علی اشہری نے انیسؔ کی سوانح کا ۱۸۹۸ء میں شروع کیا۔ اشہری نے اپنی تصنیف ''ایشای شاعری'' میں یہ شعر اس طرح کہا:

ملا انیسؔ سے میں لکھنؤ میں ہوں دو بار
انیسؔ وہ جو خدائے سخن تھے بے تکرار

کردارِ حضرت فاطمہ صغریٰؑ کلام میر انیسؔ کے آئینے میں

زائر حسین ثالثی

تاریخ کربلا کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کی تین بیٹیاں تھیں۔سب سے بڑی بیٹی حضرت فاطمہ کبریٰؑ ہیں جن کا عقد ایک روایت کے مطابق امام حسنؑ کے بیٹے حضرت قاسمؑ کے ساتھ کربلا ہی میں انجام پایا تھا۔دوسری بیٹی جناب فاطمہ صغریٰؑ ہیں جو جناب فاطمہ کبریٰؑ سے چھوٹی ہیں اور سب سے چھوٹی بی بی سکینہؑ ہیں جن کا انتقال قید کے دوران زندانِ شام میں ہوا تھا۔

جس وقت امام حسینؑ نے مدینے سے سفر کا آغاز کیا تھا اس وقت ان کی صاحبزادی بہت زیادہ بیمار تھیں۔اس وجہ سے سفر میں ہونے والی مصیبتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے امام حسینؑ نے ان کو مدینے میں چھوڑ دیا تھا۔بزرگ خواتین میں سے جناب عباسؑ کی والدہ ام البنینؑ اور ام المومنین حضرت ام سلمیٰ ان کے پاس رہ گئی تھیں۔میر انیسؔ نے کئی مرثیوں میں جناب فاطمہ صغریٰؑ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔روایات کے مطالعے سے اس کا علم نہیں ہو پاتا کہ امام عالی مقام کے سفر کربلا کے وقت جناب فاطمہ صغریٰؑ کی عمر کیا تھی۔انیسؔ نے اپنے کلام میں بھی اسکا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔لیکن گفتگو کا جو انداز بیان کیا ہے اس سے اندازہ لگتا ہے کہ بی بی فاطمہ صغریٰؑ اس وقت عمر کی اس منزل پر تھیں جہاں بچپن کی رخصت ہوتی ہے اور شباب کی آمد۔جہاں بچپن کا انداز تو پایا جاتا ہے لیکن لب ولہجہ میں پختگی نہیں آپاتی۔

تاریخ میں ملتا ہے کہ جناب صغریٰؑ عرصے سے بیمار تھیں اس لیے ان کے مزاج میں زندگی سے مایوسی اور اپنے اوپر رحم کھانے کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے جو ایک فطری عمل ہے۔میر انیسؔ نے اس کو بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

میر انیسؔ نے جتنے بھی مرثیوں میں بی بی فاطمہ صغریٰؑ کا ذکر کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بی بی اپنے بھائیوں کو چاہنے والی، باپ کی عاشق اور کنبے کی فدائی تھیں۔لیکن بہرحال اللہ کی مرضی پر سر جھکانے والی بھی تھیں۔اس لئے جب امامؑ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کا سفر میں جانا مناسب نہیں تو خاموشی کے ساتھ اسے منظور کر لیتی ہیں۔

بی بی فاطمہ صغریٰؑ کی امامؑ سے رخصت، بھائیوں سے رخصت اور دیگر اعزاء سے رخصت کا سماں جہاں میر انیسؔ نے پیش کیا ہے وہاں پر ان کی مکالمہ نگاری اور جذبات نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

امام حسینؑ مدینہ سے روانہ ہونے کے لیے تمام تیاریاں مکمل کر چکے ہیں۔مگر مصلحت کے پیش نظر یہ باتیں حضرت فاطمہ صغریٰؑ سے پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔امامؑ اپنی اس بیمار بیٹی کو ضعیف نانی المومنین حضرت ام سلمیٰ کے حوالے کر کے جا رہے ہیں۔اور اپنی والدہ محترمہ حضرت ام البنینؑ کو چھوڑے جا رہے ہیں۔امامؑ چاہتے ہیں کہ بیٹی سے چھپ کر روانہ ہو جائیں۔اپنی بہن جناب زینبؑ سے کہتے ہیں کہ ؎

جانے کی خبر میری نہ صغریٰؑ کہیں پائے　　باتیں کرو ایسی کہ وہ بیمار بہل جائے

ابھی جنابِ زینبؑ اور امام حسینؑ میں یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ بانوئے ناشاد گھبرا کر آواز دیتی ہیں۔

میں لٹتی ہوں کیسا سفر اور کسی سواری　　غش ہوگئی ہے فاطمہؑ صغریٰ مری پیاری

اور پھر کہتی ہیں کہ

اب کس پہ میں اس صاحب آزار کو چھوڑوں　　اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں

یہ ایک ایسی ماں کا بیان ہے جو اپنی بیمار بیٹی کو چھوڑ کر جا رہی ہے۔ میر انیسؔ نے انتہائی سچی اور فطری تصویر کشی کی ہے بی بی فاطمہ کبریٰؑ اور بی بی سکینہؑ چونکہ امام کے ساتھ ہی سفر پر جا رہی ہیں اس لیے وہ بھی بہن کی جدائی کے خیال سے پریشان و مضطرب ہیں۔

چلّاتی تھی کبریٰؑ کہ بہن آنکھیں تو کھولو　　کہتی تھی سکینہؑ کہ ذرا منھ سے تو بولو

چونکہ بی بی سکینہؑ معصوم اور ناسمجھ ہیں اس لیے وہ ہر بات کہہ دیتی ہیں۔

ہم جاتے ہیں تم اٹھ کے بغل گیر تو ہو لو　　چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رو لو

افسوس اسی طور سے غفلت میں رہو گی　　کیا آخری بابا کی زیارت نہ کرو گی

یہ انسانی فطرت ہے کہ بیمار بچے سے اور بچوں کے مقابلہ میں زیادہ الفت ہوتی ہے۔ امامؑ عالی مقام بھی اپنی اس بیٹی سے انتہائی محبت کرتے ہیں اور ان کو اس طرح سے چھوڑ کر جانا بہت تکلیف دہ ہے مگر مقصد کی لگن ہر جذبہ پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے لیکن جذبۂ پدری سے مجبور ہو جاتے ہیں۔

سن کر یہ سخن شاہؑ کے آنسو نکل آئے　　بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے

منھ دیکھ کے بانوؑ کا سخن لب پہ یہ لائے　　کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اس کو بچائے

جس صاحبِ آزار کا یہ حال ہو گھر میں
دانستہ میں کیونکر اسے لے جاؤں میں سفر میں

امامؑ عالی مقام جس انداز میں مادر جناب فاطمہؑ صغریٰ سے نہ لے جانے کا عذر پیش کر رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ماں کی ممتا کا بھی پورا پورا احساس ہے۔

کہہ کر یہ سخن بیٹھ گئے سیّدِ خوش خُو　　اور سورۂ الحمد پڑھا تھام کے بازو

بیمار نے پائی گلِ زہراؑ کی خوشبو　　آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو

ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آئے ہیں اماں
کیا میرے مسیحا میرے پاس آئے ہیں اماں

بی بی فاطمہ صغریٰؑ ماں اور باپ کے چہرے دیکھ کر سمجھ لیتی ہیں کہ آج سب لوگ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں لیکن دل کی بات کو فوراً کہہ بھی نہیں سکتی ہیں آخر مجبور ہو کے کہتی ہیں ؎

وہ کون سا ساماں ہے جو یوں روئے ہیں بابا　　کھل کر کہو کیا مجھ سے جدا ہوتے ہیں بابا

پھر اپنے چاروں طرف نظر ڈالتی ہیں تو گھر میں سناٹا نظر آتا ہے تو خود ہی سمجھ جاتی ہیں ؎

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لیے باہر　　نہ فرش نہ ہے مسندِ فرزندِ پیمبرؐ

دالان سے کیا ہو گیا گہوارۂ اصغرؑ　　اجڑا ہوا لوگو نظر آتا ہے مجھے گھر

اوراس بند کی بیت کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جیسے واقعی مریضہ سے برداشت کرنا مشکل ہورہا ہے۔

کچھ مجھ سے تو بولو مرا دم گھٹتا ہے اماں　　کیا سبطِ پیمبرؐ سے وطن چھٹتا ہے اماں

بی بی صغریٰؑ کی یہ باتیں سن کر امامؑ عالی مقام انھیں تمام باتیں واضح طور پر بتادیتے ہیں۔

بیٹی سے یہ فرمانے لگے سیّدِ مظلومؑ　　پردہ رہا کیا اب تمھیں خود ہوگیا معلوم

تم چھٹتی ہو اس واسطے سب روتے ہیں صغریٰؑ　　ہم آج سے آوارہ وطن ہوتے ہیں صغریٰؑ

امامؑ عالی مقام انتہائی نرمی سے وہ تمام حالات بتارہے ہیں کہ جس کے تحت سفر درپیش ہے وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ خاندانِ رسالتؐ کی بیٹی ہے راضی بہ رضا رہنا اس کی فطرت ہے

اب شہر میں ایک دم ہے ٹھہرنا مجھے دشوار　　میں پا بہ رکاب اور ہو تم صاحبِ آزار

پھر آتا ہے وہ گھر میں سفر میں جو ہو بیمار　　تکلیف تمھیں دوں یہ مناسب نہیں زنہار

غربت میں بشر کے لیے سو طرح کا ڈر ہے
میرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے

بچی کو سفر میں نہ لے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سفر انتہائی دشوار گزار ہے۔

لو چلتی ہے، خاک اڑتی ہے، گرمی کے ہیں ایام　　جنگل میں نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام

بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام　　دریا کہیں، حائل کہیں پانی کا نہیں نام

صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گزر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مرجائے

لیکن بی بی فاطمہ صغریٰؑ کسی طرح بھی خاندان سے جدا ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی بیماری جلد ختم ہوجائے گی۔ لیکن سب سے جدا ہوکر رہنا دشوار ہے اس لیے مختلف طریقوں سے امامؑ کو راضی کرنے کی کوشش کررہی ہیں۔

صغریٰؑ نے کہا کھانے سے خود ہے مجھے انکار　　پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار

کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کہ یہ بیمار　　گرمی میں بھی راحت سے گزر جائے گی بابا

آئے گا پسینہ تپ اتر جائے گی بابا　　کیا تاب اگر منھ سے کہوں درد ہے سر میں

اف تک نہ کروں بھڑکے اگر آگ جگر میں　　بھولے سے بھی شب کو نہ کراہوں گی سفر میں

قربان گئی چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں　　ہو جانا خفا راہ میں گر روئے گی صغرا

یاں نیند کب آتی ہے جو واں سوئے گی صغراؑ　　وہ بات نہ ہوئے گی جو بے چین ہوں مادر

ہر صبح میں پی لوں گی دوا آپ بنا کر　　دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغرؑ

جناب فاطمہ صغریٰؑ کا خیال ہے کہ شاید بابا مجھے علی اصغرؑ کے بہانے ہی لے چلیں لیکن جب امامؑ کچھ نہیں بولتے تو پھر بے قرار ہو کر امامؑ سے کہتی ہیں ۔

میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو　　بابا مجھے فضہؑ کی سواری میں بٹھا دو

امام حسینؑ بیٹی کی گریہ وزاری سے متاثر ہوتے ہیں باپ کا دل ہے بیٹی کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔

شہؑ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ　　میں کہہ نہیں سکتا مجھے در پیش ہے جو راہ

کھل جائے گا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ　　ایسا بھی ہے کوئی جسے بیٹی کی نہ ہو چاہ

ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغریٰؑ
ہے مصلحتِ حق یہی جو کہتا ہوں صغریٰؑ

گھر کے تمام افراد اشکبار ہیں بی بی صغریٰؑ سب کے چہرے پر نظر ڈالتی ہیں۔ان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی بیماری کی وجہ سے ان سے کترا رہے ہیں آخر وہ شکایت کے انداز میں مخاطب ہوتی ہیں میر انیسؔ نے کتنے فطری انداز میں اس موقع کی تصویر کشی کی ہے۔

صغریٰؑ نے کہا کوئی کسی کا نہیں زنہار　　سب کی یہی مرضی ہے کہ مرجائے یہ بیمار

اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہے نہ وہ پیار　　اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا سب کے ہیں غم خوار

بیزار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا
سچ ہے کوئی مردے سے محبت نہیں کرتا

حضرت علی اکبرؑ اور بی بی فاطمہ صغریٰؑ کی محبت مثالی محبت تھی تقریباً ہر مرثیہ گو شاعر نے اس مضمون کو اپنے اپنے انداز میں نظم کیا ہے۔ میر انیسؔ کا انداز سب سے جدا اور دل میں اتر جانے والا ہے۔میر انیسؔ نے اس موقع کی کتنی سچی تصویر کشی کی ہے۔حضرت علی اکبرؑ سفر کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔اس لیے بہن کے پاس نہیں آسکے۔لیکن بیمار بہن یہ خیال کرتی ہے کہ شاید بھیا بھی اور لوگوں کی طرح میری بیماری کی وجہ سے مجھ سے بیزار ہیں یہی سوچ کر امام حسینؑ سے شکایت کے انداز میں کہتی ہیں

ہمشیر کے عاشق ہیں سلامت رہیں اکبرؑ　　اتنا نہ کہا مر گئی یا جیتی ہے خواہر

پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے　　نہ بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے

مانوس سکینہؑ سے ہیں عباسؑ دلاور　　میں کون ہوں جو میری خبر پوچھتے آکر

سر سبز رہے خلق میں نو بادۂ شبرؑ　　شادی میں بلائیں مجھے یہ بھی نہیں باور

بے دولھا بنے منھ کو چھپاتے ہیں ابھی سے　　میں جیتی ہوں اور آنکھ چراتے ہیں ابھی سے

جناب فاطمہ صغریٰؑ کے بیان سے تمام بیبیاں رونے لگتی ہیں امام حسینؑ جناب صغریٰؑ کو سینے سے لگا کر کہتے ہیں کہ

لو صبر کرو کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر　　منھ دیکھ کے چپ رہ گئی وہ بے کس و دلگیر
نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے　　اچھّا تو کہا منھ سے یہ آنسو نکل آئے

پھر حضرت امام حسینؑ شہربانوؑ کو اشارہ کرتے ہیں کہ علی اکبرؑ کو بلاؤ علی اصغرؑ کو لاؤ تا کہ بیمار بہن سے گلے مل لیں۔

بانوؑ کو اشارہ کیا حضرتؑ نے کہ جاؤ　　اکبرؑ کو بلاؤ علی اصغرؑ کو بھی لاؤ
آئے علی اکبرؑ تو کہا شاہؑ نے آؤ　　روٹھی ہے بہن تم سے گلے اس کو لگاؤ

چلتے ہوئے جی بھر کے ذرا پیار تو کر لو　　لینے انھیں کب آؤ گے اقرار تو کرلو

جب حضرت علی اکبرؑ گھر میں آتے ہیں تو خود بخود بی بی صغریٰؑ کے تمام گلے شکوے دور ہو جاتے ہیں۔

چلاّنے لگی چھاتی پہ منھ رکھ کے وہ دلگیر　　محبوب برادر ترے قربان یہ ہمشیر
صدقے ترے سر پر سے اتارے مجھے کوئی　　بل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی
جلد آن کے بھینا کی خبر لیجیو بھائی　　بے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجیو بھائی

بی بی شہربانوؑ نے بیمار بچی کے یہ الفاظ سنے تو کلیجہ منھ کو آ گیا رو کر فرمانے لگیں

بے کس مری بچی ترا اللہ نگہبان　　صحت ہو تجھے مری دعا ہے یہی ہر آن
کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا　　کنبے کے لیے جان کو کھوتے نہیں بیٹا
میں صدقے گئی بس! نہ کرو گریہ وزاری　　اصغرؑ مرا روتا ہے صدا سن کے تمھاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری　　آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم　　اصغرؑ مری آواز کو پہچان گئے تم

میر انیسؔ کو زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ وہ اس راز سے واقف ہیں کہ کہاں کون سا لفظ موزوں اور مناسب رہے، اس کا استعمال بڑی خوش اسلوبی سے کرتے پھر انہیں یہ سلیقہ بھی تھا کہ کس موقع پر کیا بات کہیں اور کس کردار کی زبان سے کیا بات کہلوائیں۔ پہلی خوبی کو فصاحت اور دوسری کو بی کو بلاغت کہتے ہیں۔ انیسؔ کی جذبات نگاری کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

تم جاتے تو ہو ساتھ بہن جا نہیں سکتی　　تپ ہے تمھیں چھاتی سے بھی لپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی　　رکھ لوں تمھیں اماّں کو بھی سمجھا نہیں سکتی
بے کس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے　　تم ہو سو تمھیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

معصوم نے جس دم یہ سنی درد کی گفتار　　صغریٰؑ کی طرف ہاتھوں کو لٹکا دیا اک بار

لے لے کے بلائیں یہ لگی کہنے وہ بیمار　　جھک جھک کے دکھاتے ہو مجھے آخری دیدار
آخر کوئی دن میں ہے بس اب موت ہماری　　بھیّا نہیں جینے کی میں فرقت میں تمھاری

جب آکے پھر اس جھولے کو آباد کرو گے　　تم بھی مری گودی کو بہت یاد کرو گے

اس طرح فرزند پیمبرؐ سے مدینہ چھوٹ جاتا ہے۔امامؑ چند ماہ مکہ ٹھہرے پھر کربلا کے بیابان میں امام عالی مقام کے چند بھوکے پیاسے حق پرست ساتھیوں اور یزید کی فوجوں میں وہ معرکہ ہوا کہ آج تک انسانیت کو خون کے آنسو بہانے پر مجبور کر رہا ہے۔۱۰ محرم ۶۱ کو امامؑ اور ان کے تمام رفقاء داد شجاعت دیتے ہوئے حق کی راہ میں شہید کر دیئے گئے۔فقط امام حسینؑ کے فرزند امام زین العابدینؑ کو بیماری کی وجہ سے دشمنوں نے قتل نہیں کیا لیکن ان کو زنجیر میں جکڑ دیا گیا ان کے اہل حرم کو لوٹ لیا گیا اور انہیں دیار بہ دیا بے مقنع و چادر پھرایا گیا اور پھر زندان شام میں ایک طویل مدت کے لیے قید کر دیا گیا۔

لیکن بیمار صغریٰؑ کو ان واقعہ کی خبر نہیں ہے اور وہ اب بھی سب کی واپسی کی آس میں ہے ہر وقت سب کو یاد کرتی ہے اس یاد نے اسے بے کسی کا مرقع بنا دیا ہے۔

جینے سے غمِ شاہؑ میں بیزار تھی صغریٰؑ　　تنہائی کی آفت میں گرفتار تھی صغریٰؑ
غش رہتا تھا اس طرح کی بیمار تھی صغریٰؑ　　ہوش آتا تو کرتی یہی گفتار تھی صغریٰؑ
کہتے تو ہیں سب کڑھتی ہو کیوں آئیں گے بابا　　غم یہ ہے کہ جیتا نہ ہمیں پائیں گے بابا

بی بی صغریٰؑ کی اس بیقراری کو دیکھ کر جناب اُم المومنین سلمٰی انہیں ان الفاظ میں تسلی دیتی ہیں

میں زیست بسر کر چکی اب دن ہیں سفر کے　　تم بچی ہو جیتی رہو سائے میں پدر کے

جب اہلِ حرم کا قافلہ طویل عرصے کے بعد مدینے واپس آتا ہے تو شہر میں قیامت کا سا منظر ہوتا ہے۔صغریٰؑ کو خبر نہیں ہے کہ جن کے دیدار کی حسرت میں اب تک جی رہی ہے وہ تو شہید ہو گئے۔ماں اپنی بیٹی کو باپ کے بچھڑنے کی خبر سناتی ہے۔

لے گود میں بانوؑ اسے رو رو کے پکاری　　بابا کہاں میں جس کو دکھاؤں تجھے واری
پردیس میں جنت کو سفر کر گئے شبیرؑ　　اے فاطمہؑ میں رانڈ ہوئی مر گئے شبیرؑ

اس صدمے سے صغریٰؑ اور زیادہ بیمار رہنے لگتے ہیں۔بی بی صغریٰؑ کا انتقال کب ہوا نہ روایت میں اس کا کہیں ذکر ہے اور نہ انیسؔ کے کسی مرثیے میں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا۔غرض میر انیسؔ نے جس انداز میں اپنے مرثیوں میں حضرت فاطمہ صغریٰؑ کا کردار پیش کیا ہے وہ انتہائی پر اثر ہے۔ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ماہر نفسیات ہیں وہ عورت، مرد، بوڑھے، بچے، نیک بد، دوست و دشمن سبھی کی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔سفر کے وقت صغریٰ کی گفتگو، میدان جنگ میں سکینہؑ اور عونؑ و محمدؑ کی بات چیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز پر انیسؔ کی گہری نظر تھی۔

❁❁❁❁

رباعیاتِ انیسؔ: ایک مطالعہ

عذرا انجم

میر انیسؔ (۱۸۷۴ء-۱۸۰۳ء) کی شناخت ان کی مرثیہ گوئی کے حوالے سے مستحکم ہے لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے رباعی گوئی میں بھی ناموری حاصل کی ہے۔ انھوں نے اپنی رباعیات میں انسان دوستی، اخلاقیات، اظہار ذات، مذہبیات اور فلسفہ زندگی جیسے موضوعات کو بڑی فنکاری کے ساتھ برتا ہے۔ دنیا میں پیش آنے والے مسائل اور خوشی وغم کے لمحات کی مرقع کشی بھی بڑی کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ مغربی مفکر کروچے کا کہنا ہے کہ "شاعر اگر اپنی بات کو خوبصورت انداز میں بیان کرے تو کامیاب ہے اور بدصورت انداز میں بیان کرے تو ناکام"۔ میر انیسؔ کی رباعی گوئی اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے مرثیے کی طرح ہی اپنی رباعیوں میں بھی بہت ہی خوبصورت اور دلکش زبان واسلوب کا استعمال کیا ہے۔ روزمرہ پر تو انیسؔ کو دسترس حاصل تھا ہی۔ اس کی وجہ سے ان کی رباعیوں کا حسن مزید دوبالا ہو گیا ہے۔ رباعی کا عروج دراصل اُردو مرثیے کے ارتقاء سے وابستہ ہے۔ مرثیہ خوانی سے پہلے پیش خوانی کے طور پر رباعی وسلام پڑھے جاتے تھے۔ اس طرح اس صنف کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی جو انیسؔ و دبیرؔ اور دوسرے مرثیہ نگاروں کی مرہون منت ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ سے پہلے بھی رباعی گوئی کا ثبوت ملتا ہے اور کلیات میر اور دیوان خواجہ میر درد میں بہترین رباعیات کے نمونے ہمیں ملتے ہیں لیکن انیسؔ و دبیرؔ کے دور میں جس طرح رباعی کا فروغ ہوا، وہ یقیناً حیرت انگیز ہے۔ یہ اطمینان بخش ہے کہ آگے چل کر انیسؔ کے عہد کا خاتمہ ہو گیا لیکن رباعی کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ حالی کی کامیاب رباعیوں کے بعد بیسویں صدی میں جوشؔ ملیح آبادی، یگانہ چنگیزی، امجدؔ حیدر آبادی، فراقؔ گورکھپوری اور جذبؔ عالمپوری وغیرہ نے اردو رباعیات کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی اپنے مضمون "مرزا دبیرؔ اور دیارِ نجف" میں لکھتے ہیں:

> "یہ زمانے کی ستم ظریفی نہیں تو کیا کہیں کہ دبیرؔ کی رباعیات سے عوام تو ایک طرف خواص بھی ناواقف ہیں۔ مرزا دبیرؔ اُردو کے وہ تنہا ممتاز شاعر ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ یعنی چودہ سو رباعیات کہی ہیں۔ دوسرا بڑا شاعر جس نے سب سے زیادہ رباعیات کہی ہیں وہ میر انیسؔ ہیں جن کی رباعیات کی تعداد ۵۸۶ سے اوپر ہے۔ رباعی کی صنف گراں اُردو ادب میں خال خال ہے۔ اُردو کے مشاہیر نے بہت کم رباعیات کہیں۔ ہماری تحقیق کے مطابق محمد قلی قطب شاہ نے ۳۹، سراج اورنگ آبادی نے ۹، ولی دکنی نے ۶، میر تقی میرؔ نے ۱۲۵، فغاںؔ نے ۱۱، نظیر اکبر آبادی نے ۲۳، خواجہ دردؔ نے ۳۲، سوداؔ نے ۸۰ مصحفیؔ نے ۱۶۴، مومنؔ نے ۱۲۹، غالبؔ نے ۱۶، ذوقؔ نے ۱۷، ناسخؔ نے ۶۴، میر عشقؔ نے ۱۹۰، امیر مینائی نے ۳۰، امیر لکھنوی نے ۱۲، منیرؔ شکوہ آبادی نے ۸۰، داغؔ نے ۴۱، حالیؔ نے ۱۲۵، شادؔ عظیم آبادی نے ۴۰۰، فراقؔ گورکھپوری نے ۳۵۱، جوشؔ نے ۳۱۵، اثرؔ لکھنوی نے ۲۰۰، جگت موہن لال رواںؔ نے ۱۷۵ اور تلوک چند محرومؔ نے ۲۲۵ رباعیات لکھیں۔"

(روزنامہ سیاست مورخہ ۸ مارچ ۲۰۰۴، حیدرآباد)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انیسؔ و دبیرؔ کی ریاضت کام آئی اور ان کے دور کے بعد رباعی گوئی کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ رباعی کی اس مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان اساتذۂ سخن نے رباعی میں ضرب الامثال کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے اور رباعی اگر استادانہ ہو تو ضرب المثل بننے کے امکانات کافی رکھتی ہے اور اس سے رباعی کا تاثر بھی دیرپا ہو جاتا ہے۔ میر انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ ان کی رباعیات میں اس نوع کے ضرب الامثال بکثرت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی　　ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا　　جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

زیست اور شباب یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جو ہر ذی روح کو ملتی ہیں۔ میر انیسؔ نے انسان کی جوانی کی بے ثباتی اور بڑھاپے کی یقینی کو اس قدر خوبصورت اور دلچسپ انداز میں نظم کیا ہے کہ وہ کامیاب ضرب المثل بن گیا ہے۔ "جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی"۔ ایک اور رباعی ملاحظہ ہو جس میں میر انیسؔ نے عزت و انکسار کے باہمی رشتے کو اس حسین پیرائے میں بیان کیا ہے کہ وہ لوگوں کی زبان پر آج تک جاری ہے۔ وہ کہتے ہیں:

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے　　وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی　　جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

آخری مصرعے کی قوتِ ترسیل سے قاری بآسانی محظوظ ہو سکتا ہے۔ شاعر ہنرمندوں اور بارتبہ انسانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ جسے رتبہ دیتا ہے وہ جگہ جگہ اپنی جھوٹی تعریفیں کرتے نہیں پھرتا اور اپنے منھ میاں مٹھو نہیں بنتا بلکہ اس کے بجائے فروتنی کا شیوہ اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو زمانے میں اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے، وہی اپنے منھ میاں مٹھو بنے پھرتے ہیں۔ اس بات کو کتنی خوبصورتی سے شاعر نے ادا کیا "جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے"۔ ان کا یہ انداز اس قدر لوگوں کو بھایا کہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ انسان کی نبض شناسی کی یہی معرفت انیسؔ کے اندر تنقیدی شعور بیدار کر گئی۔ ان کا تنقیدی شعور کتنا بیدار اور بالیدہ تھا، یہ مصرع اس کی ایک مثال ہے۔ ان کا یہ تنقیدی شعور ان کی پوری رباعیات میں بھی رچ بس گیا ہے اور ان کے کلام کو آفاقیت بخشتا ہے۔ فارسی، ہندی اور اردو شاعری کے بہت سے موضوعات انیسؔ کے یہاں رباعیوں کی صورت میں ملتے ہیں۔ اسی طرح فارسی مقولوں اور ضرب الامثال کو بھی انھوں نے اپنی رباعیوں میں جگہ دی ہے۔ مثلاً

ٹھوکر بھی نہ ماریں گے اگر خود سر ہے　　زردار کو بھی فروتنی بہتر ہے
ہے میوۂ نخل قد انساں تسلیم　　جھکتی ہے وہی شاخ جو بار آور ہے

کرشن نے ارجن سے کہا تھا کہ "سویم کو ہری ٹہنی کے سمان لوچدار بناؤ"، پھل دار درخت جھکا رہتا ہے، سوکھے درخت میں نہ تو پھل لگتے ہیں نہ لوچ ہوتی ہے، وہ تو اکڑ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔" اس مضمون کو میر انیسؔ نے درج بالا رباعی میں کس خوبی سے پیش کیا ہے۔ اسی مضمون کو درج ذیل رباعی میں بھی ایک الگ انداز میں باندھا ہے:

سر کھینچ نہ شمشیر کشیدہ کی طرح　　ہر ایک سے جھک قوس خمیدہ کی طرح
منظور نظر ہے جو حفاظت اپنی　　ہو گوشہ نشیں مردم دیدہ کی طرح

میر انیسؔ کہہ رہے ہیں کہ اپنے آپ کو کشیدہ شمشیر کی طرح سخت نہ بناؤ بلکہ ہر ایک سے جھک کر ملو اگر اپنی حفاظت منظور ہے تو اسی طرح رہو جس طرح مردمِ دیدہ یعنی آنکھوں میں پتلی رہتی ہے اسی طرح گوشہ نشین رہو۔ دونوں رباعیوں میں زبان کی چاشنی اور اس کے فنکارانہ استعمال سے قاری بخوبی محظوظ ہو رہا ہوگا۔ یہاں مردمِ دیدہ کی ترکیب نے بطور خاص توجہ حاصل کی ہے۔ سید محمد عباسی نے ''مجموعہ رباعیاتِ انیسؔ'' میں انیسؔ کی رباعیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(الف) مذہبیات جن میں حمد، نعت، منقبت، معتقدات اور مراثی شامل ہیں

(ب) اخلاقیات

(ج) ذاتیات

میر انیسؔ نے تقریباً ۶۰۰ رباعیاں کہی ہیں۔ قرآنی احکام اور اسلامی تعلیمات پر ان کی گہری نظر تھی اور زبان پر پکڑ بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی رباعیات میں ان تعلیمات کو منظوم پیرائے میں بیان کرنے میں کامیابی پائی ہے۔ بقول علامہ شبلیؔ نعمانی:

> ''صوفیانہ اور اخلاقی مضامین کے اظہار کے لیے سب سے زیادہ موزوں چیز رباعی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جن شعرا مثلاً خیامؔ، سحابیؔ، سلطان ابوسعیدؔ ابوالخیر نے ان مضامین کو اپنا موضوع شاعری قرار دیا تھا، اُنھوں نے رباعی کے سوا تمام عمر میں اور کچھ نہ لکھا۔ اُردو شاعری میں چونکہ یہ مضامین بہت کم ادا کیے گئے، اس لیے رباعیاں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ سوداؔ نے البتہ نہایت کثرت سے رباعیاں لکھیں، لیکن اکثر عشقیہ یا خیال آفرینی کی غرض سے لکھی ہیں۔ میر انیسؔ کی رباعیوں کا ایک بڑا دفتر ہے اور ہر رباعی میں کوئی نہ کوئی اخلاقی مضمون ادا کیا گیا ہے۔''

(موازنہ انیسؔ و دبیرؔ از علامہ شبلیؔ نعمانی اشاعت ۱۹۶۹، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۲۳۶)

شبلیؔ کے اس قول سے واضح ہے کہ انیسؔ کی ہر رباعی میں کسی نہ کسی اخلاقی پہلو کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ شبلیؔ نے اس ضمن میں جن رباعیات کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے، ان میں سے ایک درج ذیل ہے:

اب خواب سے چونک ، وقتِ بیداری ہے　　لے زادِ سفر ، کوچ کی تیاری ہے
مر مر کے پہنچتے ہیں مسافر واں تک　　یہ قبر کی منزل بھی عجب بھاری ہے

اجل ایک ایسی حقیقت ہے جس سے دنیا کے کسی بھی انسان کو مفر نہیں۔ ہر ایک کو اس سے دو چار ہونا ہی پڑتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میر انیسؔ نے کہا ہے کہ اے انسان! خواب سے چونک کہ بیداری کا وقت ہے اور دنیا سے آخرت کی طرف سفر کی تیاری کر۔ آخرت کی تیاری میں لگ جا کہ انسان اپنی زندگی کے تمام مراحل کو طے کرتے ہوئے آخر میں یہیں پہنچتا ہے اور پھر اس کے اعمال کا حساب ہوتا ہے۔ اس سے خبردار کرتے ہوئے کتنی خوبصورتی سے شاعر نے کہہ دیا کہ قبر کی منزل نہایت ہی بھاری ہے۔ آخرت کے تصور کی پیشکش

نے بھی رباعی کی خوبصورتی میں اضافہ کیا ہے۔ انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ لحد، آخرت، دنیا کی بے ثباتی، انسان کی غفلت، عقبیٰ کی طلب گاری یہ مضامین انیس الگ الگ ڈھنگ سے باندھتے ہیں۔ اسی مضمون کو دیکھیے انھوں نے درج ذیل رباعیوں میں کس نئے ڈھنگ سے پیش کیا ہے:

غفلت میں نہ کھو عمر کہ پچھتائے گا　　رونا ہی غمِ شاہؑ میں کام آئے گا
اسباب تعلق سے نہ بھر دل اپنا　　چلتے ہوئے سب کچھ یہیں رہ جائے گا

جس شخص کو عقبیٰ کی طلب گاری ہے　　دنیا سے ہمیشہ اُسے بے زاری ہے
اک آنکھ میں کس طرح سمائیں دونوں　　غافل یہ خواب ہے ، وہ بیداری ہے

ان رباعیات میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ میر انیسؔ کا پیغام کس قدر واضح ہے۔ وہ دنیا کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اے انسان! آنکھیں کھول، بیدار ہوجا۔ جب تو اس دنیا سے کوچ کرے گا تو تمام دنیاوی مال واسباب یہیں رہ جائیں گے اور تو اپنے ساتھ کچھ نہیں لے جاسکے گا۔ ہاں! تیری عبادات اور تیرے اعمال تیرے ساتھ رہیں گے تو ضروری ہے کہ بس انہیں پر دھیان دے اور باقی سب کچھ بھول جا۔ شاعر نے اس قدر دلنشین انداز میں ان مضامین کو برتا ہے کہ دامن دل کھنچتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ انسان کی تعمیر، اس کی ذہانت، اس کی اشرف المخلوقیت اور اس کے بلند درجات کے موضوعات کو بھی شاعر نے اپنی رباعیات کا حصہ بنایا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

آدمؑ کو عجب خدا نے رتبہ بخشا　　ادنیٰ کے لیے مقام اعلیٰ بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایماں　　اس ایک کف خاک کو کیا کیا بخشا

ایک مشت مٹی سے بنے انسان کی عظمت کو اتنی آسان زبان میں سمجھایا ہے کہ شعر سہل ممتنع کے درجے میں داخل ہوگیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے انسان کو ایک الگ ہی مرتبہ بخشا ہے۔ اس نے مٹی کے انسان کو اعلی مقام دیا۔ اس کو ہنر، تمیز، جان اور ایمان جیسی صفات سے نوازا اور تمام مشکلیں اس پر آسان فرمادیں۔ یہ اللہ کی قدرت ہے اور انسان کی فضیلت کہ ایک مشت خاکی کو اشرف المخلوقات کا درجہ ملا۔ اسی طرح انسانی صفات اور اس کی کمزوریوں کا احاطہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہموار ہے گر ، تو تجھ کو کچھ باک نہیں　　سرکش ہے اگر ، تو عقل و ادراک نہیں
پاتا نہیں تند خو ، کدورت کے سوا　　دامن میں ہوا کے کچھ بہ جز خاک نہیں

عقل و ادراک کے لیے سرکشی سے اجتناب کو ضروری صفت قرار دے کر شاعر انسانوں کو یہ نصیحت کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ اگر تمھارے مزاج میں ہمواری ہے اور تمھارے لب و لہجے میں موافقت موجود ہے تو تمھیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر تمھارے مزاج میں سرکشی ہے تو بے شک تمھارے ادراک اور تمھاری عقل میں کمی ہے۔ تند مزاج انسان جو بات بات پر غصہ ہوجاتا ہے اور اپنے جذبات پر قابو نہیں کر پاتا وہ ہمیشہ برائی میں ہی مبتلا رہتا ہے۔ حکمت کی ان باتوں کو شاعر نے جتنی ہنرمندی سے بیان کیا ہے، اتنی ہی انسانی یادداشت پر عدم بوجھ کا حامل بھی ہے۔ یہ آسانی سے حافظے کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اخلاقی قدروں کی تخم ریزی کے ساتھ ساتھ میر انیسؔ نے اللہ، رسول، آلِ رسولؐ (اہلِ بیتؑ) کی محبت اور محرم و نوروز پر بھی بے شمار رباعیات کہی ہیں۔ انیسؔ کی رباعیاں اثنا عشریہ کے عالمی تصور کی ترجمانی کرتی

ہوئی نظر آتی ہیں۔مثال کے طور پر "نوروز" کے حوالے سے بات کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

اب وقت سرور و فرحت اندوزی ہے　　ہر دل مصروف جشن نو روزی ہے
ہے آج سے دور شاہی شاہِ نجف　　یہ رنگ بہار فتح و فیروزی ہے

اہلِ فارس "نوروز" کے نام سے ۲۰/۲۱ مارچ کو ہر سال ایک عید مناتے ہیں۔نوروز کا عالمی تصور یہ ہے کہ اس دن ماہتاب کے آفتاب کے مقابل ٹھہراؤ میں تبدیلی آتی ہے۔ زمین برجِ حمل میں داخل ہوتی ہے اور نوروز وجود میں آتا ہے۔ ایران، افغانستان، البانیہ، آذربائیجان، بنگلہ دیش، بوسنیا، چین، جارجیا، ہندوستان، اسرائیل، عراق، قزاقستان، کرغستان، پاکستان، روس، شام، تاجکستان، ترکی، ترکمانستان، یوکرین، ازبکستان جیسے ممالک میں "نوروز" بڑی دھوم سے منایا جاتا ہے جس کی طرف اشارہ کر کے میر انیسؔ نے شاہ نجف کو یاد کیا۔صرف شاہِ نجف کو یاد نہیں کیا بلکہ چوتھے خلیفہ مولیٰ علی کی شان میں دل کھول کر اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے۔رباعی ملاحظہ کیجئے:

الفت ہو جسے اسے ولی کہتے ہیں　　ایسوں کو سعیدِ ازلی کہتے ہیں
اس بزم میں دھوپ اٹھا کے آتے ہیں جو لوگ　　ہنس کر طوبیٰ لکم علیؑ کہتے ہیں

میر انیسؔ نے مشکل کشا کی مدح میں اور بھی رباعیاں کہی ہیں۔دیکھیے یہ رباعی کس قدر خوبصورت پیرائے میں کہی ہے:

بیزار علیؑ کو مال و زر سے پایا　　طاعت ہی میں شام سے سحر تک پایا
اللہ نے دی تیغ ، نبیؐ نے دختر　　رتبہ یہ ادھر سے ادھر سے وہ پایا

حضرت علیؑ مرتضیٰ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے میر انیسؔ نے جس طرح کی مضمون آفرینی سے کام لیا ہے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک اخاذ ذہن کے مالک تھے اور چیزوں کو اور اس کی خصلتوں کو باہم جوڑنے پر قادر تھے۔وجہ اشتراک تلاش کرنے کی اس سے عمدہ سے مثال نہیں مل سکتی۔وہ کہتے ہیں کہ مولا علیؑ کو مال و دولت کی کوئی ہوس نہیں تھی۔ان کے شب و روز عبادت اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں گذرتے تھے۔ان کی یہ ادا اتنی پسندیدہ قرار پائی اور ان کا رتبہ اتنا بلند ہوا کہ خدا نے ان کو تلوار دے دی تو نبی نے دختر۔کیا ہی خوبصورت وجہ اشتراک تلاش کیا ہے شاعر نے۔اس وجہ اشتراک کی تلاش پر ہی ان کو بطور خاص داد دی جانی چاہیئے۔بی بی فاطمہ زہراؑ اور حضرت علیؑ مرتضیٰ کے صاحبزادے اور پیارے نبیؐ کے نواسے امام حسینؑ کی شان میں کہی گئی یہ رباعی بھی نہایت پُرمعنی و پُرلطف ہے:

کیا مرتبہ سلطان حجازی کا ہے　　کیا عزّ و شرف امامؑ غازی کا ہے
سجدے کا نشاں دیکھ کے سب کہتے ہیں　　نیزے پر یہ سر کسی نمازی کا ہے

شہادتِ عظمیٰ کی فتح مبین کو انیسؔ نے کس فصاحت و بلاغت سے اس رباعی میں نظم کیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جیسے دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہو۔غمِ حسین پر میر انیسؔ کی دل سوز رباعیاں اور بھی ہیں۔نمونے کے طور پر ان میں سے ایک رباعی درج کی جاتی ہے:

شبیرؑ کا غم یہ جس کے دل پر ہوگا　　آنسو جو گرے گا شکلِ گوہر ہوگا
پوچھے گا خدا جب ایسے در کی قیمت　　تب حشر میں جوہری پیمبر ہوگا

اسی طرح امام سجاد کے لیے وہ کہتے ہیں:

تھے زیست سے اپنی ہاتھ دھوئے سجادؑ　　شب کو کبھی راحت سے نہ سوئے سجادؑ
جب تک جیے ہنستے نہ کسی نے دیکھا　　چالیس برس باپ کو روئے سجادؑ

میر انیسؔ کی رباعیات میں معرفت، عشقِ الٰہی اور صوفیانہ مضامین بھی کثرت سے شامل ہیں۔ ان کے مزاج میں صوفیانہ پن تھا تو انھوں نے اللہ کی محبت میں بے شمار ایسی رباعیاں کہی ہیں، جسے پڑھنے سے دل کو ایک طرح کا سکون میسر آتا ہے اور تزکیہ نفس کو جلا ملتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے دل پاکیزگی اور طہارت کی طرف رجوع ہو رہا ہے۔ خدا کی محبت سے بہتر دنیا میں کوئی محبت نہیں۔ جو سکون نماز میں ہے وہ کہیں نہیں۔ انیسؔ نے بھی اللہ سے لو لگائی تھی۔ اس لیے وہ کہتے ہیں:

راہی طرفِ عالم بالا ہوں میں　　دنیا سے عدم کو جانے والا ہوں میں
یارب ترا نام پاک جپنے کے لیے　　گویا اک ہڈیوں کی مالا ہوں میں

تپلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو　　آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
قربت رگ جاں سے اور پھر اس پر یہ بعد　　اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

ممکن نہیں عبد سے عبادت تیری　　خلق و کرم و عطا ہے عادت تیری
صحرا صحرا ہیں گو کہ عصیان میرے　　دریا دریا مگر ہے رحمت تیری

گوہر کو صدف میں آبرو دیتا ہے　　بندے کو بغیر جستجو دیتا ہے
انسان کو رزق گل کو بو سنگ کو لعل　　جو کچھ دیتا ہے جس کو تو دیتا ہے

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے　　بلبل کی زبان پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا　　جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

ان رباعیات میں شاعر نے اللہ کی وحدانیت کے بیان کے ساتھ ساتھ اس سے اپنی عقیدت، اپنی محبت اور ان کی جلوہ کاریوں کو موضوع سخن بنا کر بڑی کامیابی کے ساتھ نوع انسانی تک اللہ کا پیغام پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ایسی مثالوں کو زیر بحث لایا ہے جس سے خود انسان کا دماغ بھی کھلتا چلا جاتا ہے۔ "انسان کو رزق، گل کو بو، اور سنگ کو لعل" عطا کرنے کی بات کہہ کر انسان کو رزق کی تنگی کے احساس کا شکار ہونے سے بچنے کی تلقین کر دی ہے اور وہ بھی اتنے غیر محسوس طریقے سے کہ انسان بات کی تہہ کو سمجھ بھی جاتا ہے اور اسے ایسا بھی نہیں لگتا کہ کوئی نرا واعظ اس کے سامنے وعظ و نصیحت کے دفتر کھول کر بیٹھا ہوا ہے۔

میر انیسؔ کی رباعیوں میں خود کلامی کی فضا بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی اثر پذیری کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ خارجی حقائق کو کسی نہ کسی لحاظ

سے داخلی بنا لیتے ہیں۔موضوعات کی مناسبت سے لفظیات کا استعمال کرتے ہیں اور اپنی رباعیوں میں لہجے کی ہمواری اور خیال کی سبک روی سے قاری کو اپنی طرف راغب کر لیتے ہیں۔انیسؔ کے اس انداز بیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

> ''وہ ایک لمحے کے لیے بھی اخلاقی مقصد و اقدار کا دامن چھوڑنے کے روادار نہیں ہیں۔اس کے لیے وہ دل سے دل تک منتقل کرنے والے لہجے کو ترجیح دیتے ہیں اور دعوت و موعظت کے عامیانہ رویّے سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔تہذیب و توازن کا مسلسل عمل ان کی رباعیوں، سلاموں اور مرثیوں میں یکساں طور سے جاری و ساری نظر آتا ہے۔توازن و تہذیب کی یہی مسلسل تلاش بکھری ہوئی کثرتِ مضامین میں وحدت تاثر کا رنگ بھی اختیار کرتی ہے اور ان کے الفاظ کو ایک کھنک اور نئی چمک دمک بھی عطا کرتی ہے۔''

(رباعیاتِ انیسؔ از علی جواد زیدی، اشاعت ۱۹۸۵، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص ۵۷)

علی جواد زیدی نے میر انیسؔ کی زبان و بیان کی خوبیوں کا جن الفاظ میں اعتراف کیا ہے، تقریباً ان ہی الفاظ میں ان کی رباعیوں کی خوبیوں اور ان کے مضامین کے تنوع پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عسکری صفدر اپنی کتاب ''جائزۂ انیسؔ'' میں لکھا ہے کہ:

> ''میر انیسؔ کی رباعیات میں حزنیہ مضامین، فلسفیانہ اور فکری موضوعات کے علاوہ اخلاقی اور عام مضامین مثلاً موت و حیات، دنیا کی بے ثباتی فقر و قناعت اور انکساری وغیرہ بھی ملتے ہیں جنھیں انھوں نے اپنے شاعرانہ حسن بیان سے انتہائی پر اثر اور دلکش بنا دیا ہے۔ان کی اہمیت موضوع یا مضمون کی جدت سے بڑھ کر حسن بیان، ندرت اور تخیل کی تازگی کی وجہ سے ہے۔رباعیات میں اخلاقی عنصر نہایت جاندار اور بلند آہنگ رہتا ہے۔انیسؔ کا عقیدہ جو اُن کے فلسفہ حیات کا سرچشمہ ہے۔توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت کو اصول دین اور نماز، روزہ، حج، زکوۃ، جہاد اور نفس کو فروع دین ماننا ہے۔رباعیات میں توحید کو جو اسلام کی اساس ہے، نمایاں اہمیت دی گئی ہے۔''

(جائزہ انیس از ڈاکٹر عسکری صفدر، اشاعت ۲۰۰۹ء، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ص ۱۱۹)

علی جواد زیدی اور ڈاکٹر عسکری صفدر کے ان اقتباسات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ میر انیسؔ نے اپنی رباعیات میں ایسے موضوعات کو پیش کیا ہے جو انسان کی ذات سے سروکار رکھتے ہیں اور موضوعات کو برتنے کے انداز نے ان کے بیان کو دلچسپ اور پُرمزہ بنا دیا ہے۔نصیحت آمیز ہونے کے باوجود ان کی رباعیاں قاری پر گراں نہیں گزرتیں بلکہ وہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔اس لیے انھیں بجا طور پر دبستان لکھنؤ کے نمائندہ رباعی گو شعراء میں شمار کیا گیا ہے۔

❁❁❁❁

میر انیسؔ کربلائیات کے ناشر

سید مشاہد عالم رضوی

عظیم شعراء وادبا سے مملو رہی ہے جنھوں نے اردو زبان وادب کے گیسو سنوارے ہیں اور اپنے اچھوتے نظمیہ کلام سے فصاحت وبلاغت کے اونچے آسمان تک اسے پہنچانے میں کامیاب مدد رسانی کی ہے اور دامن اردو کو ہر صنف سخن سے مالا مال کر کے اسے دنیا کی قدیم زبانوں کے ہم پلہ بنانے کی سعی وکوشش میں کوئی کمی نہیں رکھی الفاظ ومعانی کے سمندر سے اسے ہمکنار کیا ہے اور نہایت مختصر سے عرصہ میں اسے زبان کے دائرہ سے ارتقاد یکر نفیس وشائستہ تہذیب وتمدن کا درجہ عطا کیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ زبان اپنی نمکنیت کی وجہ سے اسقدر آگے بڑھی کہ برصغیر کے جغرافیائی حدود سے باہر نکل گی اور بوجہ اپنی لسانی خصوصیات کے ہر دلعزیز بنتی گی۔

مدت عمر کم صحیح مگر صحت زبان وبیان ولہجہ کی کشش نے سخنوروں اور زبان وادب کے شناساؤں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور انہیں اپنا قاری بنالیا۔

چنانچہ اس میں عربی کی ھنک ہے تو فارسی کی میٹھاس بھی ہندی کی لے ہے تو ترکی زبان کا چربہ بھی۔ مگر ہے یہ اردو اس لیے کہ نقطہ آغاز سے ہی اسے عروج نصیب ہوتا چلا آیا اور اس کے قالب میں جو لفظ بھی ڈھلا وہ اردو بنا اور دامنِ اردو نظم ونثر کی موسیقیت سے بھرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ شعر وسخن کی معرکہ آرائی میں یہ ایک ایسی منزل پر پہنچ گئی جہاں اپنی پیشرو زبان فارسی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ اس مقام پر قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ آخر کس زاویہ نظر سے یہ بات درست ہے؟ تو یہاں ذرا سی توجہ درکار ہے۔ وہ ہے رثائی ادب یا کہیے عزائی ادب جس میں اُردو نے فارسی سے سبقت حاصل کی ہے۔ کیونکہ اردو کی قدیم ترین شاعر فارسی سمجھے جاتے ہیں ان کے یہاں رثائیت کی ایسی مثالیں نہیں جس سے فارسی ادب کو غنی قرار دیا جائے یا ابوالقاسم فردوسیؔ کے شاہنامہ میں خال خال کچھ مثالیں مل تو جائیں مگر اس سے مدعا پورا نہیں ہوتا اور باقی شعراء فارسی مراثی سے ہٹ کر دیگر اصناف سخن کے شہسوار سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ شرف محض اردو زبان وادب کو ہی حاصل ہے جس میں تمام تر اصناف سخن کا اندراج ہے۔ مثلاً امیر خسروؔ وولیؔ دکنی میر تقی میرؔ، غالبؔ واقبالؔ وغیرہ وغیرہ۔ کی طبع آزمائی کے بعد اردو زبان میر ببر علی انیسؔ کے مرثیوں کی شمولیت کے بعد ہی اپنے حد نصاب کو پہنچتی ہے وہ بھی اس طرز بیاں سے کہ

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں　　پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

چنانچہ میر انیسؔ اعلیٰ اللہ مقامہ نے مرثیہ نگاری میں طبع آزمائی فرما کر اردو کی زمین کو آسمان بنادیا

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر　　مگر ہم نے پلہ گراں کردیا
میری قدر کر اے زمینِ سخن　　تجھے بات میں آسماں کردیا

اور مزید برآں انہوں نے کربلا کو موضوع سخن قرار دیکر اردو کو آفاقی بنادیا یہاں تک کہ سماج ومعاشرے کی ہر فرد کو اس زبان سے جوڑ دیا ہے جو اپنے آپ میں ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ انیسؔ صاحب کو ایک ہی مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا ہنر آتا ہے۔

فرماتے ہیں۔

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ باندھوں　　اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

سچائی تو یہی ہے کہ میر انیسؔ مرحوم نے اپنی خداداد شعری لیاقت اور قوت ادراک وقوت تخئیل کے فیض سے کربلا کے لازوال کرداروں کو جو صنف مرثیہ میں ڈھالا تو اردو زبان میں بلا کا نکھار پیدا ہو گیا اور وہ بحق خدائے سخن کہلائے۔

بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ کربلا کے حقیقی ولازوال تذکرے نے انہیں زندہ کر دیا چنانچہ اگر وہ اپنے اشعار میں کسی اور چیز کو موضوع بناتے تو یہ جاودانی انھیں نصیب نہ ہوتی جو آج انھیں نصیب ہوئی ہے، خواجہ الطاف حسین حالی کی یہ رباعی لطف سے خالی نہیں ہے۔

اردو گو راج چار سو تیرا ہے　　شہروں میں رواج کو بہ کو تیرا ہے
پر جب تک انیسؔ کا سحر ہے باقی　　تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

البتہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ مرزا دبیرؔ اعلی اللہ مقامہ کو نظر انداز کیا جا رہا ہے ہرگز نہیں بلکہ اس نقطہ نظر سے ان کا حصہ محفوظ ہے اور ان کا مقام ومرتبہ جداگانہ ہے کہ ہر پھول کی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ نمونے کے طور پر ان کے مرثیہ کے چند بند ملاحظہ فرمائیں۔

تلف ہوئی جو شہؑ خوش خصال کی دولت　　عدو نے لوٹ لی اٹھارہ سال کی دولت
تباہ کی نبیؐ ذوالجلال کی دولت　　ملادی خاک میں زہراؑ کے لال کی دولت
نہ جان تن میں نہ بینائی چشم تر میں رہی　　کہ اب رسولؐ کی تصویر بھی نہ گھر میں رہی

وہ شمع گل ہوئی جس سے کہ نام روشن تھا　　نبیؐ کی آلؑ کا گھر صبح و شام روشن تھا
دلِ حسین علیہ السلام روشن تھا　　مدینہ کیا کہ زمانہ تمام روشن تھا
نصیب بانوؑ کے دل کو جگر کا داغ ہوا　　پکارتی تھی کہ ٹھنڈا میرا مزار ہوا

(بحوالہ نیا دور میر انیس نمبر سن ۲۱۶ ء ص ۳۹۳۸)

میر انیسؔ ہوں یا مرزا دبیرؔ دونوں کا مشترکہ سرمایہ مرثیہ گوئی اور ذکر ومدحِ آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم تھا اور اس بات پر انہیں فخر بھی تھا۔

انیسؔ صاحب کی یہ رباعی ملاحظہ فرمائیں

بالیدہ ہوں وہ اوج مجھے آج ملا　　ظلِ علمِ صاحبِ معراج ملا
منبر پر نشست سر پہ حضرتؑ کا علم　　اب چاہئے کیا ؟ تخت ملا تاج ملا

انیس صاحب نے مرثیہ نگاری کر کے اردو ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ بقول مرحوم حسن عباس فطرت۔۔۔ انیسؔ نے مرثیہ نگاری کے جاہ وجلال سے اردو ادب کو معراج کی منزل تک پہنچا دیا اور مرثیہ نے غزل کو مات دے دی اور غزل سے بہتر نظم نگاری مانی جانے لگی۔

انیسؔ صاحب اس سلسلے میں فرماتے ہیں

روز مرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی　　لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی　　یعنی موقع ہو جہاں جسکا عبارت ہو وہی

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہوئے　　مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہوئے

یہ وہ عناصر ہیں جو انیسؔ صاحب کے نزدیک مرثیوں میں مدنظر ہیں اور آپ ہر کردار کو اس کے لوازمات وتمام تر نزاکتوں کے ساتھ خوب خوب برتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بند جس میں حضرت امام حسینؑ نہرِ فرات پر خیمہ نصب کرنا چاہتے ہیں اور اشقیا آپ سے جھگڑنے کو تیار ہیں

آغوش میں پھوپھی کے سکینہؑ دہل گئی　　غل پڑ گیا کہ گھاٹ پر تلوار چل گئی

محمل سے منھ نکال کے فضہؑ نے یہ کہا　　بلوہ کنارے نہر ہے اے بنتِ مرتضیٰؑ

نیزے بڑھا بڑھا کر ہٹاتے ہیں اشقیا　　قبضے میں ہاتھ رکھے ہیں عباسؑ باوفا

کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو　　سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

لڑائی کے ماحول میں بچی کا پریشان ہونا پھر ایک کنیز کا محمل سے جھانک کر سیدانی کو خبردار کرنا تصنع سے دور فطری امور ہیں اور شہزادی کا نام زبان پر لائے بغیر تنہا بنتِ مرتضیٰؑ کہہ کر پکارنا خاندانی تہذیب وشرافت کا لحاظ بھی ہے جو شاعر کو باکمال بناتا ہے۔

اسی طرح خاندان عصمت وطہارت کی عظمتوں کو مدنظر رکھ کر بڑے محتاط انداز میں بھائی امام حسین علیہ السلام کے قتل کے ہنگام کو سامنے رکھ کر شہزادی زینب کے کرب واضطراب کو ایک جگہ نظم کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ڈھانپ کر ہاتھوں سے یہ بنتِ علیؑ چلائی　　ذبح ہوتے ہو میرے سامنے ہے ہے بھائی

ضرب اول تھی کہ تکبیر کی آواز آئی　　گر پڑی خاک پر غش کھا کے علیؑ کی جائی

آنکھ کھولی تھی کہ ہنگامہ محشر دیکھا　　سر اٹھایا تو سرِ شہؑ کو سنا پر دیکھا

اسی طرح ایک اور مقام پر حضرتِ عباسؑ علمدار کے پیاسے گھوڑے کا حال نظم کرتے ہوئے ایک جانور کے نفسیات کو قلمبند کر کے اپنے کمال کا لوہا منوایا ہے۔

دو دن سے بے زباں پہ تھا جو آب و دانہ بند　　دریا کو ہنہنانے لگا دیکھ کر سمند

ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند　　چمکارتے تھے حضرتِ عباسؑ ارجمند

تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا　　گردن پھرا کے دیکھتا تھا منھ سوار کا

انیسؔ صاحب کی خوبی یہ ہی کہ وہ ہر کردار کو اس کے فطری دھارے میں رکھ کر اسے روانی دیتے ہیں اور اس کے تمام تر گوشوں اور پہلوؤں کو نقل کرنے میں مہارت رکھتے ہیں جیسا کہ آپ نے اوپر کے بند میں ملاحظہ فرمایا جبکہ ایسی مثالیں آپ کے کلام میں جابجا نظر آئیں گی چنانچہ ہم یہاں اختصار کے مدنظر انھیں نظرانداز کرنے پر مجبور ہیں اب ذرا بیٹے کی جدائی پر ضعیف باپ کے تاثرات بھی دیکھیں

جب نوجواں پسر شہؑ دیں سے جدا ہوا　　روشن قمر سپہر بریں سے جدا ہوا

نور نظر امامؑ مبیں سے جدا ہوا　　لختِ جگر حسینؑ حزیں سے جدا ہوا

دل داغ ہوگیا دل و جانِ بتولؑ کا　　گھر بے چراغ ہوگیا سبطِ رسولؐ کا

پیری میں آفتِ غمِ اولاد الآماں　　دل اور زخم خنجر بے داد الآماں

وہ اضطرابِ خاطرِ ناشاد الآماں　　وہ اشک و شور اور وہ فریاد الاماں
بیٹا نہ ہو تو زیست کا پھر کیا مزا رہا　　جب گھر اجڑ گیا تو زمانہ میں کیا رہا

غرض کہ انیسؔ صاحب کوئی واقعہ کردار یا منظر اپنے شعور واحساس کے دائرے سے خارج نہیں ہونے دیتے اور آپ اسے اپنے مرثیہ میں نہایت اعلی ومعیاری طرز پر سادگی سے قید کر لیتے ہیں اور قاری سے اپنی فصاحت و بلاغت کا کلمہ پڑھوا لیتے ہیں چنانچہ سنا ہے کہ اردو کی کسی مشہور ادیبہ نے صرف انیسؔ صاحب مرحوم کے مراثی پڑھ کر کے کربلا پر ناول نگاری کی ہے، ظاہر ہے سلاست زبان وبیان کا یہ رنگ ڈھنگ اور آہنگ میر انیسؔ کا ہی خاصہ ہے جس کے الطاف حسین حالیؔ وعلامہ اقبالؔ جیسے پایہ کے شعرا قدرداں رہے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ کربلا کو موضوع سخن بنا کر انیسؔ صاحب مرحوم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ و پائندہ ہوگئی۔ چنانچہ اردو زبان وادب کے چاہنے والے حضرات اگر اردو کے تئیں اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے رہیں۔ اور اسے زندہ رکھیں تو یہ زبان بھی باقی رہ جائے اور زبان وادب کے یہ عظیم معمار انہیں شاد باش کہیں گے۔ البتہ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں مجالس امام حسین علیہ السلام میں تنہا مراثی انیسؔ و دبیرؔ ہی وہ واحد صنف سخن ہے جسے سوز وسلام کے علاوہ منبر پر تحت اللفظ میں بھی پڑھا جاتا ہے اور دونوں طریقہ فن وہنر کے اعلی ومعیاری نمونہ شمار ہوتے ہیں۔ اور مومنین اسے حصول ثواب کا ذریعہ سمجھتے ہیں جو کہ بہت بڑی فضیلت ہے۔ بات کو مختصر کرتے ہوئے آخر میں جنابِ حرؑ اور عمرِ سعد کے مابین مکالمہ کو ذکر کر کے انیسؔ صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ آپ اس مکالمہ سے عمرِ سعد کی شرارت آمیز طینت اور حرؑ جیسے سردار دلاور کی پاک بازی کا اندازہ لگا سکتے ہیں جسے انیسؔ صاحب نے نہایت عمدہ پیرائے میں پیش کیا ہے۔

حرؑ سے گھبرا کے یہ بولا عمرِ سعدِ شریر　　یہ تو ہے صاف طرفداریِ شہؑ کی تقریر
اپنے حاکم کا نہ کچھ ذکر نہ تعریفِ امیر　　اللہ اللہ یہ اوصاف یہ مدحِ شبیرؑ
سن چکا ہوں کہ ہے مضطر تو کئی راتوں سے　　الفتِ شاہؑ ٹپکتی ہے تری باتوں سے

نہ وہ آنکھیں نہ وہ چتون نہ وہ تیور نہ مزاج　　سیدھی باتوں میں بگڑنا یہ نیا طور ہے آج
تخت بخشا ہے محمدؐ کے نواسے نے کہ تاج　　جن کو سمجھا ہے غنی دل میں وہ خود ہیں محتاج
کون سا باغ تجھے شاہؑ نے دکھلایا ہے　　کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

عمرِ سعد کو حرؑ کا جواب حق وصداقت کا اعلی نمونہ ہے جسے انیسؔ صاحب نے یوں نظم کیا ہے

حرؑ پکارا کہ زباں بند کر او ناہنجار!　　قابلِ لعن ہے تُو اور وہ تیرا سردار
ابنِ زہراؑ ہے جگر بندِ رسولِؐ مختار　　میرا کیا منھ جو کروں مدحِ امامِؑ ابرار
اک زمانہ صفتِ آلِؑ عبا کرتا ہے　　آپ قرآں میں خدا ان کی ثنا کرتا ہے

جنت مکاں خلد آشیاں، میر ببر علی انیسؔ ومرزا سلامت علی دبیرؔ پر درود وسلام ہو

❁❁❁❁

میر انیسؔ اور ناقدریٔ عالم

سید شاہ زمان شمسی

میر انیسؔ اپنے مشہور مرثیہ ''یارب چمنِ نظم کو گلزار ارم کر'' کی ایک بیت میں عجیب بات کہہ گئے جس کا براہِ راست تعلق ناقدریِ عالم سے ہے شاعری کیا کسی بھی فن کے خالق کے لیے اس کی تخلیقات کی تعریف وقدردانی بہت ضروری ہے۔ اس تعریف وقدردانی سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ فنکار کا دل بڑھتا ہے اور یوں اس کا فن بھی فروغ پاتا ہے قدردانی نہ کی جائے تو فنکار کا دل ٹوٹتا ہے اور ظاہر ہے دل ٹوٹتا ہے تو فن بھی تخلیق نہیں ہوتا یا فن کی تخلیق میں بہت سے رخنے پیدا ہو سکتے ہیں جو فن کے مقصد کو فوت کر دیتے ہیں۔ لیکن میر انیسؔ نے ناقدری کے ان منفی اثرات سے بچنے کے لیے میرے خیال میں رواداری میں ایک پتے کی بات کہہ دی ہے جو اپنی جگہ بڑی حد تک مضبوط ہے میر انیسؔ کی بیت ملاحظہ فرمائیے۔

ناقدریٔ عالم کی شکایت نہیں مولا
کچھ دفترِ باطل کی حقیقت نہیں مولا

اس بیت کا پہلا مصرع سن کر یہی احساس ہوتا ہے کہ شاعر فی الحقیقت ناقدری عالم کی شکایت ہی کر رہا ہے لیکن دوسرے مصرعے کو سن کر فوراً پتا چلتا ہے کہ شاعر ناقدریٔ عالَم کی واقعی شکایت نہیں کر رہا ہے بلکہ اپنی شکایت نہ کرنے سے متعلق بہت عمدہ اور ٹھوس دلیل پیش کر رہا ہے دفتر کے معنی حسابات، تخمینے اور اندازے کے ہیں اور باطل ناچیز اور بے حقیقت کو کہتے ہیں تو اس طرح انیسؔ نے قدر نہ کرنے والوں کے اندازے کو بے حقیقت اور کم وقعت یعنی ناچیز قرار دیا ہے اگر کوئی آپ کے کام کی قدر نہیں کر رہا ہے تو اس سے آپ کو بے دل، بے حوصلہ ہونے کی ضرورت نہیں اصل میں خرابی آپ کے کام کی نہیں ہے یا آپ کے کام میں نہیں اصل خرابی غلط اندازے لگانے والے نہ قدردانوں کے ذہن کی ہے لہٰذا ناقدریٔ عالم سے انسان کو مایوس یا بددل نہیں ہونا چاہیے۔

بغور دیکھا جائے تو ناقدری کی شکایت کرنا اپنے ذہن کی کمزوری کو واضح کرتا ہے اگر آپ کو اس طرح ناقدریِ عالم کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ ناقدری کوئی معنی نہیں رکھتی تو آپ اپنی جگہ ذہنی طور پر مضبوط ہو جاتے ہیں اس کے بعد ناقدردان لوگوں کی شکایت کسی معنی کی حامل نہیں رہ جاتی۔ اگر آج آپ کے کام کی ناقدری ہو رہی ہے تو کل کو قدر بھی ہو جائے گی بلکہ قدردانی ایک لازمی چیز ہے وہ تو ایک نہ ایک دن ضرور ہوتی ہے البتہ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر کسی کام کی قدردانی نہیں ہو رہی ہے۔ تو کام کرنے والے کو تو نقصان پہنچ رہا ہے اس کے اس نقصان کا ازالہ کس طرح ممکن ہے۔ عجیب لطف کی بات یہ ہے کہ میر انیسؔ اپنے زیرِ بحث شعر میں اس نقصان کے ازالے کی بھی ہمیں ایک صورت بتا رہے ہیں اور وہ صورت یہی ہے کہ نہ قدری کی شکایت کرنے کی بجائے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے کام کی اہمیت کو اپنے زمانے

کے لوگوں پر واضح کریں۔ شکایت کرنے کا ایک سب سے بڑا نقصان یہ بھی ہوتا ہے خود شکایت کرنے والے کی طاقت خواہ مخواہ خرچ ہوتی ہے لہٰذا اس شکایت کرنے سے یہ بات کہیں بہتر ہے کہ ہم اپنے قدردانوں کو تلاش کریں اس میں کوئی شک نہیں کہ قدردانوں کی تلاش کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں لیکن قدردانوں کو تلاش کرنا شکایت کرنے سے ہزار درجے بہتر کام ہے۔ اصل میں جس زمانے میں ہم قدردانوں کی تلاش کر رہے ہوتے ہیں یا اس تلاش کی فکر میں ہوتے ہیں ہم ایک انداز میں اپنے کام پر بھی نظر ثانی کر رہے ہوتے ہیں اور اس طرح ہمارا کام آگے بڑھ رہا ہوتا ہے مگر ہمارے کام کا آگے بڑھنا بھی کوئی معمولی کام نہیں رہ جاتا اس سے نہ صرف ہمارے کام کی اہمیت واضح ہوتی ہے خود ہماری اہمیت میں بھی اضافہ ہو رہا ہوتا ہے۔ آج تک اس دنیا میں جتنے بھی ایسے رونما ہوئے ان میں کسی نہ کسی طرح ناقدریِ عالم کا ہاتھ نظر آتا ہے اگر آدمی آدمی کی قدر کرتا رہے تو بے شمار معاشرتی بیماریوں کا فوراً علاج ممکن ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے جیسے جیسے ایک آدمی دوسرے آدمی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے ویسے ویسے گوناگوں معاشرتی برائیاں ختم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ صاف ستھرے معاشرے کی تخلیق میں بھی اور اس کو قائم رکھنے میں بھی انسان کا قدردان ہونا بنیادی معنی رکھتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو سارے ظلم وستم کی جڑ بھی ناقدری میں پوشیدہ ہے آدمی کسی بھی ظلم وستم سے پہلے وہ کسی ناقدری کا شکار ہوتا ہے قدردان شخص اور خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ ظالم کبھی نہیں ہو سکتا قدردانی کا تو مطلب ہر چیز کو اس کی اصل جگہ پر دیکھنا ہے گویا قدردانی سے بڑھ کر عدل کو فروغ دینے والی بھی کوئی دوسری قدر نہیں ہو سکتی۔

ناقدری عالم کی سب سے بڑی اور دردناک مثال محمدؐ وآلِ محمد علیہم السلام کی ذواتِ مقدسہ ہیں جنھوں نے پورے عالمِ انسانیت اور مسلم امّہ کی ہمیشہ سلامتی چاہی لیکن مسلم امّہ نے انھیں سمجھنے میں ہمیشہ ٹھوکر کھائی ویسے بظاہر مسلم امّہ نے ہمیشہ آلِ محمدؐ کو عزت کی نگاہ سے دیکھا لیکن چونکہ آلِ محمدؐ نے چاہا اسے کبھی نہ سمجھا گیا یہ ایک ایسا سینۂ عالم میں ناسور ہے جس کا اندمال اسی وقت ممکن ہے جب مسلم اُمہ محمدؐ وآلِ محمد علیہم السلام کی بات کو سمجھ لے ایک عجیب طرح کا حجاب ہے جو درمیان میں حائل ہے۔ لیکن زیر بحث بیت کی تفہیم محمدؐ وآلِ محمد علیہم السلام کے حوالے سے کچھ اور ہی طریقے سے ظہور میں آتی ہے محمدؐ وآلِ محمدؐ ناقدریٔ عالم کی شکایت کرنے کے بجائے وہ تو مسلسل دعائیں طلب کرتے ہیں اور دیتے ہیں یعنی جب مسلم اُمہ محمدؐ وآلِ محمد علیہم السلام کو نہیں سمجھتی تو محمدؐ وآلِ محمد علیہم السلام امّت کے لیے دعا مانگتے ہیں یا رب تو ان پر رحم فرما انھیں عقل دے کہ یہ سوچیں اور غور کریں کہ اصل معاملہ کیا ہے اور یوں زیرِ بحث بیت کے دوسرے مصرع ''کچھ دفترِ باطل کی حقیقت نہیں مولا'' کا مطلب یہ نہیں بنتا کہ اگر امت ناقدری کر رہی ہے تو اس ناقدری کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ محمد وآلِ محمد صحیح معنی میں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس ناقدری کی حقیقت کا نہیں بلکہ محمدؐ وآلِ محمدؐ صحیح معنی میں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس ناقدری کی حقیقت کو اس کے نقصان کو تسلیم کرتے ہوئے اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ امّتِ مسلمہ اپنی ناسمجھی کو تسلیم کرے اور غور وفکر سے کام لے کر محمدؐ وآلِ محمدؐ کی صحیح معنی میں قدردان ہو جائے امت محمدؐ وآلِ محمدؐ کی قدردانی کرے گی تو اس کے بگڑے ہوئے نصیب سنور جائیں گے۔

عام آدمی تو بہت حوصلہ دکھاتا ہے کہ ناقدریٔ عالم کی شکایت نہ کرے اس عمل کو وہ اپنی بہت بڑی بلند اخلاقی سمجھ کر دل ہی دل میں فخر محسوس کرتا ہے۔ لیکن خدا کے خاص بندے آلِ محمدؐ ناقدریٔ عالم کی شکایت نہیں کرتے وہ تو الٹے ناقدری کرنے والوں کے حق میں دعائیں کرتے ہیں اور یوں دعا کے حوالے سے قدری کرنے والوں کو بھی سامنے لے آتے ہیں۔ جس کا مظاہرہ عام لوگ تو تصور میں نہیں کر سکتے یعنی

عام آدمی تو یہی سوچتا ہے کہ جب کوئی ہماری قدر نہیں کرتا تو ہم ایسے شخص کو کیوں خاطر میں لائیں ہم اس کی پروا کیوں کریں نا قدری کرنے والے شخص کے لیے تو عام آدمی کے دل سے بددعائیں ہی نکلتی ہیں لیکن میر انیسؔ کی بصیرت ملاحظہ فرمائیے کہ انہوں نے آلِ محمدؐ علیہم السلام کی اس ادا کو کس طرح سمجھا کہ ان کا کوئی مرثیہ بھی مسلم امہ کے لیے آلِ محمدؐ کی طرف سے دعاؤں سے خالی نہیں ہے ہر مرثیے میں شہدائے کربلا کا ہر کردار خواہ وہ چھوٹا یا بڑا ہے مسلم امہ کے لیے کسی نہ کسی انداز میں دعا کرتا دکھائی دیتا ہے یا اس سے بھی آگے کی بات کہ وہ امت کے بھلائی کے لیے اپنے آپ کو راہِ خدا میں قربان کر رہا ہوتا ہے غرض انسانی نفسیات کے دونوں پہلو یعنی منفی اور مثبت کو سامنے رکھ کر بات کہنا انسانی نفسیات کے امکانات کو واضح کرتا ہے۔

یعنی یہ بھی ایک حقیقت کہ جب کوئی شخص آپ کی کسی خوبی کا اعتراف یا احترام نہیں کرتا تو اس کی اس نا قدری پر آپ کو غصہ آتا ہے آپ اس کے لیے بددعا بھی کر سکتے ہیں اس کے حق میں برا بھی چاہ سکتے ہیں اور یہ آپ کی طرف سے کوئی زیادتی شمار نہیں کی جا سکتی قرآن پاک کے چھٹے پارے کا آغاز ہی اس بات سے ہوتا ہے کہ ٹھیک ہے اللہ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کسی کو برا کہیں لیکن جس پر ظلم ہوا ہے اس شخص کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور چونکہ نا قدری بھی ایک طرح کا ظلم ہے لہٰذا نا قدری پر جس کی نا قدری کی گئی ہے وہ نا قدری کرنے والے کو برا کہہ سکتا ہے لیکن دیکھ لیجیے وہ لوگ کتنے بلند حوصلہ ہوتے ہیں جو نا قدری پر برا کہنا تو بڑی بات ہے بلکہ نا قدری کرنے والے کے حق میں دعا کرتے ہیں دراصل ایسے لوگ اس لیے بلند نظر ہو جاتے ہیں کہ انھیں انسان کی اصل فطرت کے مثبت پہلوؤں پر یقین ہوتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک انسان نے ایک اچھی بات کو آج نہیں سمجھا تو وہ اس بات کو کل سمجھ لے گا یا سمجھ سکتا ہے انسان کی ذات سے یہ امید یہ توقع انسانیت کے حق میں بڑے معنی رکھتی ہے اور اس وقت یہ توقع اور یہ امید اور بھی بامعنی ہو جاتی ہے جب کسی قوم کو ہمارے آنحضرت ص جیسا جلیل القدر ہادی اور رحمت اللعالمین راہنما میسر آیا ہو اور آلِ محمدؐ بھی اسی توقع پر ہمیشہ مسلم امہ کے لیے دعا کرتے رہے۔

آلِ نبیؐ نے مسلم امت کی نا قدری کی اس لیے بھی شکایت نہیں کی کہ نا قدری کا دائرہ کبھی وسیع نہیں ہوتا مثلاً کوئی شفیق کی نا قدری کرتا ہے تو اس نا قدری کا تعلق آپ کی اپنی ذات سے ہے یہ بھی تو ممکن ہے کہ جو شخص شفیق کی نہ قدری کر رہا ہے کل کو شفیق کی قدردانی کرنا بھی شروع کر دے نا قدری کا دائرہ زیادہ سے زیادہ کسی ایک قوم تک پھیل سکتا ہے جیسا کہ امام حسین علیہ السلام کے وقت میں یزید اور اُس کے اسلاف کے غلط پروپیگنڈے نے آلِ محمدؐ کے خلاف لوگوں کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر انہیں بھڑکایا اور بغداد میں یہ سلسلہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا لیکن آلِ محمدؐ کی نگاہ میں چونکہ پورا عالم انسانیت تھا اس لیے وہ اس نا قدری سے مایوس نہیں ہوئے اور مسلمانوں کے ظلم وستم کے باوجود اُن کے حق میں دعا کرتے رہے کسی کے لیے دعا کرنا دراصل اس شخص کی ذہنی قوت اور قوتِ عمل کے لیے دعا کرنے کے مترادف ہے۔ آپ جس کے لیے دعا کرتے ہیں وہ آپ کی طرف ہی متوجہ نہیں ہوتا اپنے رویے اور اخلاق کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے اور یوں وہ اپنے آپ کو تمام کا تمام بدل ڈالے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

❁❁❁❁

فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل کی پیش کش

۱۔ فروغِ مرثیہ۔ایک نئے عزم کی ابتدا	اصغر مہدی اشعر	۲۰۱۹ء
۲۔ فرہنگِ انیسؔ (اُردو لغت بورڈ)	اصغر مہدی اشعر	۲۰۱۹ء
۳۔ رثائیاتِ علّامہ طالب جوہری	فرحان رضا	۲۰۲۰ء
۴۔ فروغِ مرثیہ۔ پہلا شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۰ء
۵۔ فروغِ مرثیہ۔دوسرا شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۰ء
۶۔ فروغِ مرثیہ۔تیسرا شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۰ء
۷۔ گلزارِ فصیحؔ (اشتراک۔جواہر)	ارتضیٰ عباس نقوی	۲۰۲۱ء
۸۔ فروغِ مرثیہ۔ چوتھا شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۱ء
۹۔ فروغِ مرثیہ۔ پانچواں شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۱ء
۱۰۔ فروغِ مرثیہ۔ چھٹا شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۱ء
۱۱۔ فرہنگِ دبیرؔ (ورثہ)	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۱ء
۱۲۔ دبیرؔ کے مرثیے۔جلد اوّل	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۱ء
۱۳۔ فروغِ مرثیہ۔ساتواں شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۲ء
۱۴۔ ''فرہنگِ جوشؔ''، جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیوں پر مشتمل	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۲ء
۱۵۔ فروغِ مرثیہ۔آٹھواں شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۲ء
۱۶۔ وحیدِ سخن	ارتضیٰ عباس نقوی	۲۰۲۲ء
۱۷۔ خونِ شہیداں (اشتراک۔ورثہ)	ممتاز حسین جونپوری	۲۰۲۲ء
۱۸۔ فروغِ مرثیہ۔نواں شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۲ء
۱۹۔دبیرؔ کے مرثیے۔جلد دوم	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۲ء
۲۰۔فروغِ مرثیہ۔دسواں شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۲ء
۲۱۔کینیڈا اور امریکہ کے اردو مرثیہ نگار	اختر آصِف زیدی	۲۰۲۲ء
۲۲۔فروغِ مرثیہ گیارہواں شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۳ء
۲۳۔دبیرؔ کے مرثیے۔جلد سوم	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۳ء

۲۴۔فروغِ مرثیہ۔ بارھواں شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۳ء
۲۵۔فروغِ مرثیہ۔ تیرھواں شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۳ء
۲۶۔دبیرؔ کے مرثیے۔جلد چہارم	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۳ء
۲۷۔اجزائے مرثیہ کا موجد، میر ضمیرؔ	زائر حسین ثالثی	۲۰۲۳ء
۲۸۔فروغِ مرثیہ۔ چودھواں شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۳ء
۲۹۔کراچی کی عزاداری (اشتراک۔ورثہ)	عقیل عباس جعفری	۲۰۲۳ء
۳۰۔فروغِ مرثیہ۔ پندرھواں شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۴ء
۳۱۔کلیاتِ صغیرؔ سونوی۔جلد اوّل	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۴ء
۳۲۔فروغِ مرثیہ۔سولھواں شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۴ء
۳۳۔فروغِ مرثیہ۔سترھواں شمارہ	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۴ء
۳۴۔دبیرؔ کے مرثیے۔جلد پنجم	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۴ء
۳۵۔ابرؔ جون پوری کے مرثیے	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۴ء
۳۶۔فروغِ مرثیہ۔اٹھارہواں شمارہ (انیسؔ نمبر)	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۴ء
۳۷۔فروغِ مرثیہ۔انیسواں شمارہ (دبیرؔ نمبر)	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۴ء
۳۸۔دبیرؔ کے مرثیے۔جلد ششم	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۴ء
۳۹۔دبیرؔ کے مرثیے۔جلد ہفتم	اصغر مہدی اشعر	۲۰۲۴ء

www.emarsiya.com

دنیا کی سب سے بڑی ڈیجیٹل مرثیہ لائبریری جہاں آپ انیسؔ و دبیرؔ کے مکمل مطبوعہ مراثی کے علاوہ ۳۲۰ مرثیہ نگاروں کے ۴۰۰۰ سے زائد مراثی حاصل کر سکتے ہیں۔ سوزخواں خواتین و حضرات کے لیے بستۂ سوزخوانی کا بھی انتظام ہے۔ اگر آپ مزید مراثی اس ویب سائٹ پر شامل کرنا چاہیں تو اس ای میل پر رابطہ کریں۔

faroghemarsiya@gmail.com